

جنگل اداس



ایم حید

محبت کی خوشبوؤ!
 محبت کی مسکراہٹو!
 اے سورج کے جلال!
 اے تاروں بھری رات کے ملکوتی حسن!
 سری لنکا کی بارشو!
 ساحل سمندر کے ناریل کے درختو!
 مولری کے پیڑوں میں ہوا کے گیتو!
 میں تمہیں الوداع کہتا ہوں

بہار کے موسم میں جب آم کے پیڑوں پر پور آتا ہے اور فضا مولری اور
 شہتوت کی میٹھی خوشبوؤں سے لبریز ہو جاتی ہے تو چاندنی رات سچے گلابوں کے کھیت میں
 نرم پاؤں رکھ کر گذرتی ہے۔ تب ویران حویلیوں میں سنگ مرمر کی جالیوں کے پیچھے

دنازک گلاب، مولری اور گیندے کے بستی پھول بنائے تھے۔ یہ محبت میں نے خود پیدا نہیں کی تھی۔ یہ محبت بھی اسی خدا نے میرے دل میں پیدا کر دی تھی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ کاش! میں نو دس سال کی عمر میں ہی اپنی ساری زندگی گزار دیتا۔ جب میرا معصوم دل جنگوں، بارشوں، پھولوں، دریاؤں اور سمندروں کی عظمتوں والے اپنے خدا کی محبت میں اتنا لبریز تھا کہ یہ پیانا قدم قدم پر جھلک جاتا تھا لیکن انجانی آزمائشیں میرے انتظار میں گھات لگائے بیٹھی تھیں۔ جن لوگوں سے ملنے کا میں کبھی طالب نہیں ہوا تھا۔ جن کے چہرے میں کبھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا وہ میری عمر کے ماہ و سال کی ہر منزل پر میری راہ دیکھ رہے تھے۔ مجھے امتحان میں ڈالا گیا۔ میں نے صرف موسوں، بارشوں، درختوں اور چاندنی راتوں کے پچھلے پہر کھلنے والے موتے، گلاب اور گیندے کے زرد پھولوں کا درس لیا تھا۔ میں نے ناریل، آم اور نیم کے درختوں کی کتابیں پڑھی تھیں لیکن مجھے امتحان کے کمرے میں بٹھا کر میرے آگے دنیا دازی کا پرچہ رکھ دیا گیا۔ میں اس امتحان میں فیل ہو گیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ خالق کائنات کی محبت کے پرچے میں میری کپارٹ آ گئی۔ میں اپنے خدا سے ہنچر ضرور گیا مگر اس کا حسین ترین، روشن ترین اور جلال و جمال والا خیال میں نے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ میرے گناہ اور لوگوں کے جھوم میرے اور میرے خدا کے درمیان حائل ہو گئے لیکن میں پاکیزہ محبتوں کے جلال و جمال کے خیال کو سینے میں روشن کئے زندگی کے سفر پر رواں رہا۔ اس جھوم میں کبھی کبھی کوئی حسین نورانی چہرہ اپنی ایک جھلک دکھا کر مجھے خدا کی یاد دلا کر غائب ہو جاتا۔ جیسے کالے سیاہ بادلوں میں بجلی چمک کر غائب ہو جاتی ہے۔ میں ایسے ہی نورانی چہروں اور حسین جذبوں کی کہانی لکھنے بیٹھا ہوں۔ یہ کوئی افسانہ یا افسوں نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کے واقعات بیان کروں گا مگر ان محبتوں کا ذکر لکھوں گا جن کے چہرے بجلی کی طرح چمک چمک کر اندھیرے میں مجھے راہ دکھاتے رہے۔ میں اپنی نفرتوں اور گناہوں کے جہنم کا در نہیں کھولوں گا۔ ان ٹھنڈوں ہواؤں کا ذکر کروں گا جو اس آگ میں مجھے میری فردوس گم مکشہ کی یاد دلاتی رہیں اور یہ خیال میرے دل میں ڈالتی رہیں کہ میرا اصل مقام دوزخ نہیں جنت ہے۔

اگر میں ہوا بن سکتا تو صبح کے ساتھ جنگوں، وادیوں میں سے گذرتا اور اپنی داستان کے دردناک گیت بن کر درختوں، پھولوں اور دریاؤں کو سناتا۔ اگر میں درخت ہوتا تو شام کے وقت اپنے جنگوں کو واپس جانے والی ہوائیں میری داستان غم

خواب میں دیکھے ہوئے چہرے اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور خاموش والائوں میں گذری ہوئی محبتوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ اس وقت میں ایک باغ کو یاد کرتا ہوں۔ اس باغ کا نام کہنی باغ تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔ اس نہر کی ایک جانب آم کے درختوں نے آدمی نہر پر اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ دوسری جانب نشیب میں آلوچوں اور ناشپاتوں کے باغ تھے۔ ہمارے دن آتے تو آلوچوں کی چھڑیوں ایسی اوپر کو اٹھتی ہوئی شاخیں گلابی پھولوں سے بھر جاتیں۔ یہ آج سے پچاس برس پہلے کے زمانے کے زرد اور سرخ آلوچوں کے پڑتے تھے۔ یہ آلوچے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ ان کے دس بارہ فٹ اونچے درختوں کی ٹہنیاں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور ان پر چھوٹے گلابی پھول لگتے تھے۔ ان درختوں کے پھولوں اور پتوں کو ناک کے بالکل قریب لاکر سو گھسیں تو ان میں سے آلوچوں کی کھٹی خوشبو آتی تھی۔ ناشپاتی کے درختوں پر گلابی اور سفید دونوں طرح کے پھول کھلتے تھے۔

گریموں کی راتوں میں جب آسمان پر چاند نہیں ہوتا تھا تو اس نہر کا ریتنا پانی دھندلا نظر آتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر کہنی باغ میں سناٹا چھایا رہتا تھا۔ میری عمر اس وقت نو دس سال کی تھی۔ کہنی باغ کے درختوں اور کیاریوں میں کھلے ہوئے گیندے کے بستی پھولوں اور ندی کے بتے پانی کی سرسراہٹیں مجھے اپنے مکان سے کھینچ کر منہ اندھیرے اپنے پاس لے آتیں۔ میں کہنی باغ والی نہر کے کنارے پتھر کی اس سل پر بیٹھ جاتا جہاں دن کے وقت عورتیں کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ نہر پر جھکے ہوئے آم کے درختوں پر پور آیا ہوتا۔ اس میں سے شد ایسی شیریں خوشبو نکل رہی ہوتی۔ باغ کی طرف سے ہوا آتی تو اس خوشبو میں گلاب مولری اور موتے کی خوشبوئیں بھی شامل ہو جاتیں۔ نہر کا پانی خاموشی سے بہہ رہا ہوتا۔ آسمان پر چاندنی کے سائے جیسے جبک کر ندی کی سرگوشیاں سز رہے ہوتے۔ نہر کے پانی کی ایک خاص سرسراہٹ ہوتی تھی۔ یہ صرف اس وجہ سے سنائی دیتی تھی کہ باغ میں بڑی گہری خاموشی چھائی ہوتی تھی۔ نہر کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس کی گیلی خوشبو ہوتی تھی۔ آلوچوں کے باغ کے پیچھے امرودوں کے باغ تھے۔ کم وقت ان کی طرف سے پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا آتی تو مجھے کپے امرودوں کی محک محسوس ہوتی۔

میں چہرہ اٹھا کر درختوں کی شاخوں میں سے نظر آتے ستاروں کو دیکھنے لگتا۔ میرا دل خدا کی محبت سے لبریز ہو جاتا۔ جس نے اتنے شان و شوکت والے ستارے اتنے ز

سن کر آہیں بھرتی میری شاخوں میں سے گذرتیں لیکن نہ میں ہوا ہوں نہ درخت ہوں۔ میں بیٹے ہوئے دنوں کے اداس نغموں کو الفاظ میں ڈھال کر، انہیں کانغذی لباس پہنا کر سطروں کی حوالات میں قید کر رہا ہوں۔ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔

میں اپنی گم شدہ محبتوں کی داستان ایک پہاڑی کانچ میں آتھان کے پاس بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ آتھان میں رات کی جلائی ہوئی آگ مدھم پڑ گئی ہے۔ میری پرانی جاپانی چٹیک میں سری لنکا کی چائے دم ہو رہی ہے۔ خالی پیالی میری میز پر سامنے پڑی ہے۔ میری زندگی کا سارا سرمایہ یہی ایک چٹیک، ایک پیالی، کچھ کتابیں اور ایک پرانا پاپ ہی باقی رہ گیا ہے۔ ایک دوست نے مجھے برٹش تمباکو کا ڈبہ دیا تھا۔ اس تمباکو میں سے دیودار کے درختوں کی خوشبو آتی ہے۔ جب میں اسے پاپ میں سلگا کر پیتا ہوں تو دیودار کے گھنے جنگلوں سے آنے والی ہوائیں میرے قریب سے ہو کر گذرتی ہیں۔ میرا پاپ اور ماچس بھی میرے سامنے پڑے ہیں۔ میں جس کھڑکی کے پاس بیٹھا یہ داستان لکھ رہا ہوں اسے میں نے بند کر رکھا ہے۔ پہاڑوں پر یہ ستمبر کے اخیر کے دن ہیں اور خزاں آلود سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔ کھڑکی کے شیشے میں سے مجھے چنار کے درختوں میں سے گذرنے والی پہاڑی پگڈنڈی پر درختوں کے زرد اور سرخ پتے گرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ خزاں نصیب پتے خزاں کی سرد ہواؤں کے ساتھ کچھ دور تک اڑتے چلے جاتے ہیں۔ بند کھڑکی میں سے مجھے کسی وقت سرد ہواؤں کا ہلکا ہلکا شور سنائی دیتا ہے۔ یہ شور بلند ہو کر دور چلا جاتا ہے۔ جہاں یہ پہاڑی کانچ ہے اس طرف کوئی نہیں آتا۔ یہ پہاڑی کی چوٹی پر ہے۔ میرے سامنے کی جانب چناروں کے تختے، چھوٹے چھوٹے نشیب، گھاٹیاں اور پہاڑی چٹے ہیں۔ کانچ کے عقب میں پہاڑی ڈھلان ہے جس پر اگے ہوئے چڑھ کے درختوں کی قطاریں نیچے وادی تک اترتی چلی گئی ہیں۔ کانچ کی دائیں جانب بڑی بڑی چٹائیں ہیں جن کا رنگ بارش، دھوپ اور برفاریوں کی وجہ سے سیاہ پڑ گیا ہے۔ ان چٹانوں کے درمیان چھوٹا سا نیم ہموار میدان ہے۔ یہاں 1857ء کے زمانے میں انگریزوں کا قبرستان ہوا کرتا تھا۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی قبریں جھکی ہوئی سیاہ ملیوں کے ساتھ اب بھی نظر آتی ہیں۔ ان قبروں پر خشک گھاس اگی ہوئی ہے۔ آدھی ملیں سرکندوں میں چھپ گئی ہیں۔ کبھی صبح اور کبھی شام کے وقت میں قبروں کی طرف نکل آتا ہوں اور ان میں آسودہ خاک میتوں کی مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعاگو ہوتا ہوں۔ ان قبروں کے کتبے بھی ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ انگریزی میں لکھے ہوئے نام بڑی مشکل سے

پڑھ جاتے ہیں۔ صرف ایک قبر پر انگریزی حروف میں لکھا ہوا نام جولیانہ پرکنز صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے نیچے 1859ء کا سن لکھا ہے۔

مجھے قبرستان میں ہمیشہ ایک اداس رومانیت کا احساس ہوتا ہے۔ قبرستان شاید اسی لئے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ مجھے کسی قبرستان سے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اپنے شہر امرتسر کے قبرستان میں میں رات کے وقت بھی چلا جاتا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ شاید کسی مردے کی روح سے میری ملاقات ہو جائے۔ کسی روح سے ملنے کی میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔ جس کانچ میں میں اپنی زندگی کے ایک خاص پہلو کی یادداشتیں لکھ رہا ہوں یہ ایک کھنڈر بن چکا ہے۔ صرف یہی ایک کمرہ کسی حد تک سلامت رہا ہے جس کو میں نے اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ میں اسی کمرے کے فرش پر رات کو سو جاتا ہوں۔ ہفتے میں ایک بار نیچے چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں جا کر کھانے پینے کی مختصر چیزیں لے آتا ہوں اور پھر یہاں سے کہیں نہیں جاتا۔ کانچ جیسا کہ میں لکھ رہا ہوں پہاڑی کی چوٹی پر ہے اور یہاں سے آگے جانے کا نہ تو کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی جگہ ہے۔ دن میں کسی وقت درختوں کے نیچے گری پڑی سوکھی مٹنیاں اور سوکھے درختوں کے ٹڈھ لا کر آتش دان کے پاس اور باہر والے چھوٹے سے برآمدے کی دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔ اخیر ستمبر کے دن ہیں۔ سارا دن سرد ہوائیں چلتی ہیں اور رات کو سردی ہو جاتی ہے۔ میں آتش دان میں تھوڑی سی آگ جلا لیتا ہوں جو ساری رات اور سارا دن کمرے کو کسی حد تک گرم رکھتی ہے۔ اتنا گرم کہ سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ میں شہر سے صرف کتابیں، جاپانی چٹیک اور پرانا پاپ ہی لے کر یہاں آیا تھا۔ ضرورت کے چند برتن میں نے پہاڑی قصبے میں سے خرید لئے تھے۔ کوئی ٹائم پیس یا گھڑی میں نے اپنے پاس نہیں رکھی۔ میں دن کے وقت سورج کو اور رات کے وقت ستاروں کو دیکھ کر وقت کا اندازہ کر لیتا ہوں۔ مجھے صحیح وقت معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اگر رات کے دس بجے ہیں تو ٹھیک ہے۔ اگر دن کے آٹھ بجے ہیں تو بھی ٹھیک ہے۔ رات کو تیل کی لالٹین روشن کر لیتا ہوں۔ ایک چھوٹا سا بیٹری کا آڈیو کیسٹ میری پاس ہے۔ جس میں ریڈیو بھی ہے۔ کبھی کبھی کیسٹ لگا کر اپنی پسند کا کوئی گیت سن لیتا ہوں۔ ریڈیو کی خبریں میں نہیں سنتا۔ کانچ کے آگے چنار کے درختوں میں جو پگڈنڈی بن گئی ہے، وہ ایک چھوٹی سی کھلی جگہ پر جا ٹپکتی ہے۔ یہاں ناشپاتی کے دو درخت ساتھ ساتھ اگے ہوئے ہیں۔ بار کے موسم میں ان کی مٹنیاں سفید اور گلابی پھولوں سے بھر جاتی ہیں۔ ناشپاتی کے یہ بیڑ

اب ایک اور خواب کا منظر طلوع ہوتا ہے۔ ہمارے آنے سامنے کے مکانوں کی کچھ عورتیں گرمیوں کے موسم میں صبح صبح منہ اندھیرے کہنی باغ میں سیر کرنے جاتی تھیں۔ ان میں میری والدہ اور بہنیں اور شبانہ اور اس کی والدہ بھی ہوتی تھیں۔ رات کے دس بجے نلکہ چلا جاتا تھا۔ شبانہ کی والدہ دس بجے کے بعد نلکہ کو کھول کر اس کے نیچے خالی بالٹی رکھ دیتی تھی۔ صبح چار بجے جب پانی آتا تو بالٹی میں گرتا۔ اس کے شور سے شبانہ اور اس کی والدہ جاگ پڑتیں۔ پھر وہ دوسرے دو چار گھروں کی عورتوں کو جگاتیں۔ میں بھی ساتھ ہو جاتا۔ کیونکہ مجھے صبح کے وقت آسمان پر چمکتے ستارے بڑے اچھے لگتے تھے۔ گلی کی ککڑ پر خواجہ غلام نبی سوداگر پشینہ کا مکان تھا۔ اس مکان پر خواجہ کے بیٹے خواجہ سعید کو جگاتا۔ وہ اپنے پالتو کتے کو ساتھ لے کر اس قافلے کے آگے آگے چل پڑتا۔

اس وقت کا کہنی باغ ایسے ہوتا تھا جیسے کسی دلہن نے سبز رنگ کا زرتار سوٹ پہن رکھا ہو اور نیم روشن جملہ عروسی میں نیم خوابیدگی کے عالم میں ہو اور اس کے سونے چاندی کے زیور کسی کسی وقت چمک جاتے ہوں۔ شہر کے دروازے سے باہر نکلتے ہی میں آسمان کی طرف دیکھتا۔ آسمان پر تارے اس طرح جھللا رہے ہوتے تھے جسے یہ دنیا کی پہلی رات ہو اور ستارے پہلی بار چمکتا شروع ہوئے ہیں۔ میں مشرقی افق پر پوری آب و تاب سے دیکھتے ہوئے صبح کے ستارے کو محبت اور حیرت سے دیکھتا۔ اس وقت مشرقی آسمان پر ذرا اوپر آکر سات ستاروں کی چھڑی بھی چمک رہی ہوتی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اسے بنات النعش کہتے ہیں۔ یونانی دیو مالا میں یہ ماتم کرنے والی لڑکیاں ہیں جو میت کے آگے آگے نوحہ خوانی کرتی جاتی ہیں۔ اس وقت مجھے دیو مالا کی کوئی خبر نہیں تھی اور میں سات آٹھ یا نو چھوٹے بڑے چمکیلے ستاروں کی آڑی تر چھی چھڑیوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ میں انہیں اس طرح دیکھا کرتا جیسے میں ان کی ٹولی سے زمین پر گرا ہوا ستارہ ہوں یا یہ میری دوست تھیں جو مجھ سے چھڑ کر آسمان پر چلی گئیں اور ستارے بن کر چمک رہی ہیں۔ ہم کہنی باغ میں داخل ہوتے تو باغ کی گہری شبی سبز خوشبو آنے لگتی۔ یہ کسی ایک پھول کی، ایک درخت کی خوشبو نہیں تھی۔ یہ سارے باغ کی خوشبو تھی۔ مجھے ایسے لگتا جیسے سارا باغ سانس لے رہا ہے۔ یہ باغ کے سانس کی خوشبو تھی۔ میرا دل سارے باغ، سارے آسمان، سارے ستاروں، ساری دنیا اور اسی دنیا کے خالق کی محبت سے تھمکنے لگتا اور شبانہ کا چہرہ ان ساری چیزوں میں گم ہو جاتا۔

مجھے میری پہلی محبت کے کہنی باغ والے ناشپاتی کے باغ کی یاد دلاتے ہیں۔

اب میں اپنی پہلی محبت، بچپن کی محبت کی داستان شروع کرتا ہوں۔ ابھی ابھی میں نے سری لکا کی چائے پی کر اپنا پائپ سلگایا ہے۔ برٹش تمباکو کی تلخ تمک چائے کی پاکیزہ خوشبو سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ وکٹوریہ عہد کا لڑچکر جنوب مشرقی ایشیا کی پراسرار دیو مالا سے مل رہا ہے اور میں اپنی پہلی محبت کی جنت میں داخل ہو رہا ہوں۔ آٹھ نو برس کی عمر تھی۔ دل شبنم کی طرح بے داغ تھا۔ محبت طلوع ہوتے سورج کی پہلی کرن کی طرح مصوم تھی۔ روشن تھی۔ کہنی باغ کے درختوں کو دیکھتا تو اپنے بچپن کی محبت کا خیال آ جاتا۔ شبانہ کو دیکھتا تو خیال درختوں، جنگلوں، دریاؤں اور طلوع ہوتے سورج کی طرف نکل جاتا۔ یہ شبانہ کی محبت تھی یا درختوں، پھولوں، دریاؤں کی محبت تھی یا ان سب کے خالق حقیقی کی محبت تھی؟ مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ نورانی محبتوں کی بارش تھی جس میں میں سر سے پاؤں تک شرابور تھا۔

میں نے شبانہ کا نام لکھا ہے۔ یہ اس لڑکی کا اصلی نام نہیں ہے جس سے میں نے پہلی محبت کی۔ اس کا نام کچھ اور تھا۔ میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا۔ میں اس گلی کا بھی محل وقوع غلط لکھوں گا جس گلی میں اس کا مکان ہمارے مکان کے سامنے تھا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے پہلی بار شبانہ کو دیکھا تو وہ اپنے مکان کے چھوٹے سے کمرے میں لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ وہ دیوار میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ میں اس کے پاس فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھا تھا۔ اس کے پھولے ہوئے بال کمرے سے نیچے تک آئے ہوئے تھے۔ بالوں کے سرے بھورے تھے۔ اس وقت میری عمر چھ سات سال کی ہو گی۔ شبانہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ میں اس کو بال بناتے دیکھ جا رہا تھا۔ شبانہ کے گندی رخسار پر ہونٹوں کے قریب ایک کالا تل تھا۔ یہ تل مجھے اچھا لگتا تھا۔ کیوں اچھا لگتا تھا؟ یہ نہ مجھے اس وقت معلوم تھا نہ اب معلوم ہے۔ اس نے بال بناتے بناتے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”وے چارلی! تم کیا دیکھ رہے ہو؟“

اس زمانے میں ہندوستانی قلموں کے مزاحیہ اداکار چارلی کی بڑی شہرت تھی۔ شبانہ مجھے چارلی کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ میں ہنس کر شرما گیا تھا۔ اس کے بعد خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ میں اٹھ کر کس طرف چلا گیا تھا اور شبانہ کس طرف چلی گئی تھی۔

آسمان پر صبح کا نور پھیلا ہوتا۔ ہم اندھیرے میں باغ کے درختوں کے نیچے سے گذرتے تو مجھے ٹہنیوں پر سے ٹہنم کے قطروں کے نچنے کی آواز آتی۔ اب ہر پلاٹ کے گھاس، ہر درخت اور اندھیرے میں کھلے ہوئے ہر پھول کی خوشبو الگ الگ محسوس ہوتی تھی۔ پھر آسمان کے درختوں میں بستی ندی یا نہر آ جاتی۔ گرم رات شب کے پچھلے پہر خاموشی سے کمپنی باغ میں آکر خنک ہو گئی ہوتی تھی۔ نہر پر آکر عورتیں برقعے اتار کر کپڑوں سمیت نہر میں نہانے لگتیں۔ میں بھی نہر میں چھلانگ لگا دیتا۔ نہر کا پانی عورتوں کی کمر تک آتا تھا۔ صبح کا زب کے پھیکے اندھیرے میں شبانہ کا بھیگا ہوا چہرہ اور بھیکے ہوئے بال مجھے خواب کی طرف لگتے۔ اس کے جسم کی طرف میرا کبھی خیال نہیں گیا تھا۔ میرے لئے اس کا جسم موجود ہی نہیں تھا۔ وہ مجھے کسی وقت لٹکا اور بنگل کے طلسمی جنگلوں میں سے آئی ہوئی کوئی روح لگتی اور کبھی آسمان پر بنات النعش کی ٹولی کی ایک لڑکی لگتی۔ جو دردناک گیت پڑھتی کسی حسین ترین شہزادی کی میت کے آگے آگے چلی جا رہی ہو۔

میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہو گئی لیکن میری محبت کی عمر ابھی تک چھ سات برس ہی تھی۔ میری محبت اس عمر میں پہنچ کر رک گئی تھی۔ آج میں اتنی عمر کو پہنچ گیا ہوں لیکن میری محبت کی عمر ایک دن، ایک گھڑی اور ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھی۔ اس سے بڑھ کر میری اور کیا خوش قسمتی ہوگی۔

ایک دن میں نے شبانہ کے نام ایک محبت بھرا رقعہ لکھا اور اسے تمہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ کسی کام سے ہمارے گھر آئی۔ میں چپکے سے میڑھیوں میں چھپ گیا۔ جب وہ واپس جانے لگی تو میں نے جلدی سے رقعہ اس کے ہاتھ میں زبردستی پکڑا لیا اور گلی میں نکل گیا۔ اب میں اس کے سامنے آتے ہوئے گھبراتا تھا۔ ایک دن گذر گیا۔ رات بھی گذر گئی۔ دوسرے دن ہمارے گھر ساگ مچھلی پکی تھی۔ میری والدہ نے ساگ مچھلی برتن میں ڈالی اسے سرپوش سے ڈھانپا اور مجھے دے کر کہا۔

”جاو ذیر خالہ کے گھر دے آ۔“

وزیر خالہ شبانہ کی والدہ کو کہتے تھے۔ میں خوش بھی ہوا اور گھبرا بھی گیا۔ میرا دل ساگ مچھلی کا برتن پکڑتے ہی دھڑکنے لگا۔ شبانہ کے مکان کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہو گئی۔ میں آہستہ آہستہ میڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ اوپر والا دروازہ کھلا تھا۔ دوسری منزل میں صرف ایک ہی چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے آگے کھڑے یا سیلانچے میں تانبے کا حمام پڑا تھا۔ شبانہ چوکی پر بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر دوپٹے

سے منہ پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے پاؤں فرش نے جکڑ لئے۔ اس نے ناراض ہو کر کہا۔

”وے چارلی! تم نے خط میں کیا لکھا تھا؟“

میں نے کہا۔

”آپو جی نے ساگ مچھلی بھیجی ہے۔“

اس نے برتن لے کر سالن دوسرے برتن میں ڈالا اور خالی برتن مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”وے چارلی! آج رات کو بارہ بجے اوپر مکان کی چھت پر آ جانا۔ میں ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا رکھوں گی۔“

اور وہ ہنستی ہوئی اوپر چلی گئی۔

اس نے مجھے آدھی رات کو چھت پر کیوں بلایا ہے؟ میں اس سے ملنے کیوں جا رہا ہوں؟ ان میں سے ایک بھی سوال میرے ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ مجھے صرف ایک ہی خوشی تھی کہ میں شبانہ کے قریب ہوں گا۔ اس کے رخسار کے سیاہ تل کو قریب سے دیکھوں گا اور وہ کسی اور سے نہیں صرف مجھ سے بات کرتے گی۔ ابھی تک ہماری ملاقاتیں، بلکہ میری ملاقاتیں صرف اس طرح ہوتی تھیں کہ وہ میڑھیاں اتر رہی ہوتی تو میں میڑھیاں چڑھ رہا ہوتا۔ وہ دوسری عورتوں میں بیٹھی باتیں کر رہی ہوتی تو کبھی کبھی میری طرف بھی دیکھ کر مسکرا دیتی۔ صبح منہ اندھیرے کمپنی باغ کی سیر کرتے ہوئے وہ دوسری عورتوں کے ساتھ نسواری برقعہ اوڑھے آگے جا رہی ہوتی تو میں پیچھے سے اس کا برقعہ کھینچ دیتا۔ اس رات میں اس کے پاس بیٹھا ہوں گا۔ ہم دونوں اکیلے ہوں گے۔ ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کروں گا۔ اس کی باتیں سنوں گا۔ میں بہت خوش تھا۔ میرے پاس کوئی گھڑی نہیں تھی۔ ہمارے گھر میں بھی کوئی ٹائم بتانے والا کلاک نہیں تھا۔

میں رات کو دوسرا شو دیکھنے ریالٹو سنیما چلا گیا۔ ریالٹو سنیما میں نیو تھیٹر کی فلم لگی ہوئی تھی۔ اس میں ایک گانا تھا۔

پیا ملن کو جانا

جب وہ گانا آیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے فلم کے سین میں ایک عورت کو اپنے محل سے نکل کر جنگل کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ جنگل میں اپنے

خیال دل میں ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف سے نکل رہے تھے۔ گلی رات کے دقت خالی پڑی تھی۔ میں اپنے مکان کے باہر تھڑے پر کھڑا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر سامنے شبانہ کے مکان کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شبانہ نے دروازے کی کنڈی اندر سے کھول رکھی ہوگی۔ میں دوڑ کر شبانہ کے مکان کے پاس آ گیا۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے اندر کو دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ ڈیوڑھی میں سے جو زینہ دوسری منزل کو جاتا تھا وہی زینہ دوسری منزل کے دروازے کے سامنے سے ہو کر اوپر چھت پر چلا جاتا تھا۔ میڑھیوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر میڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی منزل کے بند دروازے کے قریب سے ہوتا ہوا اوپر چھت پر آ گیا۔ رات سرد تھی۔ آسمان پر تارے سونے چاندی کے زیوروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں کونے میں منڈیر کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ منڈیر میرے کندھے تک آتی تھی۔ میں نے منڈیر کو ہاتھ سے چھوا۔ منڈیر خشم میں گیلی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ یہی وہ منڈیر ہے جس کے ساتھ لگ کر شبانہ مجھے گلی میں سے گذرتے دیکھا کرتی ہے۔ اتنے میں چھت کے دروازے پر ایک انسانی سایہ نمودار ہوا۔ یہ شبانہ تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتی میرے پاس آ گئی۔ مجھے یاد ہے اس نے تیشینے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ تیشینے کی گرم چادریں ہمارے امرتسر کے کشمیری گھرانوں میں بڑی عام ہوا کرتی تھیں۔ ہم امرتسر کی کشمیری ان کو چادریں کبھی نہیں کہتے تھے۔ ہم انہیں فردیا فردیں یا رفل اور رفلئس کہا کرتے تھے۔ شبانہ نے تیشینے کی چادر کا ایک پلو میرے کندھے پر کر دیا۔ اس کی چادر میں سے حنا کی گرم خوشبو آرہی تھی۔ ہم منڈیر کے ساتھ لگ کر نیچے گلی میں جھانک کر دیکھنے لگے۔ پھر اس نے ہمارے مکان کی چھت کی طرف دیکھا اور بولی۔

”وے چارلی! آپ جی کو تو پتہ نہیں چلا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

مکان کی دوسری طرف نیچے گلی کی مسجد کا صحن تھا۔ صحن رات کے اندھیرے

میں خالی اور خاموش تھا۔ شبانہ کہنے لگی۔

”وے کیا تم جج جج مجھ سے بڑی محبت کرتے ہو؟“

مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کیا جواب دیا تھا۔ ہمارے اوپر ستارے چمک رہے تھے۔ اس زمانے کا آلودگی کے بغیر نیا شفاف آسمان تھا۔ چھوٹے بڑے ستارے تھے۔ کسی میں سے نیلی، کسی میں سے سفید اور کسی میں سے گلابی رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔

محبوب سے ملنے جا رہی تھی۔ یہ عورت اس محل کی شہزادی تھی۔ راجکمار ہی تھی۔ رات اندھیری تھی۔ وہ ہر قدم پر رک کر پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تھی۔ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ کہیں اس کی بدنامی نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے خیال آیا۔ میں بھی آدمی رات کو دوسروں کے مکان کی چھت پر چوری چھپے جا رہا ہوں۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی جاگ پڑا تو کیا ہوگا۔ شبانہ کی بڑی بدنامی ہوگی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ پکڑ کر مارنا شروع کر دیں۔ سارے محلے والے جاگ پڑیں۔ ساتھ ساتھ لگے ہوئے تو مکان تھے۔ یہ خیال تھوڑی دیر کے لئے میرے دل میں آیا اور گانا ختم ہوا تو یہ بھی میرے دل سے ختم ہو گیا۔ انٹرول کے وقت میں نے کسی سے وقت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں وہیں سے واپس اپنے مکان پر آ گیا۔ شروع سردیوں کی راتیں تھیں۔ لوگوں نے کمروں میں سونا شروع کر دیا تھا۔ میں بھی اپنے مکان میں آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ سب سو رہے تھے۔ میں جاگ رہا تھا۔ نیند بھاپ بن کر اڑ چکی تھی۔ شبانہ کے گھر کی دیوار پر بڑا سا کلاک لگا ہوا تھا۔ میں نے سوچا وہ اس کلاک سے ٹائم دیکھ کر چھت پر آ جائے گی۔ اس کے گھر والے بھی سو گئے ہوں گے اور وہ جاگ رہی ہوگی یا اس نے بھی میری طرح سونے کا بہانہ بنا لیا ہوگا۔ میں حساب لگانے لگا۔ ریالٹو سنیما سے پیدل چل کر آیا ہوں۔ دس پندرہ منٹ ضرور گذر گئے ہوں گے۔ اب مزید دو منٹ گذر گئے ہوں۔ اب بارہ بجتے ہیں دس منٹ رہ گئے ہوں گے۔ اب دو منٹ رہ گئے ہوں گے۔ بس اب بارہ بج گئے ہوں گے۔ مجھے اٹھ کر چل پڑنا چاہیے۔ میں اس طرح رینگ کر چارپائی سے نیچے اترا کہ چارپائی کی آواز پیدا نہ ہو۔ کمرے کا دروازہ رک رک کر کھولا کہ اس کی بھی آواز نہ آئے۔ باہر دالان میں ستاروں کی دھندلی دھندلی روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے شبانہ کے مکان کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں چھت پر ماچس جلا کر بجھا دوں گی۔ میری نگاہیں اس کے مکان کی چھت پر لگی تھیں۔ چھت پر اچانک ماچس کی تیلی روشن ہو کر بجھ گئی۔

میں دبے پاؤں میڑھیاں اتر کر گلی میں آ گیا۔ ہمارے مکان اور شبانہ کے مکان کے دروازے کے درمیان صرف گلی حائل تھی۔ نیک نامی اور بدنامی کے درمیان صرف پانچ قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ ایک بار شبانہ کے مکان میں داخل ہو گیا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بڑی بدنامی ہوگی۔ شبانہ کے بھائی مجھے چھت پر سے نیچے پھینک دیں گے۔ میرے ماں باپ، بہن بھائی میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ سب کی بدنامی ہوگی۔ یہ

کریں گے لیکن میں انہیں کہوں گا کہ خدا کی قسم پاکیزہ خیالی کی بے وقوفی کا صرف ایک لمحہ حاصل کرنے کے لئے میں دنیا داری کی ساری عقل مند یوں کو قربان کر دینے کو تیار ہوں۔ یہ وہ متاع بے بہا ہے جو ملتی ہے تو مفت ملتی ہے۔ نہیں تو کسی قیمت پر نہیں ملتی۔ وہ ستاروں کی چھاؤں میں چھت پر سے ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میں دبے پاؤں چل کر دروازے تک آیا اور سانس روکے دونوں منزلوں کی سیزھیاں اتر گیا۔ گلی اسی طرح خالی تھی۔ میں دوڑ کر اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

میری بڑی ہمشیرہ کی شادی کی تقریب تھی۔ تیل مندی کی رات تھی۔ گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ چولہے پر سبز چائے کا بڑا دیگچہ چڑھا ہوا تھا۔ گلی میں ٹائی دیگ پکا رہا تھا۔ اینٹوں کے اوپر رکھے گیس روشن تھے۔ عورتیں سرخی پاؤں ڈر لگائے رنگ برنگ ریشمی کپڑے پہنے گھر میں چل پھر رہی تھیں۔ سردیوں کا موسم تھا۔ عطر کی خوشبوؤں سے فضا بو جھل ہو رہی تھی مگر مجھے یہ فضا بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اسی فضا میں ساری زندگی کا آخری سانس بھی لوں۔ چولہے کے پاس میری ٹائی اور خالہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ٹائی تھوڑی دیر بعد سبز چائے کے دیگچے میں کفگیر ہلانے لگتی تھی۔ میری ٹائی کشمیری زبان روانی سے بولتی تھی۔ بہت بوڑھی ہو گئی تھی مگر ہرنی کی طرح چاق و چوبند تھی۔ ہماری والدہ اور خالہ کشمیری سمجھ لیتی تھیں مگر روانی سے بول نہیں سکتی تھیں۔ میں نے دو گھوڑا بوسکی کی فیض اور پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں کلکتے کے کالے سلیپر تھے۔ کندھوں پر میں نے عنابی رنگ کی تشینے کی فرد ڈال رکھی تھی۔ اس زمانے میں دو گھوڑا بوسکی عام ملتی تھی۔ وہ بوسکیوں اور ہشمنوں کا زمانہ تھا۔ اب گھوڑے بہت ہو گئے ہیں۔ بوسکی غائب ہو گئی ہے۔ میں بار بار اس کمرے میں جاتا جہاں عورتیں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ ان میں زیادہ تر ہماری رشتہ دار خواتین تھیں مگر میں ان کے لئے نہیں بلکہ شبانہ کے لئے جاتا تھا جو گھنٹے جوڑے گردن ایک طرف کئے ڈھولک بجا رہی تھی اور پنجابی کا گیت گا رہی تھی جو اس زمانے میں بیاہ شادیوں والے گھروں میں ضرور گایا جاتا تھا۔

میں ان تاروں کو دیکھ رہا تھا اور شبانہ کی تشینے کی چادر میں سے آنے والی حنا کی گرم خوشبو مجھے آسمان پر پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ستاروں کے باغ میں اڑائے لئے پھر رہی تھی۔ آسمان آلودگی سے پاک تھا۔ میرا ذہن آلودگی سے پاک تھا۔ نہ آسمان پر جلے ہوئے پڑول کا دھواں تھا نہ میرے ذہن میں کسی جلے ہوئے خیال کا دھواں تھا۔ آسمان بھی شفاف تھا۔ میرا ذہن بھی شفاف تھا۔ آسمان پر بھی ستارے چمک رہے تھے۔ میرے دل میں بھی ستارے چمک رہے تھے۔ میرے دل سے آسمان تک ستاروں کی نورانی روشنی کا سفر جاری و ساری تھا۔

شبانہ نے میرے کاندھے پر سے تشینے کی چادر سمیٹتے ہوئے کہا۔
”وے چارلی! اب تم چلے جاؤ۔ کوئی جاگ نہ پڑے۔ سیزھیوں میں آہستہ پاؤں رکھ کر جانا۔“

وہ سرگوشیوں میں بات کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہسپانیہ کے مندی کے درختوں کے جنگل میں آ گیا ہوں اور حنا کی خوشبو مجھ سے ہمکلام ہے۔ آہ! بچپن کی معصوم محبتیں! شبنم میں بھیکے ہوئے کنول کے پھولوں کی طرف پاک محبتیں! طلوع ہوتے ہوئے سورج کی پہلی کرنوں سے بھی زیادہ شفاف، زیادہ نورانی محبتیں! جب انسان کا جسم ٹرانسپیرنٹ ہو جاتا ہے۔ شفاف ہو جاتا ہے اور پاکیزہ ترین خیال بن کر اپنے خدا کی طرف محو پرواز ہو جاتا ہے۔ جس طرح برائی اپنا ایک نتیجہ نکالتی ہے اسی طرح نیک خیالی اور پاکیزگی بھی ہمیں زندگی کے ایک مقام تک ضرور لے جاتی ہے۔ دل و دماغ کی پاکیزگی بے دارغ خیالات کی خوشبوئیں۔ یہ انسانی زندگی کے موسم بہار کی نشانیاں ہیں۔ جب انسان کے بدن میں پاکیزہ خیالوں کے سچے گلابوں کی ہوائیں چلتے لگتی ہیں تو معبود حقیقی کی طرف، اپنی تخلیق کے واحد اور اعلیٰ ترین مقاصد کی طرف اس کا مقدس سفر شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ہمارا جسم ایک عبادت گاہ بن جاتا ہے۔ خالق حقیقی کی حمد و ثناء کی مقدس عبادت گاہ۔ پھر کوئی بھی خیال صرف سورج کی کرن بن کر ہی ہمارے جسم کی عبادت گاہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ میری اس پاکیزہ خیالی کی خواہش کو بیوقوفی کہیں گے۔ ایسے لوگ اس زمانے میں بھی تھے جب میں آدھی رات کو چھپ کر ایک لڑکی کو اس کے مکان کی چھت پر اس طرح ملا تھا جس طرح موسیٰ کی خوشبو اپنے پھجڑے ہوئے پھول سے ملتی ہے اور ایسے لوگ آج کے زمانے میں بھی ہیں جو میری ان باتوں کا مضحکہ اڑائیں گے اور انہیں میری حماقت اور بے وقوفی پر محمول

ادھی	راتیں	چڑھن	کھتیاں
لکھاں	میں	لال	چھٹیاں
لکھاں	سدھیاں	ہوون	پٹھیاں
خدا	جانے	یہ	کیا

نہیں نظر نہ آئی۔ میں بازار میں آیا تو وہاں بھی نہیں تھی۔ میں نے قبرستان میں آکر رگاہ کے دروازے کی جانب دیکھا۔ شبانہ اندر مزار پر فاتحہ پڑھ رہی تھی۔ میں ایک طرف ہٹ کر درختوں کے پیچھے کھڑا رہا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ درگاہ سے نکلی اور پیچھے ع قبرس بنی ہوئی تھیں ان کی طرف چلی گئی۔ میں بھی اوپر سے ہو کر وہاں آگیا۔ وہ ایک قبر کے پاس تھڑے پر بیٹھی تھی۔ اس نے برقعے کا نقاب الٹ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ گری اور لو کی پیش سے تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔

میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت ہمیں کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ان کا کوئی مر گیا ہے اور یہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہیں۔ میرے بیٹھے ہی اس نے پوچھا۔

”وے تم بمبئی کیوں جا رہے ہو؟“

میں نے کہا۔

”بس اب میرا دل یہاں نہیں لگتا۔“

”واپس نہیں آؤ گے۔“

”نہیں۔“

”مجھے یاد کیا کرو گے؟“

”ہاں۔“

اس نے اپنی کلائی کی ایک چوڑی اتار کر مجھے دی اور کہا۔

”یہ میری نشانی اپنے پاس رکھنا۔“

میں نے چوڑی لے کر جیب میں رکھ لی۔ مجھے بڑا خیال آ رہا تھا کہ اس نے ایک بار بھی مجھے نہیں کہا کہ بمبئی نہ جاؤ۔ میں تمہارے بغیر اداس ہو جاؤں گی۔ ہمارے درمیان دو تین کچی قبرس تھیں۔ قبرستان میں گرمیوں کی دوپہر کا سناٹا تھا۔ ایک کوا درخت پر زور سے بولا۔ شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”واپس چلو، کوئی دیکھ لے گا۔“

میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ چلنے لگا تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔

”پہلے مجھے جا لینے دو، پھر تم آنا۔“

وہ دو قدم چل کر رک گئی۔ واپس آئی اور کہا۔

”وے بمبئی جا کر مجھے خط نہ لکھنا۔ خبردار سب کو پتہ چل جائے گا۔ ماموں مجھے

جبن مل سی کہ نہ مل سی
تساں نوں مان وٹاں دا
تسی او یار پردیسی

میں جب بھی یہ گیت سنتا تو میری آنکھوں کے سامنے سردیوں کی رات کا منظر آ جاتا اور میں آسمان پر چمکتی دمکتی بنات النعش دیکھتا مگر اس وقت میں شبانہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بیاہ شادیوں والے سرخ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ ڈھولک بجاتے ہوئے گیت گا رہی تھی۔ اس کے چہرے کے آگے بالوں کی ایک لٹ جھول رہی تھی اور گیس کی روشنی میں اس کے ناک میں پڑا ہوا سرخ موتی بار بار چمک اٹھتا تھا۔

میں گھر سے بھاگ کر بمبئی جانے لگا تو میں نے شبانہ کو ایک بچے کے ہاتھ رقعہ لکھ بھیجا کہ میں ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ تم سے آخری بار ملنا چاہتا ہوں۔ ہم کبھی کبھار ہی ایک دوسرے کو رقعہ لکھتے تھے۔ اس لئے کہ دن میں کئی بار ایک دوسرے کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا اور ایک دوسرے کو دیکھ لینا ہی محبت کا منتہائے مقصود تھا۔

ہم رقعے کے اوپر اور نیچے ایک دوسرے کا نام نہیں لکھتے تھے۔ رقعہ بھی بڑا مختصر ہوتا تھا جیسے کسی کو ٹیلی گرام دیتے ہیں۔ اس نے جواب میں لکھا کہ میں بڑی خالہ کے زنانہ سنور میں دوپہر کو جاؤں گی تم سنور والی گلی کے کونے پر میرا انتظار کرنا۔ کچھ لوگوں نے بلکہ کچھ عورتوں نے اپنے گھروں کے دیوان خانوں میں زنانہ سنور کھول رکھے تھے۔ جہاں عورتیں آکر اپنی پسند کی چیزیں خریدتی تھیں۔ شبانہ کی بڑی خالہ نے بھی اپنے مکان کے نیچے ایک زنانہ سنور کھول رکھا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ لو چل رہی تھی۔ سڑکیں تپ رہی تھیں۔ گلیاں ٹھنڈی تھیں۔ میں گلیوں گلی ہوتا زنانہ سنور والی گلی کی کٹڑ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے شبانہ نظر آئی۔ میں نے اسے برقعے میں اس کی چال سے دور ہی سے پہچان لیا۔ اس نے نقاب ڈال رکھا تھا۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

”درگاہ پر آ جاؤ۔“

یہ درگاہ شریف قبرستان میں تھی اور کوئی بزرگ وہاں آسودہ خاک تھے۔ وہ بازار پار کر کے سامنے والی گلی میں چلی گئی۔ تھوڑا وقفہ ڈال کر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ یہ گلی شہر کی فسیل کے باہر بازار میں جا نکلتی تھی۔ یہاں سے آگے چند قدموں کے فاصلے پر قبرستان تھا۔ شبانہ دہلی پٹی تھی اور بڑی تیز تیز چلتی تھی۔ وہ مجھے گلی میں

مار ڈالیں گے۔

وہ اپنے سخت طبیعت والے ماموں سے بڑا ڈرتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”نہیں لکھوں گا۔“

وہ چلی گئی۔ جب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں بھی قبروں کے درمیان چلنے لگا۔ راستے میں امروڈ کا باغ آتا تھا۔ گرم دوپہر میں لو کے ساتھ باغ میں سے کچے امروڈوں کی خوشبو آئی تو میں وہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ مجھے بڑا غصہ آ رہا تھا کہ شبانہ نے مجھے بہیجی جانے سے روک رکھا تھا۔ اس نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ بہیجی مت جاؤ۔ میں تمہارے بغیر اداس ہو جاؤں گی۔ میں خاموش اداس بیٹھا تھا۔ امروڈ کا باغ بھی خاموش اور اداس تھا۔ ساری دوپہر خاموش اور اداس تھی۔ اس اداس خاموشی میں کتنا کتنا سزا اور کتنی گہری رومانیت تھی۔ یہ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا۔ اس لئے معلوم نہیں تھا کہ میرا اس کیفیت سے الگ کوئی وجود نہیں تھا۔ میں خود ہی اداس تھا۔ خود ہی خاموش تھا۔

اس زمانے میں امرتسر سے پنجاب میل یا کوئی اور ایکسپریس گاڑی دن کے نو بجے کے قریب بہیجی کے لئے روانہ ہوتی تھی۔ میں نے سکول کی کتابوں کا کمرہ کر بڑی بہن سے کچھ روپے لئے اور تین کپڑوں میں ریلوے شیش پر آگیا۔ بہیجی کا تھوڑا کلاس کا ٹکٹ خریدا۔ گاڑی آئی تو اس میں سوار ہو کر بہیجی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ میری آوارہ گردیوں کے دور کا بہیجی کا دوسرا پھیرا تھا۔ پہلے بھی وہاں خوار ہو کر واپس آیا تھا۔ اس بار بھی بڑا خوار ہوا۔ خیال تھا کہ بہیجی میں کسی سنیما ہاؤس میں گیٹ کیپر ہو جاؤں گا۔ اس طرح فلمیں دیکھنے کا موقع مل جائے گا اور وہاں رہنے اور فلم سٹوڈیو میں جا کر ایکٹر ایکٹریوں کو دیکھتے رہنے کا سبب بھی بن جائے گا مگر بہیجی نے دوسری بار بھی مجھے منہ نہ لگایا۔ جاتے ہی اوپر تلے دس بارہ فلمیں دیکھ لیں۔ پیسے ختم ہو گئے۔

کسی سنیما ہاؤس کی گیٹ کیپر نہ ملی۔ وہاں میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ میری نو عمری کا زمانہ تھا۔ دو دن کا فاقہ آگیا۔ دوسرے دن شام کو نقاہت کے عالم میں چوپانی سمندر کے کنارے دیوار پر بیٹھا تھا کہ ایک اللہ کا نیک بندہ مل گیا۔ اس نے مجھے ایرانی دمنل میں کھانا کھلایا۔ کہنے لگا۔

”پنجاب سے سب لڑکے یہاں ہیرو بننے آ جاتے ہیں اور فاقے کرتے ہیں۔ رات کے نو بجے بوری بندر کے شیش سے پنجاب میل چلتی ہے۔ اس میں بیٹھ کر اپنے

گھر واپس چلے جاؤ۔“

اس نے مجھے دس روپے دیئے۔

”میرے پاس یہی کچھ ہے اس وقت۔“

میں نے وہاں سے بس پکڑی اور سیدھا بہیجی کے دوسرے بڑے شیش بوری بند آگیا۔ بہیجی سے ہی مجھے ریل گاڑیوں میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا شوق بھی تھا اور تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ میں نے پلیٹ فارم کا ٹکٹ خریدا اور اس پلیٹ فارم پر آگیا جہاں سے پنجاب ایکسپریس کو روانہ ہوتا تھا۔ گاڑی کے چلنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ میں نے ٹی شال پر کھڑے ہو کر چائے پی۔ پمٹری کھائی اور پان سگریٹ کے شال پر پلیٹرز کے سگریٹوں کا کالے رنگ کا چوڑا پیکٹ خریدا۔ یہ اس زمانے میں بڑے اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے بیچ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھنے لگا۔ دل میں اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ میں شبانہ کے پاس جا رہا ہوں۔ ایک بار پھر اسے برقعہ سمیٹ کر گلی میں سے گزرتے، عورتوں میں بیٹھی باتیں کرتی اور چھت پر گیلے کپڑے ڈالتی دیکھ سکوں گا۔ پنجاب میل یا پنجاب ایکسپریس جو بھی اس کا نام تھا آکر پلیٹ فارم پر لگ گئی۔ مسافروں نے بلہ بول دیا۔ میں تین کپڑوں میں تھا۔ میرے پاس سوائے پلیٹرز کے پیکٹ کے اور کوئی سامان نہیں تھا۔ میں بھی ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا لیکن اپنے تجربے کی روشنی میں ایسی جگہ پر بیٹھا جہاں دروازہ قریب ہی تھا اور میں ٹی ٹی کو آنا دیکھ کر ڈبے میں سے اتر سکتا تھا۔ میں چلتی ٹرین سے بھی اتر جایا کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے ٹرین زیادہ تیز نہ ہوئی ہو۔ ٹرین چل پڑی۔ ساری رات چلتی رہی۔ کوئی ٹی ٹی نہ آیا۔

دوسرے دن ٹرین جنگلوں میں سے گزر رہی تھی۔ کبھی کسی دریا کا پل آ جاتا۔ کبھی ہرے بھرے کھیتوں اور تازہ کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اچانک ہمارے ڈبے میں ٹی ٹی آگیا۔ وہ ایک ڈبے کے دروازے میں سے دوسرے ڈبے کے دروازے کو پکڑ کر چلتی گاڑی میں آگیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن قدرتی طور پر تیز ہو گئی۔ دروازے سے باہر اترنے کا مقام نہیں تھا۔ میں دروازے کے قریب ہی چار پانچ مسافر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے بھی باہر نہیں کود سکتا تھا۔ اتنے میں ٹکٹ چیک کرتے کرتے ٹی ٹی میں میرے پاس بھی آگیا۔ اس نے مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ میں نے اوپر برقعہ کر طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ٹکٹ میرے دوست کے پاس ہے۔ وہ اوپر بیٹھا ہے۔“

مجھے خوب مارا پیٹا۔ پھر اعلان کر دیا کہ اس کی پڑھائی بند۔ میں اسے پہلوان بناؤں گا۔ والد صاحب کا تعلق امرتسر کے کشمیری پہلوانوں سے تھا۔ وہ شروع ہی سے امیرے پہلوان بنانے کے حق میں تھے اور میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ منہ اندھیرے شیخ چلی کے اکھاڑے میں لے جا کر زور کرایا کرتے تھے۔ مجھے تیرنا بھی انہوں نے ہی سکھایا تھا لیکن میری والدہ مجھے پڑھانا چاہتی تھی۔ اب والد صاحب نے اعلان کر دیا کہ یہ پہلوان بنے گا، بس!

والد صاحب نے میری نڈ کرادی۔ منہ اندھیرے مجھے کان سے پکڑ کر بستر سے اٹھاتے اور شیخ چلی کے اکھاڑے میں لے جا کر میرے بدن پر تیل کی مالش کرتے۔ اکھاڑے کی مٹی میرے اوپر ڈالتے اور اپنی ٹانگ آگے کر کے کہتے۔ ”گراؤ مجھے۔“

اس زمانے میں والد صاحب کا جسم بڑا سڈول اور خوبصورت تھا۔ میں یونہی ان کی ٹانگ سے لپٹ کر زور لگانا شروع کر دیتا۔ پھر والد صاحب مجھے دھول مار کر دوسری طرف گرا دیتے۔ اکھاڑے کے باہر بیٹھے ایک بزرگ پہلوان کو میں نے یہ کہتے سنا تھا۔ ”کہتے ہیں پہلوانوں میں عقل نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ میں تمہیں بتانا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہر پہلوان میں اکھاڑنے میں اترنے سے پہلے عقل ہوتی ہے لیکن جب اسے ایک طرف سے دھول پڑتی ہے تو عقل بھاگ کر دوسری طرف چلی جاتی ہے۔ جب دوسری طرف سے دھول پڑتی ہے تو عقل دوڑ کر واپس آ جاتی ہے۔ جب تیسری دھول پڑتی ہے تو عقل دماغ سے دوڑ لگا دیتی ہے۔“

میں اپنی عقل کو دماغ سے باہر نہیں نکلنے دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں ایک بار پھر گھر سے پیسے چرا کر بھاگ گیا۔ اس دفعہ میں بمبئی کی بجائے کلکتے کی طرف بھاگا۔ کلکتے کے بھی اس سے پہلے اپنے پھوپھا کے ساتھ ایک دو پھیرے لگا چکا تھا۔ ہمارے پھوپھا امرتسر کے لوہ گڑھ محلے میں رہتے تھے اور امرتسر سے شیمینے کی شالوں کی بدھیں لے کر کلکتے جایا کرتے تھے۔ کلکتے میں لوڑچیت پور سٹریٹ کے پاس زکریا سٹریٹ ہے۔ امرتسر کے کشمیری سوداگر اسی علاقے میں اپنے ڈیرے لگاتے تھے۔ یہاں ان کی دکانیں بھی تھیں جہاں شالیں فروخت ہوتی تھیں۔ شالوں کی دھلائی ہوتی تھی۔ شالوں کو چرخ چڑھایا جاتا تھا۔ شالوں، قالینوں اور گرم کپڑوں کی رفوگری کا کام بھی ہوتا تھا۔ ایک بار میں گھر سے بھاگ کر زکریا سٹریٹ اپنے رشتے داروں کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے وہیں پکڑ کر بٹھالیا

ٹی ٹی نے اوپر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے مسافر سے میرا ٹکٹ مانگا تو اس نے حیرانی سے نیچے مجھے دیکھا اور بولا۔

”اس کا ٹکٹ میرے پاس کہاں سے آگیا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔“

میں نے فوراً کہا۔

”میرے خیال میں میرا دوست دوسرے ڈبے میں ہے۔“

ٹی ٹی نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔

”فرخ آباد کا ہوں۔ میری ٹرین میں کوئی دو آؤٹ ٹکٹ سفر نہیں کر سکتا۔“

اس ٹی ٹی کے یہ الفاظ پورے کے پورے آج بھی مجھے یاد ہیں۔ اسکی شکل

تھوڑی تھوڑی یاد رہ گئی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرے پاس صرف چھ سات روپے ہی ہیں تو بولا۔

”تم ابھی چھوٹے ہو۔ تمہیں حوالات میں بند نہیں کروں گا۔ بس اگلے سٹیشن پر نیچے اتار دوں گا۔“

اس نے مجھے اگلے سٹیشن پر گاڑی سے اتار دیا۔ میں پلیٹ فارم پر ہی رہ گیا اور گاڑی چلی گئی۔ یہ برہان پور کا سٹیشن تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ 1942-43ء کا زمانہ تھا۔ برہان پور ایک پلیٹ فارم کا سٹیشن تھا۔ سٹیشن کے پیچھے ایک طرف اونچی پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ میں پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جا کر ایک بیچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے پتہ کر لیا تھا کہ پنجاب کی طرف جانے والی گاڑی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آئے گی۔ میں اس گاڑی میں بھی بغیر ٹکٹ ہی سفر کرنے والا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس دفعہ ٹرین کے آخری ڈبے میں بیٹھوں گا۔ وہاں تک ٹی ٹی نہیں آتا۔

میں کس طرح بغیر ٹکٹ پنجاب یعنی اپنے شہر امرتسر پہنچا۔ راستے میں کہاں کہاں ٹی ٹی سے چھپ کر اترتا اور پھر دوڑ کر چلتی ٹرین میں چڑھنا پڑا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہر حال میں امرتسر پہنچ گیا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے اس کے مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی پر جتنی پڑی ہوئی تھی۔ شبانہ کو میرے واپس آنے کا پتہ چلا تو وہ تھوڑی سی چینی یا نمک مانگنے کے بہانے ہمارے گھر میں آئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

”آگئے ہو خیر۔“

میں اس کو دیکھ کر خوش بھی ہو رہا تھا اور شرمندہ بھی۔ والد صاحب نے پہلے تو

”وے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہارا رنگ اتنا زرد کیوں ہے؟“

میں اس وقت اپنے آپ کو نیو تھیمز کی رومانی فلیوں کا ہیرو سمجھ رہا تھا، جو اپنی محبوباؤں کی محبت میں ناکام ہونے کے بعد چپ ہو جاتے ہیں اور آنکھوں میں آنسو لئے ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ میں ایک ہفتہ لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ جس روز امرتسر واپس آیا اس روز شبانہ کی برات آنے والی تھی۔ گلی میں درختوں کے پتوں کی جھنڈیاں لگی تھیں۔ کیلے کے درختوں کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس کے درمیان گیندے کے پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ شبانہ کے مکان کے آگے خالی دیکیں گرم پانی سے دھوئی جا رہی تھیں۔ میں وہیں سے واپس ہو گیا۔ مرزے والی گلی میں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ میں اس کے مکان پر چلا گیا۔ وہ میرا راز دار تھا۔ جب اسے شبانہ کی شادی کا پتہ چلا تو وہ بھی پریشان ہو گیا اور مجھے تسلیاں دینے لگا۔ میں نے کہا۔

”وہ گانا گائو۔ سہل کا گانا۔“

میرے دوست نے اسی وقت الماری سے ہزامنٹز وائس کا گراموفون نکالا۔ سے چابی دی۔ ڈبے میں سے سہل کے گانے کا ریکارڈ نکال کر گول چکر پر رکھا۔ ساؤنڈ بس میں غنی سوئی لگائی۔ گراموفون اون کیا اور ساؤنڈ بکس کی سوئی گھومتے ہوئے ریکارڈ رکھ دی۔ سہل کی درد بھری آواز ابھری۔

نہ کوئی پریم کا روگ لگائے

پریمی کے اس پلنگے پن پر

سب دنیا مکائے

روپ کے چتر کو من میں رکھ کر

آگ سے آگ بجھائے

گلی گلی ساجن کو ڈھونڈے

جگ سے آنکھ بچائے

من میں روئے جی بھر بھر کے

الحین میں مکائے

نہ کوئی پریم کا روگ لگائے

یہ نیو تھیمز کی فلم ”پریذیڈنٹ“ کا گانا تھا اور اسے آرزو کھنٹوی نے لکھا تھا۔
فی دیر سہل گاتا رہا میں اپنے دوست کے کاندھے پر سر رکھے آنسو بہاتا رہا۔ آج اتنے

اور پیچھے والد صاحب کو خط لکھ دیا کہ لڑکے کو ہم نے پکڑ لیا ہے۔ کوئی اعتباری آدمی بھیج کر اسے منگوائیں۔ اس دفعہ میں بھاگ کر بھگتے گیا تو زکریا سٹریٹ سے دور دور ہی رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس طرف گیا تو میرے رشتے دار مجھے وہیں دبوچ لیں گے اور والد صاحب کو خط لکھ دین گے کہ کوئی اعتباری آدمی بھیج کر لڑکے کو منگوائیں۔

بھگتے میں مجھ پر کیا گزری؟ میں بھگتے کی گلیوں بازاروں، پارکوں اور باغوں میں کہاں کہاں آوارہ گردی کرتا پھرا؟ کون کون سے بنگے فٹ پاتھوں پر راتیں بسر کیں؟ کیسے کیسے خوبصورت معصوم چہرے دیکھے؟ کس طرح بنگال کے خطرناک جنگلوں کی طرف نکل گیا؟ ان باتوں کا براہ راست میری زندگی کے ان رومانیت والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ آخر یہاں سے بھی بھل خوار ہو کر میں واپس اپنے شہر کی طرف چل پڑا۔ میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ لکھنؤ کے ریلوے سٹیشن پر میں نے لاہور سے چھپنے والے انگریزی کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنے امتحان کا نتیجہ دیکھا تھا۔ میرا رول نمبر چھپا ہوا تھا۔ میں پاس ہو گیا تھا۔ اس دفعہ گھر پہنچا تو میرے پاس ہونے کی خوشی میں کسی نے مجھے کچھ نہ کہا۔ والد صاحب بہت خوش تھیں۔ والد صاحب بھی خوش تھے مگر انہوں نے یہ ضرور کہا۔

”بس آگے پڑھائی بند۔ میں اسے میٹرک پاس پہلوان بناؤں گا۔“

اگرچہ میری اور شبانہ کی محبت معصوم محبت تھی۔ دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھار سیڑھیوں میں یا مکان کی ڈیوڑھی میں آمناسامنا ہو جاتا تو ایک دوسرے سے بچ کر نکل جاتے۔ چھپ چھپ کر ملنا تو بڑی دور کی بات تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کوئی سن نہ لے۔ اس کے باوجود شبانہ کے گھر والوں کو ہماری محبت کا علم ہو گیا۔ شریف وضع دار لوگ تھے۔ انہوں نے شبانہ کی شادی ایک جگہ طے کر دی۔ مجھے پتہ چلا تو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے چپ سی لگ گئی۔ کہنی باغ کی طرف نکل گیا۔ آموں کے ان درختوں کے پاس جا کر بہت رویا جنہوں نے ہمیں منہ اندھیرے کے نورانی دھندلکے میں نہر میں چھلنا نہیں آگاتے دیکھا تھا۔ واپس اس گلی میں آنے کا حوصلہ نہ پڑا جس گلی میں میرا اور شبانہ کا مکان تھا۔ وہاں سے مسلم ہائی اسکول کی طرف چلا گیا۔ وہاں مندرہ بس سروس کا لاری اڑا تھا۔ جہاں لاہور کی طرف لاریاں چلتی تھیں۔ ایک لاری میں بیٹھا اور لاہور اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ کے پاس آگیا۔ انہوں نے میری شکل دیکھ کر کہا۔

برس گذر جانے کے بعد جب میں اس منظر کو یاد کرتا ہوں تو ایک لمحے کے لئے بھی مجھے یہ خیال نہیں آتا کہ وہ میرا بچپن تھا۔ میں ناکہجی میں احمقوں کی طرح آنسو بہا رہا تھا بلکہ مجھے ان آنسوؤں پر رشک آتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ آج میرے اور میرے پہلی محبت کے ان آنسوؤں کے درمیان نفرتوں، خود غریبوں اور گناہوں کی دیوار حائل ہو گئی ہے۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہ دیوار درمیان سے اٹھ جائے گی اور میری پھڑکی ہوئی محبتیں، مجھ سے پھڑے ہوئے آنسوؤں کے موتی، ان موتیوں کے سمندر، ان سمندروں کے سرسبز جزیرے اور ان جزیروں کے جنگل اور ان جنگلوں کی بارشیں ایک بار پھر مجھ سے آن لیں گی۔ پھر چھپ چھپ کر ملاقاتیں نہیں ہوں گی۔ کوئی دوسرا دیکھنے والا نہیں ہوگا۔ کوئی دوسرا مجھے سننے والا نہیں ہوگا۔ میں خود ہی بولوں گا اور خود ہی اپنی آواز سنوں گا۔ خود ہی سامنے آؤں گا اور خود ہی اپنے آپ کو دیکھوں گا۔ میں ہی جنگل ہوں گا اور میں ہی اس جنگل کی بارش، پھول، سمندر، طلوع آفتاب اور آفتاب کی سنہری کرنوں میں چمکتے ہوئے سرسبز زمردیں جزیرے!

آج اتنے برس گذر جانے کے بعد جب میں اس ویران کالج میں تنہا بیٹھا اپنی داستان قلم بند کر رہا ہوں اور اپنی پہلی محبت سے جدائی کے سوگوار لمحات کو یاد کر رہا ہوں تو شیے کی ایک نظم کے یہ شعر بے اختیار میری زبان پر آرہے ہیں۔

THEN WILL I SEEK MY LOVE,
THEN WILL I CHEER HER,
THEN MY ESTEEM WILL PROVE,
WHEN NO FRIEND IS NEAR HER

ON HER GRAVE I WILL LIE,
WHEN 'LIFE IS PARTED,
ON HER GRAVE I WILL DIE

اس کے بعد بھی ایک لائن تھی جو مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہی۔ میں شام ہونے تک اپنے دوست کے مکان کی بیٹھک میں سہل، کانن اور ہنگ ملک کے داس گیت سنتا رہا اور اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ شبانہ کی ڈولی رات کے پچھلے پہر رخصت ہو گئی۔ میں اس وقت ساتھ والی گلی میں ایک بند دکان کے پٹے پر پاؤں لٹکائے خاموش بت بنا بیٹھا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں اپنے مکان پر گیا۔ اپنی گلی میں گیا جہاں شبانہ کی بارات بیٹھی ہے تو میں مری جاؤں گا۔ مجھے بانہ کی بارات کے باجوں کی آواز سنائی دی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں سب خود رفتگی کے عالم میں وہاں سے اٹھا اور شہر کی فصیل والے دروازے کی طرف ہلنے لگا۔ باجوں کی آواز رات کے پچھلے پہر کے سنائے میں شکاف ڈال رہی تھی۔ میں

خوشبوئیں بھی میرے پاس آ جاتی ہیں جن کے پھول ابھی کھلے ہی نہیں ہوتے۔ جن کے پھول ابھی بچ کی تاریکیوں میں سو رہے ہوتے ہیں۔ ابھی خدا کے حکم سے ان میں خوشبو کی روح بھونکی جانے والی ہوتی ہے۔

مجھے گیندے کی خوشبو پچھلے پھر کے اندھیرے میں ساتھ والے باغیچے میں لے گئی۔ یہاں ایک کیاری میں گیندے کے بڑے بڑے زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ شبنم میں بیگ رہے تھے۔ یہ سرد راتوں کی شبنم تھی جو پچھلے پھر ٹھنڈے سیال موتی بن کر پھولوں پر گرتی ہے۔ مجھے گیندے کے سارے پھول مراقبے میں گم نظر آئے۔ میں وہاں سے نکل کر کہنی باغ کے ان سنگ مرمر کے تالابوں کے پاس آ گیا جن میں سنہری مچھلیاں تیرا کرتی تھیں۔ ان تالابوں کے درمیان ایک قطعے میں گل داؤدی کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ رات کے وقت وہاں سوائے میرے اور داؤدی کے پھولوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے بے اختیاری کے عالم میں جھک کر ایک پھول کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ پھول پاکیزہ شبنم میں شرابور تھا۔ میری گرم آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ میرا ٹھنڈا چہرہ گرم ہو گیا۔ میں نے لمبا سانس لیا۔ ایک گرمی، لطیف اور مہموم سی خوشبو میرے ساتھ سانس لیتی ہوئی میری برگ و پے میں اترتی چلی گئی۔ انتہائی یک سوئی اور مراقبے کے عالم میں محسوس کی جانے والی یہ خوشبو جیسے زمین کی گرائیوں کی گرائی میں بند نافوں کی چٹانوں کو توڑ کر اوپر آ رہی تھی۔ میرا چہرہ داؤدی کے پھول میں چھپا ہوا تھا اور میں اس اکیلے پھول کے جنگل میں چھپ گیا تھا، گم ہو گیا تھا اور ہیرے جواہرات سے جگمگاتے راستوں پر اپنے سے گریزاں خوشبو کے پیچھے پیچھے اڑتا چلا جا رہا تھا۔

جب میں اس پھول کے جنگل سے باہر نکلا تو آسمان پر صبح کا نور جھلکنے لگا تھا۔ اس نور کے آگے ستاروں کا نور ماند پڑتا جا رہا تھا۔ میں کہنی باغ والی سر کے کنارے کنارے چلتا چالیس کھوہ کے سرسوں کے کھلے کھیتوں میں نکل آیا۔ اس وقت مشرقی افق کے کنارے طلوع ہونے والے سورج کی سرخی سے لال ہو رہے تھے۔ یہ سرخی دیکھتے دیکھتے سنہری ہو گئی اور پھر سیال سونے کا چمکتا، دکھتا، لرزتا ہوا سورج طلوع ہوا۔ اس وقت سورج نے اپنا دیدار عام کر رکھا تھا۔ اسے کوئی بھی کھلی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ سونے کا بہت بڑا تھا لگ رہا تھا جو اپنے پچھلے ہوئے سونے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جیسے جیسے وہ اوپر آ رہا تھا اس کا جلال اس کی تابانی

دروازے سے نکل کر شریف پور کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ ستارے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ باجوں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی اور میرا کہنی باغ قریب آتا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں میں کب شریف پورے کی آبادی کے قریب سے گزر گیا۔ کب میں نے ریلوے پھانک عبور کیا اور کب کہنی باغ نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

رات بڑی سرد تھی۔ کرا پڑ رہا تھا مگر میں سردی اور کمرے کے احساس سے بے خبر تھا۔ میں سیدھا اس نہر پر آ گیا جس کے اوپر جھکے ہوئے آم کے درختوں نے ہم دونوں کو اکٹھے ہشتے کھیلنے اور نہر میں چھلانگیں لگاتے دیکھا تھا۔ نہر خاموشی سے بہہ رہی تھی۔ آم کے درختوں پر سے اوس ٹپک رہی تھی۔ اس کی شنیاں نہر پر جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر اپنا ہاتھ رکھا تو مجھے توانائی کی ایک گرم رو درخت سے نکل کر اپنے جسم میں داخل ہوتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنا چہرہ درخت کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری محبت نے، میری محبتوں کی محبت نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا ہو۔ مجھے ایک عجیب سی طاقت اور سکون کا احساس ہوا۔ اگر میں گوتم بدھ ہوتا تو وہ گھڑی میرے گیان حاصل کرنے کی گھڑی تھی مگر میں گوتم بدھ نہیں تھا۔ مجھ میں اور گوتم بدھ میں اس وقت زمین آسمان کا فرق تھا۔ گوتم بدھ نے دوسروں کو دکھ میں مبتلا دیکھ کر شاہی محل کا عیش و آرام چھوڑ کر جنگل میں بھیرا کیا تھا اور میں صرف اپنی محبت کا دکھ لے کر کہنی باغ میں آ گیا تھا لیکن محبت کسی رنگ میں بھی ہو وہ آخر محبت ہی ہوتی ہے اور اگر محبت بے غرض ہو تو وہ جدائی کا دکھ دے کر بھی محبت کرنے والے کی روح کو طاقت عطا کر جاتی ہے۔

میں آم کے درختوں سے جدا ہو کر ناشپاتی کے باغ میں آ گیا۔ رات کے اندھیرے اور ستاروں کی ٹھنڈی ہوئی دھندلی نیلی روشنی میں ناشپاتی کی بے برگ بار سیاہ شنیاں آسمان کی طرف شاخیں اٹھائے ساکت تھیں۔ مجھے ایک طرف۔ گیندے کی خوشبو آئی۔ گیندے کی خوشبو بہت لطیف ہوتی ہے۔ جس طرح میں پھو کو تلاش کر کے اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ اسی طرح پھول کی خوشبو بھی مجھے تلا کر کے میرے پاس پہنچ جاتی ہے۔ پھول خود چل کر میرے پاس نہیں آ سکتا لیکن اپنی خوشبو کو میرے پاس بھیج دیتا ہے۔ ایسی خوشبوئیں بھی میرے پاس پہنچ جاتی جن کے پھول مجھ سے ہزاروں میل دور کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی

بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ سارے کا سارا سفید اور روشن ہو گیا۔ اب اس پر آنکھ نہیں نہمڑتی تھی۔ اس نے میری روح، میرے جسم کے تاریک کونوں کو روشن کر دیا تھا۔ میں طلوع ہوتے سورج کی روشنی اور طاقت کو اپنی روح میں سینے وہاں سے واپس اپنے گھر آ گیا۔ اس وقت میں سورج نہیں تھا مگر سورج سے ہاتھ ملا کر آیا تھا اور سورج سے ہاتھ ملانے کے بعد میرا جسم اس طرح روشن ہو گیا تھا جیسے ایک چھوٹا سا سورج میرے اندر بھی طلوع ہو رہا ہو۔

”اے جنگل کے پھولو!

جو اپنے نازک چہرے سورج کی طرف موڑتے ہو
روشنی سے ابدی مسرت اور خوشبودار سانس حاصل
کرنے کے لئے

تم اپنی ارغوانی پوشاکوں کے لئے خدا کے شکر گزار ہو
تم میں سے کوئی بھی مکمل زندگی سے محروم نہیں رہتا
اور کوئی بھی اپنے حسن کو برباد نہیں کرتا

جنوبی سمندروں کی ہواؤں میں لہرانے والے
ناریل کے درختو!

سدا مسکراتے رہو“

اگر میں ناریل کا درخت ہوتا تو جنوبی سمندروں کی ہواؤں اور بارشوں میں
سدا مسکراتا رہتا لیکن میں ناریل کا درخت نہیں تھا۔ معمولی انسان تھا۔ تمام
کنزوریوں، تمام طاقتوں، تمام ثوابوں، تمام گناہوں والا انسان۔ دل میں ایک خیال
سورج بن کر طلوع ہوتا۔ ایک چکا چوند کر دینے والی روشنی پھیل جاتی اور دوسرے
لمحے تاریک گھٹائیں اُٹھ آتیں اور اندھیرا چھا جاتا۔

گھر میں جی نہیں لگتا تھا۔ شبانہ کے مکان کی طرف نگاہ جاتی تو دل بو جھل ہو
جاتا۔ کیا اب کبھی اپنی محبت کا معصوم چہرہ نہ دیکھ سکوں گا؟ میں نے فیصلہ کر لیا کہ
شبانہ سے ضرور ملوں گا۔ شبانہ کو اس کا خاوند بیاہ کر دلی لے گیا تھا۔ دلی میں اس کی
ملازمت تھی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح شبانہ کا دلی کا ایڈریس معلوم کر لیا۔ پاؤں
میں چکر تو پہلے ہی موجود تھا۔ ایک روز ٹرین میں بیٹھا اور دلی پہنچ گیا۔ اس سے پہلے
میں بھائی جان کے ساتھ دلی آ چکا تھا۔ ہم مشہور شاعر ن م راشد کے ہاں ٹھہرے
تھے۔ بھائی جان کی راشد صاحب سے دوستی تھی۔ راشد صاحب ان دنوں آل انڈیا
ریڈیو میں ڈائریکٹر پروگرام تھے۔ وہ علی پور روڈ پر ایک پرانی کوٹھی میں رہائش پذیر
تھے۔ میں ان دنوں آٹھویں یا نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کے بعد بھائی
جان بھی آل انڈیا ریڈیو دلی سے وابستہ ہو گئے اور تیس ہزاری کے کوائروں میں
رہنے لگے۔ جب دل میں شبانہ سے ملاقات کرنے کا خطرناک خیال لئے بلکہ ارادہ کئے
دلی پہنچا تو بھائی جان کی رہائش تیس ہزاری میں ہی تھی۔ میں سیدھا ان کے پاس چلا
گیا۔ انہوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ کیا میں گھر سے بھاگ کر آیا ہوں؟
میں نے جھوٹ بولا اور کہا۔

”نہیں۔ میں تو سب کو بتا کر آیا ہوں۔“

رات میں نے کسی نہ کسی طرح کافی اور اگلے دن شبانہ کے مکان کی طرف
چل پڑا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ میرے اس اقدام سے نہ صرف مجھے پولیس کے
حوالے کیا جا سکتا تھا بلکہ شبانہ کی زندگی بھی تباہ ہو سکتی تھی مگر میری آنکھوں پر خود
غرضی کے پردے گرے ہوئے تھے یا پردے پڑے ہوئے تھے یا اسے دیکھنے کا شوق
دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جو کام مجھے کسی حالت میں، کسی صورت میں نہیں کرنا
چاہئے تھا وہی کام کرنے کشاں کشاں چلا جا رہا تھا۔ دلی میں چاندنی چوک کے قریب
ایک سینما ہاؤس ہوتا تھا جس کا نام جگت ناکیز تھا۔ شبانہ اس سینما ہاؤس کے پیچھے اپنے

خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ مکان کا نمبر بھی میرے پاس لکھا ہوا موجود تھا۔ میں چاندنی چوک میں سے ہوتا ہوا بے دھڑک اس کے محلے میں داخل ہو گیا۔ ایک دکاندار سے مکان کا پوچھا۔ اس نے دو مکان چھوڑ کر ایک مکان کی دوسری منزل کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

”وہ اوپر والا کوارٹر ہے۔“

یہ کوئی الگ مکان نہیں تھا۔ اوپر نیچے دس بارہ کوارٹر ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ایک زینہ دوسری منزل کو جاتا تھا۔ دوسری منزل کا ایک کوارٹر شبانہ کے خاوند نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ میں بے دھڑک ہو کر زینہ چڑھ گیا۔ آج میں اس لمحے کا تصور کرتا ہوں تو سر پکڑ لیتا ہوں کہ یہ میں کیا حماقت کرنے والا تھا۔ زینہ ختم ہوا تو دوسری منزل پر آ گیا۔ یہاں ساتھ ساتھ بنے ہوئے کوارٹروں کے دروازے تھے۔ آگے تنگ راہداری تھی۔ کوارٹر کا نمبر مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اس خیال سے نہیں کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں۔ کہیں میں حوالات میں نہ بند کر دیا جاؤں یا یہ کہ کہیں شبانہ بدنام نہ ہو جائے بلکہ اس خیال سے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی کہ میں شبانہ کو شادی کے بعد پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے دہنوں والا لباس پہنا ہوا ہو گا۔ ایک کوارٹر کا دروازہ گذر گیا۔ دوسرے کوارٹر کا دروازہ گذر گیا۔ تیسرا کوارٹر شبانہ کا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی عقل سے کام نہ لیا اور دروازے کے سامنے آ گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ جیسے ہی میں نے اندر نگاہ ڈالی سامنے شبانہ دکھائی دی۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ اس وقت وہ کیا کر رہی تھی۔ اس کی شکل پوری یاد ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو ششدر ہو کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کا تحیر میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ میں کیا حماقت کر بیٹھا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت شبانہ کا خاوند وہاں نہیں تھا۔ شبانہ نے جھڑکنے کے انداز میں زور زور سے ہاتھ ہلا کر مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ میں فوراً واپس مڑا اور تیز تیز چلتا دھڑکتے سے اتر کر بازار میں آ گیا۔ میرا سانس اس طرح پھولا ہوا تھا جیسے میں دو میل کی دوڑ لگا کر آیا ہوں۔ اس وقت مجھ پر عجیب ملامت کا عالم طاری تھا۔ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ میں بڑی خطرناک غلطی کر بیٹھا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شبانہ کے خلاف دل میں غصہ بھی تھا کہ وہ تو شادی کر کے بڑے آرام سے بیٹھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی میرے بغیر سخت اداس ہوگی۔ اس

کے چہرے پر غم و اندوہ کے بادل چھائے ہوئے ہوں گے لیکن اس کا چہرہ مجھے پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آیا تھا۔ اس نے سرخی پاؤڈر بھی لگایا ہوا تھا۔

میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب شبانہ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ اگر وہ مجھے بھول گئی ہے تو میں بھی اسے بھلا دوں گا۔ اپنے دل سے اس کی یاد نکال دوں گا۔ میں غم زدہ دل لئے جگت ٹاکیڑ کے پہلو سے ہو کر چاندنی چوک میں آ گیا۔ یہاں سے ٹرام کار میں بیٹھا اور فتح پوری والی مسجد کے چوک میں اتر گیا۔ وہاں سے پیدل چل کر کشمیری دروازے آیا۔ کشمیری دروازے سے نکل کر علی پور روڈ پر ہو گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے سٹوڈیوز اور دفاتر اسی سڑک پر کافی آگے جا کر تھے۔ میں فٹ پاتھ پر اداس اداس چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر دونوں جانب نیم کے گھنے درخت تھے۔ خزان کا موسم تھا۔ ذرا ہوا چلتی تو درختوں پر سے نیم کے خشک پتے گرنے لگتے۔ کافی دور جانے کے بعد بائیں جانب ایک چھوٹی سی گلی مڑی تھی۔ یہاں آنے سامنے پرانی کوٹھیاں تھیں۔ ایک کوٹھی میں آل انڈیا ریڈیو کے سٹوڈیوز تھے۔ مجھے معلوم تھا بھائی جان اس وقت وہیں ہوں گے۔ ریڈیو سٹیشن کے صحن میں ریڈیو کی کنٹین تھی۔ دھڑک کے درخت کے نیچے لکڑی کی لمبی میز اور پرانی کرسیاں پڑی تھیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، چائے منگوائی۔ چائے پینے لگا۔ آنکھوں کے آگے شبانہ کا صحت مند اور سرخی پاؤڈر والا چہرہ آ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہونٹوں سے ایک سرو آہ نکل گئی۔

اس زمانے میں دلی ریڈیو کے ساتھ ن م راشد کے علاوہ اردو کے کئی دوسرے مشہور ادیب شاعر وابستہ تھے۔ ان میں راجہ مہدی علی خاں، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، مظفر ہاشمی بھی تھے۔ میں کنٹین سے اٹھ کر راشد صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔ بھائی جان سے ملنے کو اب دل نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے امرتسر جانے جا کر اپنی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کو کہیں گے اور میرا امرتسر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں دلی میں ہی رہ جانا چاہتا تھا۔ تاکہ جس فضا میں شبانہ سانس لے رہی ہے میں بھی اسی فضا میں سانس لیتا رہوں۔ ن م راشد صاحب کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ صوفہ لگا تھا۔ میں نے اندر جا کر سلام کیا اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ راشد صاحب کام میں مصروف تھے۔ عینک کے پیچھے سے آنکھیں جھپکا کر میری طرف دیکھا اور اپنی خاص شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ

”وہ مکان ہے۔“

احمد مجھے گلی میں ہی مل گیا۔ اسے دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنے سارے غم ہی بھول گیا۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے بشکریہ ہو کر ملے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ والدہ سے ملایا۔ اس کے والد گھر پر نہیں تھے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا مل کر کھایا۔ احمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بات ہے تم مجھے اداس اداس لگ رہے ہو؟“

احمد کو میری محبت کا علم نہیں تھا۔ میں نے امرتسر میں اس سے اپنی محبت کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اس وقت بھی اسے کچھ نہ بتایا۔ اپنی زبان پر شبنم کا نام نہ آنے دیا۔ یہی کہا۔ ویسے ہی اداس ہو گیا ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا۔

”چلو نظام الدین اولیا چلتے ہیں۔ وہاں قوالی سنیں گے۔“

احمد اور میں چٹلی قبر کی گلیوں سے نکل کر چوک میں آ گئے۔ پھر وہ مجھے لے کر ایک بازار میں چل پڑا۔ میں ان بازاروں سے ناواقف تھا۔ کافی دیر پیدل چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر ہم نظام الدین اولیا کی بستی میں جانے والے ٹانگے میں بیٹھ گئے۔ کہتے ہیں آج کل بستی نظام الدین اولیا دلی شہر کی آبادی کا حصہ بن گئی ہے۔ ان دنوں شہر اور بستی کے درمیان دیران اور بے آباد علاقہ ہوا کرتا تھا۔ درگاہ شریف پر پہنچ کر ہم نے وضو کیا۔ مزار پر دعائے فاتحہ پڑھی۔ ایک جانب ستونوں والے دالان میں قوالی ہو رہی تھی۔ ہم ایک طرف ہو کر بڑے ادب سے بیٹھ گئے اور قوالی سننے لگے۔ ایک نورانی اور روحانی فضا تھی۔ اگر بیویوں اور عطریات اور پھولوں کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ قوالی سنتے سنتے مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگا کہ احمد کیا کہے گا کہ میں رویوں رہا ہوں؟ حالانکہ اس فضا میں رقت کا طاری ہونا ایک سعادت تھی مگر مجھے یہی ڈر لگا تھا کہ کہیں احمد پر میری محبت کا راز نہ کھل جائے۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں اپنی محبوبہ کی جدائی میں رو رہا ہوں۔ میں کبھی سر نیچے کر لیتا۔ کبھی دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ اس وقت دل میں صرف ایک ہی خواہش باقی رہ گئی تھی کہ یہ قوالی اسی طرح ہوتی رہے اور میں روتا رہوں اور روتے روتے آنسوؤں میں بہہ جاؤں لیکن قوالی ختم ہو گئی۔ میری آنکھوں نے میرے آنسو بھی اپنے اندر سا

پنجابی میں پوچھا۔

”کیوں پهلوان؟ کیا بات ہے۔ چپ چپ سے کیوں ہو؟“

میں بچپن اور لڑکپن میں ذرا موٹا ہوا کرتا تھا۔ راشد صاحب مجھے پهلوان کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں راشد صاحب۔“

”گھریا د آ رہا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں، بالکل نہیں۔“

راشد صاحب مسکرائے اور اپنے کام میں لگ گئے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا شبنم کو یاد کرتا رہا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ میرا کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ اصل میں وہاں میرا کوئی نغمسار، میرا ہم عمر نہیں تھا۔ اچانک مجھے احمد کا خیال آ گیا۔ احمد امرتسر میں میرا دوست بنا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ دلی سے امرتسر آیا تھا اور ہمارے محلے میں آ کر رہا تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ وہ نماز پڑھنے کے لئے بوڑ والی مسجد میں جایا کرتا تھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس طرح ہم آپس میں بڑی جلدی ایک دوسرے کے کمرے دوست بن گئے تھے۔ دلی جاتے ہوئے اس نے مجھے اپنے گھر کا پورا پورا پتہ زبانی یاد کرا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

”بس دلی کے محلے چٹلی قبر میں آ کر کسی سے محمد خاں پٹے باز کا نام پوچھ

لیا۔“

محمد خان میرے دوست احمد کے والد کا نام تھا۔ راشد صاحب کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے سوچا کہ اپنے دوست احمد کے پاس چلنا چاہئے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ چٹلی قبر کا محلہ کہاں ہے۔ چائے کی کنٹین میں کام کرنے والے ایک لڑکے سے پوچھا تو اس نے کہا۔

”جامع مسجد کے چوک میں چلے جاؤ۔ چٹلی قبر قریب ہی ہے۔“

میں جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ کشمیری دروازے کے باہر قدیم گارڈن کے قریب جامع مسجد کو جاتا ایک سواریوں والا ٹانگہ مل گیا۔ اس میں بیٹھ کر میں جامع مسجد کے چوک میں پہنچ گیا۔ وہاں سے پوچھتا پوچھتا چٹلی قبر کی گلیوں میں نکل آیا۔ ایک پان والے کی دکان سے محمد خان پٹے باز کا پوچھا تو اس نے گلی کے کونے والے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ہوا کرتے تھے۔ میں نے بہی کا تھڑا کلاس کا ٹکٹ خرید کر رکھ لیا اور پلیٹ فارم پر آ کر ادھر ادھر ٹھلنے لگا۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ میرا خیال ہے گیارہ بارہ روپے کا ٹکٹ آیا تھا۔ اب مجھ پر ایک بار پھر آوارہ گردی کی دھن سوار ہو چکی تھی۔ اس بار دل میں یہ طے کر کے جا رہا تھا کہ واپس نہیں آؤں گا۔ بہی میں ہی رہوں گا۔ کہیں کوئی چھوٹا موٹا کام تلاش کر لوں گا۔ جب شبانہ امرتسر میں نہیں رہی تو میں امرتسر میں رہ کر کیا کروں گا۔ ٹرین آئی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین بہی کی طرف روانہ ہو گئی۔

پہلی بار گھر سے بھاگ کر بہی آیا تھا تو بوری بند کے ریلوے سٹیشن پر اترا تھا۔ اس دفعہ گاڑی نے مجھے بیٹے سنزل کے ٹرمنل سٹیشن پر اتارا۔ یہ بہی کا دوسرا برا سٹیشن تھا۔ اس وقت دن نکل آیا تھا۔ بہی میں امرتسر والی سردی نہیں تھی۔ بڑا خوشگوار موسم تھا۔ میرے پاس تھوڑے سے پیسوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بیٹے سنزل کے آگے سے جو سڑک گذرتی تھی اس کا نام لیمنگٹن روڈ تھا۔ میں سٹیشن سے نکل کر اس سڑک پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ سوچنے لگا کس طرف جاؤں؟ مجھے کام مل سکے گا؟ میں بھی دوسرے لڑکوں کی طرح فلمیں بہت دیکھا کرتا تھا۔ بعض ایکٹرائیڈز میں مجھے بہت پسند تھیں۔ دل و جان سے اچھی لگتی تھیں۔ میں نے دل میں کہا چلو نسیم بانو کے ہاں چلتے ہیں۔ وہ مجھے ضرور کہیں نہ کہیں کام دلا دے گی۔ سٹیشن کے احاطے میں ایک جانب بہت سی وکٹوریہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ گھیاں تھیں اور بہی شہر میں آنگوں کی جگہ چلتی تھیں۔ میں نے ایک وکٹوریہ والے سے کہا۔

”مس نسیم بانو کا گھر معلوم ہے کہاں ہے؟ مجھے اس کے گھر لے چلو۔“

لبی ترکی ٹوپی والے وکٹوریہ بان نے کہا۔

”دو روپے لوں گا۔“

میں وکٹوریہ میں بیٹھ گیا۔ وکٹوریہ گاڑی بہی کے بازاروں میں چل پڑی۔ کتنی ہی بازار آئے اور گذر گئے۔ میں نے وکٹوریہ بان سے پوچھا۔

”ابھی مس نسیم کا گھر کتنی دور ہے؟“

وہ بولا۔

”بس اب پہنچے ہی والے ہیں بابو۔“

سراب مودی کی فلم پکار نئی نئی ریلیز ہوئی تھی۔ مس نسیم بانو اس فلم کی

لئے۔ رقت کا لمحہ مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ میرے اور میری رقت کے درمیان ایک بار پھر دنیا حائل ہو گئی تھی۔ احمد نے کہا۔

”چلو غالب کی قبر پر چل کر فاتحہ پڑھتے ہیں۔“

مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ غالب اردو کا شاعر تھا۔ احمد کو بھی بس اتنا ہی معلوم تھا۔ ہم درگاہ شریف کے پہلو والے دروازے سے نکل کر درگاہ کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے قبرستان کی ڈیوڑھی میں آ گئے۔ آگے ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ اونچی نیچی کچی کچی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ احمد نے ایک کچی قبر کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ غالب کی قبر ہے۔“

چھوٹی سی قبر تھی۔ کچی تھی۔ پیچھے سنگ مرمر کا کتبہ لگا تھا جس پر ایک شعر درج تھا جس میں ہاتف کا نام آتا تھا۔ میں نے احمد سے پوچھا۔

”ہاتف کے کیا معنی ہیں؟“

وہ بولا۔

”مجھے بھی نہیں پتہ۔ اردو کے ماثر سے پوچھ کر بتاؤں گا۔“

ہم نے فاتحہ پڑھی۔ مجھے فاتحہ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ یونہی احمد کے ساتھ میں نے بھی ہاتھ پھیلا دیئے۔ احمد نمازی لڑا تھا۔ اسے فاتحہ پڑھنا آتا تھا۔ ہم ننگے پاؤں تھے۔ واپسی پر قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میرے پیر میں کانٹا چبھ گیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ احمد نے بڑی مشکل سے میرا کانٹا نکالا۔ اس کے بعد ہم شہر واپس آ گئے۔ احمد نے مجھے دلی کی خوب سیر کرائی۔ شام ہو رہی تھی جب میں تمیں ہزاری اپنے کوارٹر میں واپس آیا۔ بھائی جان سخت غصے میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”خبردار اگر اب یہاں سے قدم باہر نکالا۔ صبح پہلی گاڑی پر تمہیں واپس امرتسر بھیج رہا ہوں۔“

وہ دوسرے کمرے میں گئے۔ میں کوارٹر سے نکلا اور سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ ایک قلی سے پوچھا۔

”بہی جانے والی گاڑی کس وقت روانہ ہوگی۔“

یہ کوئی ایکسپریس گاڑی تھی۔ میں امرتسر سے آتی دفعہ اپنے ساتھ کچھ پیسے لیتا آیا تھا۔ میں نے انہیں گنا۔ کوئی بیس ایکس روپے تھے۔ یہ اس زمانے میں بہت

فلوں میں کام دلایا ہے۔ وہ میری واقف ہے۔ تمہیں بھی کام دلا دے گی۔“
میں نے سوچا کہیں کام تو ملے گا۔ مجھے تو ہمیں میں رہنے کے لئے تھوڑا بہت کام چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔

”چلو مجھے لکشی بائی کے ہاں لے چلو۔“

مجھے کچھ معلوم نہیں وہ ہمیں کے کون کون سے علاقے میں سے ہوتا ہوا ایک بازار میں مجھے لے آیا۔ بازار کی دونوں جانب پرانی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک عمارت کے دو کمروں کے فلیٹ میں لکشی بائی رہتی تھی۔ وکٹوریہ والا مجھے اس کے پاس لے گیا۔ وہ کمرے کے آگے موڑھے پر بیٹھی سرگینٹ پی رہی تھی۔ وکٹوریہ والے سے ہنس کر ملی اس سے حال چال پوچھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اس لڑکے کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟“

وکٹوریہ والا بولا۔

”بائی جی بس آپ کی تھوڑی سی نظر ہو جائے تو اس لڑکے کی بھی قسمت جاگ اٹھے گی۔ پنجاب سے آیا ہے ہیرو بننا چاہتا ہے۔“

لکشی بائی کی عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ بالوں میں خضاب لگا ہوا تھا۔ مریشیوں کی طرح اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

”واوا ابھی تو یہ ہیرو کا بیٹا ہی بن سکتا ہے۔ تم لائے ہو تو میں اس کا کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ کل اسے لے کر پرکاش سٹوڈیوز میں آ جانا۔ دن کو ڈانس کی شوٹنگ ہے۔“

میں بڑا خوش ہوا کہ چلو اسی زمانے کی شوٹنگ بھی دیکھوں گا۔ وکٹوریہ والا جس کا نام بھی احمد تھا مجھے لے کر باہر آ گیا۔ کہنے لگا۔

”سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔ اب رات کہاں گزارو گے؟“

میں نے کہا۔

”شیشن پر سو جاؤں گا۔“

بچپن کی آوارہ گردیوں میں مجھے ریلوے شیشنوں کے خالی پنجوں پر سونے کی بڑی عادت ہو گئی تھی۔ آج بھی کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ لاہور، پنڈی یا کسی ”کمرے“ شہر کے ریلوے شیشن پر جا کر خالی بیچ پر سو کر رات بسر کروں۔ اس میں مجھے ”ایڈونچر“ محسوس ہوتا ہے۔ بہر حال جب احمد کو معلوم ہوا کہ میرے پاس رات بسر

ہیروئن تھی اور اس نے نور جہاں کا رول ادا کیا تھا۔ وکٹوریہ بان راستے میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

”کیا مس نسیم بانو تمہیں جانتی ہیں؟“

میں نے کہا۔

”ہاں ہاں، بہت اچھی طرح جانتی ہے، تم چلو۔“

سمندر کے کنارے چوپانی پر میرن ڈرائیو کا جو علاقہ تھا۔ وہاں نسیم بانو کسی فلیٹ میں رہتی تھی۔ وکٹوریہ ایک فلیٹ کے سامنے گرین ہیلٹ کے پاس رک گئی۔

”یہ نسیم بانو کا فلیٹ ہے۔“

میں نے اسے کہا۔

”یہاں ٹھہرو۔“

اور میں وکٹوریہ سے نکل کر فلیٹ کے برآمدے میں آ گیا۔ یہ پہلی منزل کا فلیٹ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ برآمدے میں ایک جانب نسیم بانو کی کچھ تصویریں دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ایک چوکیدار سٹول پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے مس نسیم کا پوچھا تو وہ بولا۔

”وہ دلی گئی ہوئی ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”وہ کب واپس آئیں گی؟“

چوکیدار نے کہا۔

”جاؤ جاؤ لڑکے مجھے کچھ معلوم نہیں کب آئیں گی۔“

میں واپس وکٹوریہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ میرے مایوس چہرے کو دیکھ کر وکٹوریہ والے نے پوچھا۔

”کیوں بابو! کیا ہوا؟“

میں نے اسے بتایا کہ مس نسیم دلی گئی ہوئی ہیں۔ وکٹوریہ والا سمجھا کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا شوق بھی کھینچ لایا ہے۔ اس زمانے میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے اکثر لڑکے فلموں میں ہیرو بننے کے شوق میں گھروں سے بھاگ کر ہمیں آ جایا کرتے تھے۔ وکٹوریہ والا کہنے لگا۔

”بابو میں تمہیں لکشی بائی کے پاس لئے چلتا ہوں۔ اس نے بڑے لڑکوں کو

کرو۔“

وہ بولی۔

”فکر کی بات نہیں۔ بات ذمے داری کی ہے۔ یہ میرے گھر میں چواری کر کے بھاگ گیا تو میں رقم تم سے وصول کروں گی۔“
احمد نے ہنستے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
”میں ذمے دار ہوں۔ میں بھروں گا رقم۔“

گوالیار کے رہنے والے اس وکٹوریہ بان کو میں کبھی نہیں بھول سکا۔ اس کا رنگ گمراہ سا نولا تھا در چہرے پر چمک کے داغ تھے لیکن اس وقت جب وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر میری ذمے داری قبول کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا تو مجھے وہ کوئی آسمان کا فرشتہ لگ رہا تھا۔ وہ مجھے جانتا تک نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ میں لکشی بائی کے اصلی نقلی زیور یا نقدی چرا کر بھاگ جاتا مگر وہ میری حامی بھر رہا تھا۔ میری ضمانت دے رہا تھا۔ دنیا داری کا یہ رویہ نہیں ہوتا۔ اس کی روح اس کے جسم میں بیٹھی اسے کسی اور ہی راستے پر چلا رہی تھی۔ یہ وہ راستہ تھا جس پر چل کر آدمی دوسروں کو خوشیاں دیتا ہے اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ راستہ جنت کو جاتا ہے یا دوزخ کو جاتا ہے۔ یہ مجھے نہ اس وقت معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے۔

لکشی بائی نے مجھے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ وہ کئی فلم کمپنیوں میں ایکسٹرا لڑکیوں کو ڈانس سکھاتی تھی۔ میرا کام ان تارینوں کو کاپی پر لکھ لینا اور اسے وقت سے پہلے یاد کرا دینا تھا۔ جن تارینوں میں اسے ڈانس کی ریسرسل یا شوٹنگ پر جانا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ لکشی بائی کے لئے بازار سے سبزی لانا، اس کی ساڑھیوں کو استری کرنا بھی میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔ رات کو میں وہیں کھولی کے کونے میں باریک تیلیوں والی صف پر سو جاتا تھا۔

لکشی بائی کے ساتھ مجھے فلم سٹوڈیوز میں جا کر ڈانس کی شوٹنگ اور ہیرو ہیروئنوں کو دیکھنے کا موقع ملتا۔ اس زمانے میں رنجیت مووی ٹون کا سٹوڈیو، پرکاش سٹوڈیوز، ڈائریکٹر محبوب کا سنٹرل سٹوڈیو اور سراب مووی کا منروا مووی ٹون کا سٹوڈیو بڑا مشہور تھا۔ کبھی کبھی وکٹوریہ والا احمد مجھ سے ملنے اور خیر خیریت دریافت کرنے آ جاتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ میرا جی بڑا لگ گیا تھا۔ شبانہ کی یاد بھی کبھی

کرنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے تو سوچ میں پڑ گیا۔

”اچھا کوئی بات نہیں تم بیٹھو۔ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔“

وکٹوریہ ایک بار پھر بمبئی کے بازاروں میں چل پڑی۔ ایک دو باتیں مجھے ان بازاروں کی اب بھی یاد ہیں۔ وکٹوریہ بازار میں جس کسی ایرانی ہوٹل کے سامنے سے گذرتی تو چائے کی خوشبو ضرور آتی تھی۔ یہ خوشبو مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ اس زمانے میں عام سگرنوں میں پیلا ہاتھی اور چار میتار سگریٹ بہت چلتا تھا۔ احمد چار میتار سگریٹ پیتا تھا۔ یہ دونوں سگریٹ بڑے سستے ہوتے تھے۔ میرے پاس ہلیروز کا پیکٹ دیکھ کر وکٹوریہ والے احمد نے بڑے تعجب سے کہا تھا کہ تم اتنے مہنگے سگریٹ کہاں سے لے کر پیتے ہو؟ احمد گوالیار کا رہنے والا تھا۔ بمبئی کی گنجان آبادی والے ایک محلے میں اس کی بڑی بہن کا گھر تھا۔ وہ مجھے اس کے گھر لے گیا۔ اس کی بہن کا نام میں بھول گیا ہوں۔ بڑی شفیق خاتون تھی۔ اس نے مجھے کچھڑی پکا کر کھلائی تھی۔ احمد نے اسے یہ کہا یہ لڑکا ایکٹر بننے گھر سے بھاگ کر بمبئی آ گیا ہے۔ میں اسے ایک دو دن میں کسی فلم میں کام دلا دوں گا۔ اتنے دن یہ یہیں رہے گا۔ رات میں بنے اگر شفیق خاتون کی چالی میں باہر راہ داری میں لیٹ کر بسر کی۔ دوسرے دن احمد وکٹوریہ لے کر آ گیا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر تیار بیٹھا تھا۔ ہم پرکاش سٹوڈیوز کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سٹوڈیوز بمبئی کے علاقے اندھیری میں واقع تھا۔ وہاں کسی سنٹ فلم کے کورس ڈانس کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ مجھے یاد ہے اس فلم کی ہیروئن پر میلا تھی۔ ان دنوں دوسرے درجے کی ہیروئن ہوا کرتی تھی اور ہیرو بچے انت تھا جو سنٹ فلموں کا بڑا نامور ہیرو ہوتا تھا اور امجد خان کا والد تھا۔ کسی راجہ کے دربار کا سیٹ تھا۔ کافی رونق تھی۔ لکشی بائی ایک طرف کرسی پر ڈانس کرنے والی لڑکیوں کے درمیان بیٹھی انہیں ہاتھ ادھر ادھر ہلا کر ڈانس کے گر سمجھا رہی تھی۔ جب وہ ذ فارغ ہوئی تو احمد اور میں اس کے پاس گئے۔ وہ پان کھا رہی تھی۔ انگلیوں سے سگریٹ سلگ رہا تھا۔ مجھے غور سے دیکھا اور احمد سے کہنے لگی۔

”احمد بھائی! میں اس کو اپنے پاس ملازم تو رکھ لیتی ہوں مگر کل کلاں کو ہرج مرج ہو گیا تو تم ذمے دار ہو گے۔ کیا کہتے ہو؟“

احمد بولا۔

”بائی جی! لڑکا بڑا شریف ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ تم کوئی فکر ہی

کبھی آتی تھی۔ اپریل کا مہینہ تھا کہ لکشی بائی کو کسی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ پر جانا پڑ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہمیں سے پچاس ساٹھ میل دور جنگل کے نیم پہاڑی علاقے میں آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ فلم کا سارا عملہ بہرو بہرون اور ڈانس کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ لوکیشن پر پہنچ گیا۔ بڑا خوبصورت جنگل کا علاقہ تھا۔ ایک طرف سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ ان کی دادی میں ایک جگہ ڈانس کے لئے سیٹ لگا ہوا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں پہلے سے چھ سات خیمے بھی لگا دیئے گئے۔ یونٹ کو یہاں تین چار دن رہنا تھا اور دو گانے پکڑا کر لے کر رہنا تھے۔

اس پر فضا پہاڑی علاقے میں آکر میں اس طرح خوش تھا جیسے میں اپنے گھر میں آ گیا تھا۔ ذرا فرصت ملتی تو میں ادھر ادھر جنگل میں گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ یہاں بڑے اونچے اونچے ٹاور، ناریل اور اہلی کے درخت تھے۔ کہیں کہیں پہاڑی ٹالے بھی تھے جن میں چاندی ایسا شفاف پانی چھوٹے بڑے پتھروں سے نکل کر بہ رہا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں گھومتا پھرتا جنگل میں دوسری پہاڑی کی طرف نکل گیا۔ یہاں آتے ہی ایک دم جیسے منظر بالکل ہی بدل گیا ہو۔ پھولوں والی جنگلی بیلین جگہ جگہ درختوں پر جمبول رہی تھیں۔ بھورے رنگ کی بڑی بڑی چٹانوں کی سٹیلین زمین سے نکل کر آڑھی ترچھی کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان چشمہ بہ رہا تھا۔ سامنے دو چٹانوں کے درمیان چھوٹی سی آبشار کا پانی گر رہا تھا۔ جنگلی پھولدار بیلین چٹانوں کے اوپر تک چلی گئی تھیں۔ ایک طرف جنگلی کیلوں کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دوسری جانب گل مر کے سرخ پھولوں والے درختوں کے درمیان ایک پتلی سی پگڈنڈی چلی جا رہی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے یہ پگڈنڈی جنت کی طرف جاتی ہے۔ میں بے اختیار ہو کر اس پگڈنڈی پر چل پڑا۔ تھوڑا آگے جا کر چڑھائی شروع ہو گئی۔ پتھروں کو جوڑ کر وہاں خدا جانے کس نے سیڑھیاں سی بنا دی تھیں۔ لگتا تھا اوپر کسی کا گھر ہے۔

گل مر کے سرخ پھولوں والے درخت یا پودے پگڈنڈی کی دونوں جانب میرے ساتھ ساتھ اوپر جا رہے تھے۔

دن کا وقت تھا۔ نیلا آسمان بالکل صاف تھا۔ چمکی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ چڑھائی چڑھ کر میں اوپر گیا تو دیکھا کہ ایک کھلی سرسبز جگہ پر آ گیا ہوں۔ ایک طرف کیلے کے درختوں کی دیوار تھی۔ سامنے کی جانب تین مخروطی چٹانیں سینہ تانے کھڑی

تھیں۔ ان کے درمیان ایک تنگ سا راستہ تھا۔ جو چٹانوں کے دوسری طرف جاتا تھا۔ دائیں جانب والی چٹان کے شکاف میں سے جیسے کا پانی نکل کر سرسبز قطعے کے وسط سے ہوتا ہوا نیچے آبشار بن کر گر رہا تھا۔ میں اصل میں اس پہاڑی کے اوپر آ گیا تھا جس کی ڈھلان پر چٹانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور جن کے درمیان سے ہو کر گرنے والی آبشار کو میں نے نیچے کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ چشمہ ایک ٹالے کی شکل میں بہ رہا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ میں نے ایک گھونٹ پیا۔ پانی میٹھا بھی تھا۔ میں نے خوش ہو کر چہرے پر پانی کا چھینٹا مارا۔ میرا چہرہ گرم ہو گیا۔ درختوں کے اوپر سے کوئی چڑیا بولتی ہوئی گذر گئی۔ میں اس تنگ راستے کی طرف چل پڑا جو دو اونچی بلند زمرد کی طرح سرسبز چٹانوں کے درمیان سے ہو کر دوسری طرف جاتا تھا۔ میں دوسری طرف آیا تو میری آنکھوں کے سامنے اس جنگل کا سب سے حسین منظر تھا۔ ہری گھاس کا ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ کناروں پر کیلے کے درختوں کے جھنڈ ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان میں زرد پھولوں کی کیاری تھی۔ درمیان میں ایک گھٹا درخت تھا جس پر کاسی اور سفید پھولوں کی بیلین لٹک رہی تھیں۔ درخت کے نیچے مٹی کا گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ سامنے بانس کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کی آدھی دیوار اور بانس کی ڈھلوان چھت زرد پھولدار بیلوں میں چھپی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا جھونپڑی کے قریب آیا۔ جھونپڑی کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ٹاٹ کا پردہ تھا جسے اٹھا کر چھت پر ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے جھک کر جھونپڑی کے اندر دیکھا۔ چمکیلے دن کی دھوپ میں مجھے جھونپڑی کے اندر سوکھے گھاس کا فرش دکھائی دیا۔ فرش کے وسط میں کیلے کے چوڑے پتوں کو جوڑ کر ایک تھال سا بنا دیا گیا تھا جس میں گیندے کے زرد پھولوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ بانس کی دیوار کے ساتھ پانی کی صراحی رکھی ہوئی تھی۔ صراحی کے اوپر مٹی کا آنخورہ لٹا پڑا تھا۔ میں نے سوچا۔ یہاں ضرور کوئی سادھو جوگی رہتا ہو گا۔ میں وہاں سے ایک طرف ہٹ گیا۔ جھونپڑی کے نیلے پھولوں کے پہلو میں ایک پتلی سی پگڈنڈی ترناری کے نیلے پھولوں کی جھاڑیوں کے درمیان سے گذرتی تھی۔ یہاں اوپر بڑے تادر اور گھنے درخت تھے۔ فضا میں سبزے اور پھولوں کی مکھ رہی ہوئی تھی۔ میں ترناری کے نیلے پھولوں والی جھاڑیوں کے درمیان آہستہ آہستہ چلتا ڈرا آگے گیا تو مجھے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ ایک آدمی دوسرے کو کہہ رہا تھا۔

ایسا جلال و جمال والا چہرہ پہلے کسی عورت کا نہیں دیکھا تھا۔ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر آکر وہ رک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک شیریں تبسم تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ عورت ہے جس کو وہ دونوں آدمی اغوا کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اس عورت کے پر شکوہ حسن اور گہرے خاموش تبسم نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا مگر میں اسے پہچان بھی چاہتا تھا۔ اتنے میں اس پر اسرار عورت نے بڑی شیریں اور پر سکون آواز میں مجھ سے پوچھا۔

”تم کون ہو؟“

میں نے جلدی سے کہا۔

”کیا تم اوپر والی جھونپڑی میں رہتی ہو؟“

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی ابھی میں نے دو آدمیوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ اسے اغوا کرنے آئے ہیں اور اس کے انتظار میں اوپر اس کی جھونپڑی کے پاس چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک کے پاس دو ٹالی بندوق بھی ہے۔

اس عورت نے پر سکون انداز میں میری ساری بات سنی۔ اس کے چہرے پر جو گہرا اور موہوم سا تبسم تھا۔ اس میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک گہرا سانس لیا اور واپس مڑ گئی۔ جب وہ ان اونچی جھاڑیوں کے پاس پہنچی جہاں سے میں نے اسے باہر آتے دیکھا تھا تو رک گئی۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور جھاڑیوں میں چلی گئی۔ میں بھی تیز تیز چلتا ہوا جھاڑیوں میں اتر گیا۔ جھاڑیوں میں تھوڑی سی اترائی تھی۔ آگے زمین ہموار ہو گئی تھی مگر یہاں اتنا جنگلی جھاڑ جھنکاڑا ہوا تھا کہ پگڈنڈی ان میں چھپ گئی تھی۔ زرد پوش پر اسرار عورت مجھ سے دو قدم آگے چل رہی تھی۔ اس کے لباس میں سے ایک عجیب سی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ آگے چھ سات اونچی چٹائیں آگئیں جو ایک دوسری کے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ ان پر سیاہ کائی جی ہوئی تھی۔ زرد پوش عورت ان چٹانوں کے پیچھے آگئی۔ میں اس کے حکم کے مطابق پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

چٹانوں کے عقب میں جاتے ہی میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ قدرت نے یہاں جنگلی حسن کے زرد جواہر لٹائے ہوئے تھے۔ عجیب رنگوں کے پھول دھوپ میں چمک

”آخر کہاں گئی ہوگی؟“

دوسرے آدمی کی آواز آئی۔

”اوپر جھونپڑی کے پاس چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آئے گی تو وہیں دیوچ لیں گے۔“

میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ ضرور یہ کوئی چور ڈاکو ہیں۔ میں جلدی سے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ پگڈنڈی دو قدم آگے جا کر دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ دونوں آدمی وہاں نمودار ہوئے اور باتیں کرتے میری طرف بڑھے۔ ان کا لباس اس علاقے کے دیہاتیوں جیسا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان میں سے ایک آدمی کے کندھے پر دو ٹالی بندوق لٹک رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے ان جھاڑیوں کے قریب سے گذر گئے جن کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ ادھر کسی عورت کو اٹھانے آئے ہیں۔ ان کی باتوں کے مطابق وہ عورت اس جھونپڑی میں ہی رہتی تھی جو میں دیکھ کر آ رہا تھا اور جو خالی پڑی تھی۔

جب یہ دونوں آدمی پگڈنڈی پر سے گذر کر چٹانوں کے پیچھے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں آہستہ سے جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ اب میں جھونپڑی کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا کہ وہ دونوں آدمی جو خونی ڈاکو ہیں، جھونپڑی کے قریب ہی کسی جگہ چھپ کر بیٹھے ہوں گے۔ میں ادھر گیا تو وہ مجھے پکڑ لیں گے۔ چنانچہ میں واپس جانے کی بجائے پگڈنڈی پر آگے چلنے لگا۔ پگڈنڈی بائیں جانب مڑ گئی۔ میں بھی اس طرف مڑ گیا۔ یہاں دونوں جانب اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ میں چند قدم چلا ہوں گا کہ اچانک میں نے ایک عورت کو دیکھا جو جھاڑیوں میں سے نکل کر پگڈنڈی پر آئی تھی۔ اس نے زرد رنگ کی سادہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سیاہ بال شٹنوں پر کھلے تھے۔ ایک ہاتھ میں منزل تھا۔ دوسرے ہاتھ میں کسی جنگلی پھولوں کی شاخ تھی۔ وہ بڑے سکون سے قدم رکھتی چلی آ رہی تھی۔ میں پگڈنڈی کے درمیان میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھتی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چلی رہی تھی۔ درختوں میں سے دھوپ چھن چھن کر اس کے زرد لباس پر پڑ رہی تھی۔ زرد لباس میں سے زرد روشنی نکل کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس کا چہرہ گیندے کے پھول کی طرح دمک رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے ایسے لگتا تھا جیسے سورج نے اس کا منہ چوم کر اسے ہمیشہ کے لئے سنہری کر دیا ہے۔ میں -

خوبصورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی مگر اس کے حسن میں ایک ملکوتی احساس تھا۔ لگتا تھا روشنی کا غبار اس کے ساتھ چل کر وہاں تک آیا ہے اور اب اس زرد پوش عورت کے ارد گرد اس روشنی نے اک ہالہ بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ صرف میری آنکھوں کو ہی نظر آ رہا ہو۔ حقیقت میں ایسا نہ ہو لیکن مجھے جو کچھ بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ اس قدر پاکیزہ، شفاف اور نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا کہ مجھے اپنا جسم لطیف ہو کر زمین سے بلند ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے سکول کی کتابوں میں کپل دستو کے شہزادے گوتم بدھ کی کہانی پڑھی تھی۔ اس کتاب میں گوتم بدھ کی ایک تصویر بھی تھی۔ کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ گوتم بدھ کے ماننے والے بھکشو اور بھکشو عورتیں زرد کپڑے پہنتی ہیں اور یہ لوگ اپنا سر منڈا دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ عورت بھی گوتم بدھ کی ماننے والی ہے مگر مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ اس نے اپنا سر نہیں منڈوایا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس جنگل میں اکیلی کیوں رہ رہی ہے اور وہ لوگ کون تھے جو اس کو اغوا کرنے آئے تھے؟ ابھی یہ سارے سوال میرے ذہن میں ہی تھے کہ وہ عورت بڑے میٹھے لہجے میں کہنے لگی۔

”میرا نام چندر کمپی ہے۔ میں کیسرواڑی گاؤں کے سب سے بڑے پجاری کی بیٹی ہوں۔ ہم لوگ چار ویدوں اور اپنشدوں کے ماننے والے بڑے سخت برہمن ہیں۔ بچپن ہی سے مجھے دیوی دیوتاؤں کی پوجا ناپسند تھی۔ میرا پجاری باپ مجھ سے دیوی دیوتاؤں کی آرتی اتروانا تو میں سوچتی کہ یہ پھر کے بت انسان کو کیا دے سکتے ہیں۔ یہ تو خود بے جان ہیں۔ میں جوان ہوئی تو میرے باپ نے مجھے ہندی اور سنسکرت پڑھائی۔ دید کے اشلوک یاد کرائے۔ ایک بار میں نے گوتم بدھ کی پوجا ہوتے دیکھی۔ مجھے گوتم بدھ کا پرسکون چہرہ بڑا اچھا لگا۔ پھر میں نے اس کی زندگی کے حالات پڑھے اور میں نے یہ بھی پڑھا کہ گوتم بدھ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف تھا اور وہ صرف ایک خدا کو مانتا تھا اور اسی کی پرستش کرتا تھا۔ اسی دن سے میں گوتم بدھ کی محکشی بن گئی لیکن میں نے اپنے دل کا بھید کسی پر ظاہر نہ کیا۔ میرے باپ نے ایک برہمن پجاری سے میری شادی کر دی۔ ایک برس گزرا ہو گا کہ میرا خاوند نیاری کی وجہ سے مر گیا۔ ہمارے گاؤں کے برہمنوں میں اس عورت کو ستی کر دیا جاتا

رہے تھے۔ چاروں طرف اونچی اونچی چٹانیں تھیں جو زرد سفید اور کاسنی رنگ کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ان چٹانوں پر سے پھولوں کی آبیاریں گر رہی ہیں۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں سفید اور گلابی کنول کے پھول کھلے تھے۔ جنگل میں میں نے ایسا حسین منظر شاید ہی دیکھا ہو۔ لگتا تھا جنت کا ایک ٹکڑا آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے۔ ایک طرف مولری کا پیڑ تھا جس کے نیچے چھوٹے چھوٹے مولری کے سفید پھولوں کی چادر سی بچھی ہوئی تھی۔ ہوا خوشبوؤں کے سانس لے رہی تھی۔

زرد پوش عورت مولری کے درخت کے پاس جا کر رک گئی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ہری ہری نرم گھاس پر چلتا اس کے پاس آیا تو وہ پھولدار بیلوں سے ڈھکی ہوئی اونچی اونچی جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھی۔ ان جھاڑیوں میں دو قدم چلنے کے بعد چٹان کے اندر بنے ہوئے قدرتی غار کا دہانہ نمودار ہوا۔ یہ غار کا منہ تھا جو جنگلی گھاس میں آدھے سے زیادہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

”تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں“

”اندر آ جاؤ۔“

وہ غار میں داخل ہو گئی۔ غار کی چھت میرے سر سے کوئی تین چار فٹ اونچی تھی۔ وہ اتنی کشادہ تھی کہ چار آدمی ساتھ لگ کر چل سکتے تھے۔ میں نے جنگلوں میں بڑے قدرتی غار دیکھے تھے۔ ان میں جالے لٹک رہے ہوتے تھے مگر یہ غار صاف تھا۔ کچھ دور تک غار کے دہانے پر سے سورج کی روشنی ہمارے ساتھ آئی۔ پھر اندھیرا ہو گیا۔ میں رک گیا۔ مجھے زرد پوش عورت کا ہیولا سا ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ جھک کر بائیں جانب مڑ گئی۔ مجھے ماچس کی تیلی جلانے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی روشنی ہو گئی۔ میں نے دیکھا وہ جھک کر مٹی کا چراغ جلا رہی تھی۔ چراغ کی روشنی ہو گئی۔ یہ ایک اونچی چھت والا کھوہ یا شکاف تھا۔ زمین پر ہرن کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ زرد پوش عورت نے اپنا کمرنڈل اور پھولوں والی شاخ جو اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایک طرف رکھ دی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ چراغ کی نرم روشنی میں اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی

گوتم بدھ نے اس رسم کو ظلم کہا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے میں اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ نہیں جلوں گی۔ ستی ہونے والی عورت کو رسم کے مطابق ایک الگ کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جس روز اسے ستی ہونا ہوتا ہے اس کے بدن پر کیسرا لایا جاتا ہے۔ پجاری لڑکیاں اس کے سامنے بیٹھ کر اشلوک گاتی ہیں۔ پھر آدمی رات کے بعد وہ چلی جاتی ہیں۔ مجھے سورج نکلنے سے پہلے ستی ہونا تھا۔ میرے خاوند کی لاش میری کوٹھڑی میں میرے آگے زمیں پر پڑی تھی۔ سب لوگ مجھے کوٹھڑی میں بند کر کے چلے گئے۔ میری ایک راز دار سیہلی تھی جس کا نام موہنی تھا، میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں ستی نہیں ہوں گی اور آدمی رات کے بعد کوٹھڑی سے بھاگ جاؤں گی۔ موہنی نے میرا ساتھ دیا۔ آدمی رات کے بعد جب سب گھر والے مجھے کوٹھڑی میں بند کر کے میرے خاوند کی لاش کے پاس چھوڑ کر سو گئے تو موہنی نے چپکے سے اٹھ کر کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے کھول دیا۔ میں دبے پاؤں اٹھی اور کوٹھڑی سے باہر نکل گئی۔ ہمارا چھوٹا سا کچا مکان تھا۔ صحن میں چارپائی پر میرا باپ اور دوسرے پجاری جنہوں نے صبح مجھے لاش کے ساتھ زندہ جلاتا تھا۔ گھری نیند سو رہے تھے۔ میں ان کے قریب سے ہو کر آہستہ آہستہ پاؤں رکھتی گذر گئی۔ میری سیہلی نے میرے لئے وہاں ایک چھوٹی سی کشتی رات کو ہی باندھ رکھی تھی۔ میں گھاؤں کی اندھیری سنسان گلیوں میں سے گذرتی دریا کنارے آگئی۔ کشتی دریا کے کنارے رسے سے بندھی ہوئی تھی۔ کشتی میں بیٹھ کر میں نے رسی کھول دی۔ کشتی دریا کے تیز بہاؤ کے ساتھ بننے لگی۔ کشتی میں ایک پتوار بھی تھا۔ میں نے کبھی کبھی کشتی نہیں چلائی تھی مگر عجیروں کو کشتی چلاتے دیکھا تھا۔ میں نے پتوار تھام لیا۔ پانی کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ میں اس طرح چپو چلانے لگی کہ کشتی دریا کے کنارے سے دور دور رہے۔ جب سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تو ایک شہر آہیا۔ دریا کی لہرس ایک بڑے مندر کے گھاٹ کے سامنے سے ہو کر گزرتی تھیں۔ کشتی کو گھاٹ کی

درخت کے چوترے پر بیٹھی گیان دھیان میں مشغول تھی کہ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ کھینچ کر اسے ڈانٹا کہ پرانی عورت کو چھیڑنا اچھی بات نہیں۔ اس نے مجھے کھینچ کر چوترے سے نیچے اتارا اور مجھ سے دست درازیاں کرنے لگا۔ میں نے اسے دھکا دے کر گرا دیا اور وہاں سے بھاگ کر اس غار میں آ کر چھپ گئی۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ آدمی اسی شکاری نے بھیجے ہوں گے۔“

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تم میس بیٹھو۔ میں جا کر معلوم کرتا ہوں کہ وہ لوگ ابھی تک وہیں ہیں یا چلے گئے ہیں۔“

مجھے چند رکھی نے نہ روکا۔ وہ ہرن کی کھال پر اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں غار سے نکلنے کے بعد دوسری جانب کے درختوں کے پیچھے سے ہو کر چٹانوں کے عقب میں اس تختے پر کی جانب آیا جہاں چند رکھی کا جھونپڑا تھا۔ میں جھونپڑے کے بالفاظیل جھاڑیوں کے عقب میں آ گیا تھا۔ اب مجھے دونوں آدمیوں کی تلاش تھی۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ ادھر کیلے کے درختوں کی قطار تھی۔ یہاں دبے پاؤں چل کر میں ان لوگوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے بیڑی کے تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔ میں رک گیا۔ پھر جھک کر درختوں کی اوٹ لیتا، جدھر سے تمباکو کی بو آ رہی تھی اس طرف چلا گیا۔ اچانک کوئی آہستہ سے کھانسا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی قریب ہی جھاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بالکل خاموشی چھائی رہی۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

”رانا جی کو چل کر کہہ دیتے ہیں وہاں کوئی نہیں تھا۔ جھونپڑی خالی پڑی تھی۔“

دوسرے آدمی نے کہا۔

”مرے کیوں جاتے ہو۔ تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے ہیں۔ شاید آجائے۔“

دس پندرہ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد پہلے والا آدمی دوبارہ بولا۔

”ہریا! شام ہو گئی تو راج گیری جانے والی گاڑی چھوٹ جائے گی۔ میری

مانو، رانا جی کو کہہ دیں گے کہ ہم نے سارا جنگل چھان مارا تھا۔“

”چلو پھر چلے ہیں۔“

یہاں ضرور کوئی جوگی وغیرہ رہتا ہوگا۔ بس پھرتا پھرتا ایک پگڈنڈی پر نکل آیا۔ یہاں میں نے دو آدمیوں کو باتیں کرتے سنا۔ وہ کسی عورت کو اغوا کرنے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی کے پاس دو ٹالی بندوق بھی تھی۔ وہ آگے نکل گئے تو مجھے تم نظر آ گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آدمی تمہیں اغوا کرنے آئے ہیں۔ چنانچہ اپنا فرض سمجھ کر میں نے تمہیں خطرے سے آگاہ کر دیا۔

چندر رکھی خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں پر بے معلوم سا تبسم تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”تمہیں یہاں سے کسی اور جگہ چلے جانا چاہئے۔ دونوں آدمی تمہاری جھونپڑی کے آس پاس چھپ کر بیٹھے ہیں۔ وہ تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے۔“

میری بات سن کر وہ خاموش رہی۔ پھر آہستہ سے کہا۔

”بھگوان بدھ میری مدد کریں گے۔“

میں اس نامعلوم عورت کو ڈاکوؤں سے بچانا چاہتا تھا جو بندوق لئے اس کے انتظار میں اوپر چٹانوں کے پاس اس کی جھونپڑی کی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ چند رکھی خوف زدہ بالکل نہیں تھی۔ اس کا چہرے ویسے کا دیا پرسکون تھا۔ یہاں میں اپنے دل کی بات ضرور بتا دینا چاہتا ہوں، چاہے آپ میرے بارے میں کچھ بھی سوچیں۔ میرے دل کی بات یہ تھی کہ مجھے اس عورت چند رکھی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس محبت کے محرکات کیا تھے؟ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں تھی۔ بس میں چاہتا تھا کہ اس کے پاس ہی بیٹھا رہوں اور اس سے کبھی جدا نہ ہوں۔ میں نے پوچھا۔

”کیا یہاں تمہارا کوئی دشمن بھی ہے؟ آخر یہ لوگ تمہیں نقصان پہنچانے آئے ہیں تو ضرور کوئی بات ہوگی۔“

وہ بولی۔

”میرا کوئی دشمن نہیں۔ میرا کوئی دوست نہیں۔“

وہ چپ ہو گئی۔ مٹی کا چراغ جل رہا تھا۔ اس کی بجی ذرا نیچی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے تھوڑا اونچا کر دیا۔ چند رکھی کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے وہ کسی بات پر غور کر رہی ہو۔ کہنے لگی۔

”ایک شکاری کچھ روز ہوئے یہاں آیا تھا۔ میں اپنی جھونپڑی کے باہر

مانے ایکدم روشنی ہی روشنی ہو گئی تھی۔ میں اس روشنی میں شرابور تھا۔ میری زندگی کا بھٹکا ہوا سیارہ چندرکمی کے حلقہ کشش میں آکر اس کے گرد گردش کرنے لگا تھا۔ اب اس حلقہ کشش سے لگنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہہ دیا۔

”دیوی! میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارے پاس رہ کر تمہاری خدمت کروں گا۔“

وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ گہماکی فضا ساکن تھی۔ چراغ کی لو بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ اس کی روشنی، چندرکمی کے زرد لباس سے مل کر اس کے حسین اور نورانی چہرے کو اور زیادہ مقدس بنا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟“

اچانک مجھے ایسے لگا جیسے میری پہلی محبت شبنم مجھ سے ہمکلام ہے۔ میری آنکھوں میں اپنے آپ آنسو آگئے۔ چندرکمی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور چہرے پر تجسس کے اثرات ابھر آئے۔

”کیا تمہیں مجھ سے پریم ہو گیا ہے؟“

میں نے روتے ہوئے کہا۔

”مجھے نہیں پتہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔“

اور میں نے آنسوؤں سے بھیگتا چہرہ اپنے بازوؤں میں چمپا لیا۔ چندرکمی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھوں میں سے مجھے گرم شعاعیں نکلتی محسوس ہوئیں۔ ان شعاعوں کی حرارت جیسے میرے جسم میں داخل ہو کر اسے لطیف سے لطیف تر بنا رہی تھی۔ مجھے اپنے اوپر سورج سے پھڑکی ہوئی دھوپ لگمان ہونے لگا۔ مجھے چندرکمی کی دل کو سکون عطا کرنے والی آواز سنائی دی۔

”تمہارے ماما پتا تمہارے بغیر پریشان ہوں گے۔ تمہیں ان کے پاس والہیں چلے جانا چاہئے۔“

میں نے بازوؤں میں سے سر اٹھا کر کہا۔

”میں میرے کوئی ماما پتا نہیں ہیں۔ میں ان سے بہت دور نکل آیا ہوں۔“

مجھ سے کوئی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ آدی اٹھ کر ایک طرف چل پڑے۔ میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ایک آدی کے کندھے سے دو ٹالی بدوق لگی تھی۔ یہ وہی آدی تھے جنہیں میں نے پہلے اس طرف آتے دیکھا تھا۔ کچھ فاصلہ ڈال کر میں بھی ان کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ وہ درختوں کے جھنڈ میں جا کر پہاڑی کے شیب میں اس طرف اتر گئے جدھر سے میں یہاں آیا تھا۔

میں وہاں سے واپس چندرکمی کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ وہ دونوں مایوس ہو کر چلے گئے ہیں۔ چندرکمی اسی طرح بیٹھی تھی جس طرح میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس طرح بیٹھے بیٹھے وہ بالکل نہیں تھکی تھی۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھے سے آدی کی ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ کسی رانا جی کا نام لے رہے تھے تو وہ بولی۔

”یہ وہی شکاری ہو گا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔“

میں نے کہا۔

”چندرکمی جی! تم یہاں پر محفوظ نہیں ہو۔ یہاں سے کہیں اور چلی جاؤ۔“

ہو سکتا ہے اب کی بار وہ رانا خود ان کے ساتھ آئے۔“

چندرکمی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہیں اور جانے سے کیا ہو گا۔ اگر بھگوان بدھ نے مجھے بچانا ہے تو وہ یہاں

بھی مجھے بچالیں گے۔ ہاں تم ضرور چلے جاؤ۔ تم اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالو۔“

میرے دل کی یہ کیفیت تھی کہ میں تھوڑی دیر کے لئے اس سے الگ ہو کر ان جرائم پیشہ آدمیوں کو دیکھنے گیا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ میں اپنی کوئی بڑی جیتی شے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ میں اس پار سائبریا کے طلسم کا اسیر ہو چکا تھا۔ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں فلم یونٹ کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ کی غرض سے ان پہاڑوں پر آیا ہوں اور لکشی بانی کو میرا انتظار لگا ہو گا۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔ اے دل! آسانی محبت کا چاند تیری زندگی کے آسمان پر طلوع ہوا ہے۔ اسے چھوڑ کر مت جانا۔ اسے چھوڑ کر جاؤ گے تو دنیا کے اندھیروں میں بھگے جاؤ گے۔ ساری عمر بھٹکتے رہو گے اور منزل کا سراغ تک نہیں ملے گا۔

میری منزل کیا تھی؟ اس کا مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ بس میری آنکھوں کے

لے لیا اور التجا کی۔

”مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کرو دیوی! مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں رہا۔ تم سے جدا ہو کر میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔“

میری اور اس زرد پوش عورت میں کچھ نہیں تو بیس بائیس سال کا فرق ہو گا لیکن محبت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ کم از کم اس وقت مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جب میں چراغ کی روشنی میں دیکھتا ہوں چہرے والی خوبصورت چندر کھی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اپنے کندھے پر سے کھسک کر نیچے آیا ہوا زرد لبادہ اوپر کرتے ہوئے بولی۔

”تم شر کے کھانوں کے عادی ہو۔ یہاں تمہیں جنگلی پھل پھول اور جیشے کے پانی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔“

میں نے محبت کے جوش میں کہا۔

”میں تمہارے پاس بغیر کچھ کھائے پئے بھی رہ لوں گا۔“

وہ ہنسنے لگی۔ میں اس کی صورت کو تک رہا تھا جس میں سے مجھے شعاعیں سی نکلتی نظر آ رہی تھیں۔ کیا یہ میری محبت بھری نظروں کا فریب تھا؟ کیا یہ میرے لڑکپن کی نادانی تھی؟ اس وقت یہ باتیں نہ میرے ذہن میں آ رہی تھیں نہ میں انہیں سمجھ ہی سکتا تھا۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد اب مجھے معلوم ہوا کہ وہی میری زندگی کی سب سے بڑی دانشمندی تھی۔ اس وقت میں نہیں بول رہا تھا۔ میرے جسم کے اندر سائی ہوئی نورانی روح بول رہی تھی جو اپنی گمشدہ جنت سے پھرنے کے بعد جنگلوں، جنگلوں کی بارشوں میں بھیجتے سرخ زرد سفید گلابوں، خدا کی حمد و ثناء کرنے والے رنگین پرندوں، نورانی چروں، چاندنی راتوں میں خاموشی سے بننے والے دریاؤں، طوفانی سمندروں، بارش میں بھیجتے خاموش ریلوے پلیٹ فارموں، پارکوں میں کھیلنے بچوں اور سورج کے طلوع و غروب کے منظروں میں اسی گمشدہ جنت کو تلاش کر رہی تھی۔ مجھے آج بھی یاد نہیں آتا کہ چندر کھی کا جسم کس طرح کا تھا۔ جب نگاہوں میں روح کا نور سایا ہو تو وہ نگاہ جسم کو نہیں اس جسم کی روح کو دیکھتی ہے۔

آپ اسے میری بیوقوفی، حماقت اور جو جی چاہے کہ لیں لیکن میں آج بھی اپنی اس بیوقوفی اور حماقت کو زندگی کی سب سے قیمتی متاع جان کر سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور اگر افلاطون اور آئین شائن دنیا میں واپس آ کر مجھے کہیں کہ ہمارے مکالمات اور

نظریہ اضافیت لے کر اپنی یہ بیوقوفی اور حماقت ہمیں دے دو تو میں کبھی نہ دوں گا۔ چندر کھی مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ خوشبو اور روشنی بن کر میری روح میں اتر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“

مجھے ایسے لگا جیسے واقعی میں نے دنیا کی سب سے قیمتی چیز کو حاصل کر لیا ہے۔ وہ کہنے لگی۔

”تم مسلمان ہو۔ تم اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنا۔ میری طرف مت دیکھنا کہ میں کس طرح خدا کی عبادت کرتی ہوں۔“

میں نے کہا۔

”میں نماز پڑھ لوں گا۔“

وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”تمہارے مذہب نے تمہیں جو راستہ دکھایا ہے ہمیشہ اس راستے پر چلتے رہنا۔ برائی کا خیال انسان کے دل میں ضرور آتا ہے جب یہ خیال آئے تو اپنی روح کی ساری طاقت لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دینا۔ یہ برا خیال تمہارے اور خدا کے درمیان ایک پردہ گرا دیتا ہے۔ دل میں ہمیشہ ایسا خیال رکھنا جس میں سے پھولوں کی خوشبو آتی ہو۔ آسمانوں میں ایسے ان گنت لاکھوں، اربوں، کھربوں خیالات ہر وقت بھرتے رہتے ہیں جن سے خوشبوئیں نور کی کرنوں کی طرح پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ یہ وہ خوشبوئیں ہیں جو آج تک زمین کے کسی پھول کو نصیب نہیں ہوئیں۔ یہ اچھے اچھے خیالات آسمانوں کے پاس تمہاری امانتیں ہیں۔ ان کو وصول کرو۔۔۔۔۔“

وہ دیر تک اس قسم کی باتیں مجھ سے کرتی رہی۔ ان باتوں میں سے کچھ مجھے یاد رہ گئی ہیں۔ بہت کچھ بھول گیا ہوں۔ میں اس کی یہ اچھی اچھی باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا۔ مجھ پر کچھ اثر ہو رہا تھا، کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی وقت اس کی آواز خاموش ہو جاتی تو میں صرف اس کے ہونٹ ہلنے دیکھنے میں محو ہو جاتا۔ مجھے لگتا جیسے گلاب کا کوئی پھول مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ یکبارگی پھر اس کی آواز سنائی دینے لگ جاتی۔

اب سورج مغربی پہاڑیوں کی طرف غروب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سواکھ لکھی بانی ضرور مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ اسے ایک بار جا کر مل آتا ہوں۔

اس کے بعد یہاں چند رکھی کے پاس واپس آ جاؤں گا۔ میں نے چند رکھی سے کہا۔
 ”میں تھوڑی دیر کے لئے جاتا ہوں۔ جن لوگوں کے ساتھ یہاں آیا ہوں
 انہیں کہہ آؤں کہ اب میں ان کے پاس نہیں رہوں گا۔“
 چند رکھی نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔
 ”ایک بار پھر سوچ لو۔ کیا تم یہاں صرف پھل پھول اور پانی پر گزارہ کر لو
 گے؟“

میں نے کہا۔
 ”کر لوں گا۔“

میں چند رکھی کو اس کی گھٹائی میں چھوڑ کر واپس چل پڑا۔ واپسی پر میں ایک
 بار پھر اس کے جھونپڑے کی طرف سے ہو کر گذرا۔ اس خیال سے کہ کہیں دونوں
 ڈاکو وہاں دوبارہ نہ آ گئے ہوں۔ مگر جھونپڑی خالی تھی۔ مجھے وہاں کوئی انسان نظر نہ
 آیا۔ شام ہو رہی تھی۔ درختوں پر پرندوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

میں پہاڑی سے اتر کر وادی میں اس جگہ آ گیا جہاں ہمارے قلمی یونٹ نے
 پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ لکشی بائی مجھے دیکھتے ہی برس پڑی۔

”تم کہاں دفع ہو گئے تھے؟ یہاں تمہارا کام کس نے کرنا تھا؟“

وہ اتنی غصے میں تھی کہ میں نے اسے یہ بتانا اس وقت مناسب نہ سمجھا کہ
 میں اس کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اسے چند رکھی کے بارے
 میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ بس یہی کہوں گا کہ مجھے اپنے ماں باپ بہن بھائی یاد آرہے
 ہیں اور میں واپس اپنے شہر جا رہا ہوں۔ لکشی بائی نے مجھے خیمہ کے اندر ایسے کام پر
 لگا دیا کہ اسے نمٹاتے نمٹاتے رات ہو گئی۔ پھر کھانا تقسیم ہونے لگا۔ مجھے بھوک بھی
 لگ رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہوا تو رات کافی گزر چکی تھی۔ اس وقت جنگل میں
 سے گزر کر چند رکھی کے پاس جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس خیال سے کہ کہیں کسی جگہ
 سے کوئی شیر نہ نکل آئے۔ یہ بڑے گھنے جنگل تھے اور بچنے ترائی میں سنا تھا کہ رات
 کو شیر چپتے پھرا کرتے ہیں۔ میں نے یہی سوچا کہ کسی نہ کسی طرح رات قلمی یونٹ
 کے خیمے میں بسر کر لیتا ہوں۔ صبح اٹھتے ہی چند رکھی کے پاس چلا جاؤں گا اور پھر کبھی
 لکشی بائی کے پاس واپس نہیں آؤں گا۔ خیموں کے باہر گیس روشن تھے۔ کچھ لوگ
 ادھر ادھر گھاس پر بیٹھے بادہ آشامی میں مشغول تھے۔ خیموں کے اندر سے بھی مردوں
 عورتوں کے قدموں کی آوازیں آ جاتی تھیں۔ لکشی بائی ایک لڑکی سے اپنے سر میں
 تل ڈلوا کر مالش کروا رہی تھی۔ میں خیمہ کے کونے میں دری پر ایک طرف پڑ گیا۔
 جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

صبح لکشی بائی نے مجھے جگا دیا اور چائے لانے کو کہا۔ میں خیمہ سے باہر
 آیا تو دیکھا آسمان پر صبح کی سفیدی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ گھاس اور پودے شبنم
 سے کیلے ہو رہے تھے۔ ایک طرف چائے کا بڑا سادہ گچہ چڑھا ہوا تھا۔ ایکٹر لوگ وہاں
 بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ مجھ پر چند رکھی کے پاس جانے کی

جھونڈے میں کل والے گیندے کے پھول اسی طرح کھلے کے پتوں کے
 تھال میں پڑے ہوئے تھے۔ پھول تھوڑا تھوڑا مرجھا گئے تھے۔ میں جھونڈے کے
 سامنے درخت کے نیچے جو چبوترہ بنا ہوا تھا وہاں آکر بیٹھ گیا میرے دل کو ایک بے
 چینی سی لگ گئی تھی۔ دل میں طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ اندیشے اور دوسرے
 پیدا ہو رہے تھے۔ کہیں بچ رانا کے غنڈے اسے اٹھا کر نہ لے گئے ہوں۔ اچانک
 مجھے چندرکھی کے کمرنڈل کا خیال آگیا۔ میں نے یہ کمرنڈل جھونڈی میں گیندے
 ہاں پھولوں کے پاس دیکھا تھا۔ میں دوڑ کر جھونڈی میں گیا۔ کمرنڈل وہیں پڑا تھا۔
 میں سوچنے لگا اگر چندرکھی ندی یا چشمے پر نہانے گئی ہوتی تو یہ کمرنڈل ضرور ساتھ
 لے جاتی۔ ایک بار پھر میرے دل میں دوسرے اور اندیشے سر اٹھانے لگے۔ میں تیزی
 سے جھونڈے سے باہر آگیا اور پیچھے جو چشمہ بتاتا تھا اس طرف تیز تیز چلنے لگا۔ یہ
 چھوٹا سا چشمہ تھا جو پتھروں کے درمیان بہہ رہا تھا۔ ان پتھروں کے اندر کہیں سے پانی
 آ رہا تھا۔ وہاں چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا۔ یہاں سے پانی دوسری جانب ناریل کے
 درختوں کی طرف نشیب میں جا رہا تھا۔ چشمہ خالی پڑا تھا چندرکھی یہاں بھی نہیں
 تھی۔ دن کی روشن دھوپ پوری آب و تاب کے ساتھ درختوں میں سے چھن کر آ
 رہی تھی۔ کسی کسی درخت پر پرندے چھجھا رہے تھے۔ پرندے خاموش ہو جاتے تو
 وہاں گمراہ سکوت چھا جاتا۔ میں نے جھاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے آواز
 دی۔

”دیوی جی!“

کسی پرندے نے بول کر اپنی بولی میں جیسے مجھے کہا کہ دیوی جی یہاں کہیں
 نہیں ہیں۔ میرا دل غم سے بوجھل ہو گیا۔ میں واپس ہو گیا۔ وہاں سے وڈبارا غار والی
 گھاٹی میں آیا۔ چندرکھی کو آواز دی۔ اندھیرا تھا کسی نے جواب نہ دیا غار سے نکلا تو
 ایک بار پھر اوپر جھونڈی کی طرف گیا۔ جھونڈی اسی طرح خالی تھی۔ مولری کے
 درخت کے نیچے چبوترے پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کبھی میرا دل کہتا کہ چندرکھی کو رانا
 کے غنڈے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کبھی دل کہتا کہ نہیں وہ جنگل میں ہی کہیں ہوگی۔
 ابھی واپس آجائے گی۔ ان خیالوں میں الجھا دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ جب بیٹھے بیٹھے
 کافی دیر ہو گئی اور چندرکھی نہ آئی تو میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ ہو
 سکتا ہے وہ کوئی ضروری چیز لینے یا خریدنے کے لئے نیچے کسی پہاڑی گاؤں میں گئی

دھن سوار تھی۔ میں نے ان درختوں کی طرف دیکھا جن کے درمیان سے چھوٹی سی
 گینڈی اوپر چٹانوں میں چندرکھی کے جھونڈے اور اس کی گھسا کی طرف جاتی تھی۔
 میں نے دل میں کہا۔ اے دل! سب کچھ ہمیں پڑا رہنے دے۔ اس پہاڑی کی طرف
 چل جہاں تیری محبت کی ہوا گیندے اور مولری کی خوشبوئیں لئے چل رہی ہے۔
 میرے قدم اپنے آپ اوپر پہاڑی کی طرف جاتے راستے کی جانب اٹھتے چلے
 گئے۔ صبح کا وقت تھا۔ قسم قسم کے جنگلی پھول پودوں اور سبزے کی منک والی خشک
 ہوا چل رہی تھی۔ میں اوپر چٹانوں کے درمیان سے گرتی آبشار کے قریب سے ہو کر
 دوسرے تختے پر آگیا جہاں چندرکھی کا جھونڈا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شکاری رانا کے
 غنڈوں کے ڈر سے چندرکھی رات کو چٹانوں کی گھسا میں ہی سوئی ہوگی۔ میں
 جھونڈے کے پھلوں والی جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کنول کے پھولوں سے ڈھکے ہوئے
 تالاب کے پاس آیا۔ پھر جنگلی جھاڑیوں کی سرنگ میں سے گزر کر اس اونچی سبز چٹان
 کے پاس آیا جس کے اندر چندرکھی نے عبادت کرنے کے واسطے گھسا بنا رکھی تھی۔
 سرنگ کے اندر اندھیرا تھا۔ جب میں گھماہ میں داخل ہوا تو وہاں بھی اندھیر
 تھا۔ مجھے خیال آیا کہ چندرکھی سو رہی ہوگی۔ میں نے اس کا نام لے کر آواز دی۔
 کوئی جواب نہ آیا۔ دو تین بار آوازیں دینے پر بھی جب کوئی نہ بولا تو میں دیوار کے
 ساتھ لگ کر ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر اس تھڑے پر آگیا جہاں پچھلے روز چندرکھی
 نے دیا جلایا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ ماچس پر پڑ گیا۔ میں نے دیا سلائی جلاوی۔ گھسا خا
 تھی۔ چندرکھی وہاں نہیں تھی۔ میں دیا سلائی بجھا کر گھسا سے واپس مڑا۔ سوچا
 شاید چشمے پر نہانے گئی ہوگی۔ غار سے باہر آکر میں ایک طرف بیٹھ گیا اور چندرکھی
 انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب وہ نہ آئی تو یہ سوچ کر
 اوپر جھونڈے کی طرف چل پڑا کہ شاید وہ وہاں پر ہو۔ وہاں آیا تو دیکھا کہ جھونڈے
 خالی تھا۔ اچانک دل میں خیال آیا کہ کہیں رات کو بد معاش شکاری رانا کے غنڈے
 آکر اسے اٹھا کر نہ لے گئے ہوں۔ پھر سوچا، نہیں وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے تھے
 راج گری کی گاڑی پکڑنی ہے وہ کہاں آئے ہوں گے۔ خدا جانے یہ راج گری یہاں
 سے کتنی دور ہو۔ نہیں نہیں چندرکھی یہیں کہیں ہوگی۔ چشمے پر نہا رہی ہوگی۔ اٹھ
 کر رہی ہوگی۔ منہ ہاتھ دھو رہی ہوگی۔ ابھی آجائے گی۔ ہو سکتا ہے کسی جگہ
 خدا کی عبادت کر رہی ہو۔

کہ اسے شکاری رانا کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے اسی وقت دل میں عہد کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں چند رکھی کی تلاش میں جاؤں گا اور اسے ان غنڈوں سے نجات دلا کر رہوں گا۔

قلبی یونٹ دوسرے روز بمبئی واپس جا رہا تھا۔ جب شام ہونے لگی اور یونٹ کے آدمی سامان وغیرہ پیک کرنے میں مصروف تھے اور لکشی بائی درختوں کے نیچے فلم کے ڈائریکٹر کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور چائے پی رہی تھی، میں آنکھ پچا کر اوپر چند رکھی کے استھان کی طرف دوڑ پڑا۔ میں ایک بار پھر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ دل میں یونٹی ایک معمولی سی امید تھی کہ میں جاؤں تو آگے چند رکھی جھونپڑی میں بیٹھی ہو۔۔۔۔۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں نے ہر ایک جگہ دیکھ ڈالی۔ چند رکھی کہیں بھی نہیں تھی۔

اب میں نے چند رکھی کی تلاش میں نکلنے کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میری کوئی اتنی زیادہ عمر نہیں تھی کہ خوب سوچ سمجھ کر کوئی زبردست منصوبہ بناتا۔ جو دو آدمی رانا نے چند رکھی کو اغواء کرنے کے لئے بھیجے تھے ان کی زبانی میں نے سن لیا تھا کہ وہ راج گری واپس جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ شکاری رانا راج گری میں رہتا ہوگا اور چند رکھی کو اغواء کر کے وہیں لے جایا گیا ہوگا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ راج گری اگر کوئی قصبہ یا شہر ہے تو کس جگہ پر واقع ہے۔ میں اپنے دل میں کئی قسم کے پروگرام بناتا اپنے قلمی یونٹ کے پاس واپس آ گیا۔ دوسرے دن صبح صبح ہمارا یونٹ بمبئی کی طرف کوچ کر گیا۔

بمبئی آتے ہی میں نے میں نے لکشی بائی سے پوچھا کہ راج گری کون سا شہر ہے۔ وہ اس وقت میرے پاس استری کرنے کے واسطے دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ بولی۔

”تم کیوں پوچھتے ہو؟ کیا اب راج گری بھاگ جانے کا ارادہ ہے۔“

میں نے کہا۔

”نہیں بائی جی! ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔ لیا واتی کہہ رہی تھی کہ راج گری

میں بڑے بڑے سانپ ہوتے ہیں۔“

لکشی بائی نے مجھے جھڑک دیا۔

”اپنے کام سے کام رکھو۔ پہلے میری نیلی ساڑھی استری کرنا۔ مجھے دھن

ہوئی ہو۔ میں دوپہر کے وقت دوبارہ آکر معلوم کروں گا۔

یہ سوچ کر میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ سارا رستہ دل میں چند رکھی کے بارے میں طرح طرح کے پریشان کر دینے والے خیال آتے رہے۔ اگر چند رکھی جیشے پر نہیں ہے، گھسا میں نہیں ہے۔ جھونپڑے میں نہیں ہے۔ جنگل میں بھی نہیں ہے تو ضرور اسے رانا کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنا لگا کہ اگر غنڈے اسے اٹھا کر لے گئے ہیں تو وہ لوگ اس پاک باز خدا پرست عورت کے ساتھ کس قسم کا سلوک کر رہے ہوں گے۔ درختوں کے نیچے چلتے چلتے میرا مٹھیاں اپنے آپ سمجھ گئیں۔ میں ان غنڈوں کو ہلاک کر کے ان کے جنگل سے چند رکھی کو چھڑا لانا چاہتا تھا۔ دوسرے لمحے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلیاں دینے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اگر رانا نام کے کسی شکاری نے چند رکھی سے چھینڑنا کی تھی اور چند رکھی نے اسے ڈانٹ دیا تھا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ چند رکھی کو اغواء کروانے کے لئے اپنے آدمی بھیج دے۔ پھر خیال آیا کہ آدمی تو چند رکھی کو اغواء کرنے آئے تھے۔ میں نے دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔؟ آدمی نے اپنے کندھے پر دو ٹالی بندوق لٹکا رکھی تھی اس کی تو شکل بھی مجھے یاد تھی ایک بار پھر مجھ پر غم کے بادل چھا گئے۔

اسی اداسی اور مایوسی کے عالم میں نیچے قلمی یونٹ کے ٹیمپوں میں پہنچ لکشی بائی مجھے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی۔

”تمہیں چائے لانے بھیجا تھا۔ کہاں جا کر مر گئے تھے۔ تم سخت کام چور گئے ہو۔ بمبئی جاتے ہی تمہیں گھر سے نکال دوں گی۔“

میں خاموشی سے اس کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا۔ اس لمحے میرے دل چند رکھی کے غم کا اتنا شدید اثر تھا کہ لکشی بائی کی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک عورت میرے سامنے کھڑی کسی ایسی زبان میں رہی ہے جو میری سمجھ سے باہر ہے۔

دوپہر کے بعد موقع پا کر میں دوبارہ اوپر چند رکھی کی گھسا اور جھونپڑ۔ طرف نکل گیا۔ چند رکھی دونوں میں سے کسی جگہ پر نہیں تھی۔ گھسا بھی خالی جھونپڑا بھی خالی پڑا تھا۔ جیشے پر جا کر دیکھا۔ آس پاس کے جنگل میں جا کر چند رکھی کہیں نہ ملی۔ میں سخت مایوسی کے عالم میں واپس آ گیا۔ مجھے یقین ہو

راج سینھ کے ہاں جانا ہے۔"

لکشی بائی سے مجھے راج گری کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مجھے ہر حالت میں اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنی تھی۔ میں نے لکشی بائی کی نیلی ساڑھی استری کر کے اسے دے دی۔ وہ ساڑھی بدل کر ماتھے پر تلک لگا کر سینھ دھن راج سے ملنے چلی گئی۔

ساتھ والی چالی میں ایک بوڑھا آدمی رہتا تھا جو کسی زمانے میں ڈاک خانے میں ملازم تھا۔ اب اس کا کام اپنی چالی یعنی کمرے کے آگے نوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر دن بھر بیڑیاں پھونکنا اور گجراتی 'ہندی اور اردو کے نئے پرانے اخبار پڑھتے رہتا تھا۔ میں اپنا کام ختم کر کے اس کے پاس گیا اور اس سے راج گری کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ راج گری بمبئی سے چالیس میل نیچے جنوب مشرق کی جانب متھراون کے ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک قصبہ ہے جہاں پٹیل اور رانا ذات کے ٹھاکروں کی بڑی بڑی جاگیریں اور زمینیں ہیں۔ راجا کا نام سنتے ہی میرا یقین پکا ہو گیا کہ چند رکھی وہیں ہوگی۔ میں نے بوڑھے کو پینے کے لئے جیب سے نئی بیڑی نکال کر دی اور پوچھا کہ اس طرف کوئی لاری جاتی ہے۔ وہ بیڑی سلگا رہا تھا۔ بیڑی سلگا کر اس نے دو تین ہلکے ہلکے کس لگائے اور اپنی شیشوں والی عینک کو ٹھیک طرح سے جھاتے ہوئے بولا۔

"بمبئی کے بوری بندر سے دن کے وقت ایک ٹرین پونا کو جاتی ہے۔ ایک گھنٹے بعد اسی لائن پر متھراون نام کا اسٹیشن آتا ہے۔ راج گری وہاں سے چند کوس کے فاصلے پر جھنگو ندی کے پاس ہی ہے۔ وہاں لاری وغیرہ بمبئی سے کوئی نہیں جاتی۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یونی پوچھ رہا تھا۔ ہمارے یونٹ کی ایک ایکسٹرا گرل ہے لیلا دتی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ راج گری میں بڑے بڑے سانپ ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے اخبار اٹھایا اور اس کے پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ میں چپکے سے واپس اپنی چالی میں آ گیا۔ میں نے صبح بمبئی سے نکل جانے کا پروگرام دل میں طے کر لیا۔ میرے پاس ایک دو روپے ہی رہ گئے تھے۔ لکشی بائی نے ابھی مجھے

تنخواہ نہیں دی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مہینہ ختم نہیں ہوا۔ وہ مجھے ایک پیسہ بھی پیشگی نہیں دے گی۔ مجھے معلوم تھا وہ روپے پیسے کس ڈبے میں چھپا کر رکھتی ہے۔ یہ ڈبہ ہمیشہ اس کی لوہے کی چارپائی کے نیچے کونے میں صندوق کے پیچھے رکھا ہوتا تھا۔ میری تنخواہ جتنی بنتی تھی میں نے رات کے وقت موقع پا کر لکشی بائی کے ٹین کے ڈبے سے چاندی کے دس روپے نکال کر اپنی جیب میں رکھ لئے اور گھر کا کام کاج کر کے فرش پر سو گیا۔ اس خیال سے مجھے فائدہ نہیں آ رہی تھی کہ صبح میں چند رکھی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اسی خیال میں سو گیا تھا۔ خواب میں چند رکھی کو دیکھا وہ ایک کنویں میں زنجیروں میں جکڑی پڑی تھی۔ اس کے پاس ہی دیا جل رہا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بار بار مجھے آواز دے کر مدد کے لئے بلا رہی تھی۔ میں کنویں کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔ پھر میں نے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ میں ایکدم نیچے گرنے کی بجائے آہستہ آہستہ نیچے گر رہا تھا۔ جیسے ہی میں نیچے گرا ایک کالا سانپ کنویں کی دیوار میں سے نکل کر میری طرف پھسکارتا ہوا بڑھا۔ میری چیخ نکل گئی۔ ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ چالی میں لال رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ لکشی بائی یہ بلب رات کو کمرے میں جلا دیتی تھی۔ وہ ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھی۔ میرے کمرے میں دوسری طرف بوڑھی نوکرانی سو رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صندوق کے اوپر ٹائم پیس رکھا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کو غور سے دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں جلدی سے صف پر لیٹ گیا۔ مگر فائدہ غائب تھی۔ خاموش پڑا رہا۔ چاندی کے دس روپے میری پتلون کی جیب میں تھے۔ میں صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ بازار میں سے ایک ٹرک گزر گیا۔ دور کسی مندر سے گھنٹیاں بجنے کی آواز آنے لگی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چڑے کے بوٹ پہن کر تسمے باندھے۔ قمیض کو پتلون سے باہر ہی رہنے دیا۔ وہاں میرا کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ کمرے سے دبے پاؤں نکل کر راہ داری میں آ گیا۔ راہ داری کے کونے میں سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ یہاں ایک دو غسل خانے بنے ہوئے تھے یہاں میں نے منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں چھوٹی کتکھی جیب سے نکال کر پھیری اور جلدی جلدی زینہ اتر کر بازار میں آ گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ بوری بندر اسٹیشن کو جانے والی بس چوک میں سے جاتی

ہے۔ صبح چار بجے کے بعد بسیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مزدوروں نے فیکٹریوں وغیرہ میں جانا ہوتا تھا۔ میں بس سٹاپ کے شیڈ میں بیچ پر بیٹھ گیا۔ بوری بندر جانے والی بس آدھ گھنٹے بعد آئی۔ تقریباً خالی تھی۔ میں بس میں سوار ہو کر بوری بندر پہنچ گیا۔ یہ بسیں کا بہت بڑا ریلوے سٹیشن ہے۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ مسافروں کی چل پھل لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ پونا جانے والی گاڑی سات چالیس پر چلتی ہے۔ میں نے پلیٹ فارم پر ہی ٹائٹ کیا اور ایک طرف بیٹھ کر سگریٹ پینے اور سوچنے لگا کہ اگر چند رکھی راج گری میں بد معاش رانا کے پاس ہی ہوئی تو اس نے اسے ضرور قید میں ڈال رکھا ہوگا۔ میں اسے وہاں سے کیسے نکالوں گا۔ راج گری جانے کا منصوبہ تو میں نے بنا لیا تھا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا مگر وہاں جا کر کیا کروں گا اور کس قسم کے حالات پیش آئیں گے؟ یہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ دل میں ایک خیال، ایک ہی عزم تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے چند رکھی کو وہاں سے نکالنا ہے۔ ہر حالت میں نکالنا ہے۔

پلیٹ فارم پر وقت نہیں گزر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دن کے سات بجے ایک قلی نے بتایا کہ پونا جانے والی گاڑی دوسرے پلیٹ فارم پر لگ گئی ہے۔ میں اس طرف دوڑا۔ لال اور پیلے ڈبوں والی بڑی بسیں ٹرین تھی۔ کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ٹرین اس وقت تک مسافروں سے بھر چکی تھی۔ ابھی اور مسافر آرہے تھے۔ میں بھی تھروڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ مجھے کونے میں چھپ کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ میں بغیر ٹکٹ سفر نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ خرید کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ میرے والا ڈبے بھی قسم قسم کی دیہاتی اور شہری ساریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اردو، گجراتی اور مراٹھی زیادہ نہیں بولی جا رہی تھی۔ گجراتی زبان میں فارسی عربی کے بہت لفظ ہوتے ہیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھ میں آجایا کرتی تھی۔ مگر مراٹھی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اگر میں بھی میں سال دو سال رہتا تو شاید یہ زبان بھی سیکھ جاتا۔ بسیں کی لوکل ٹرینیں اس وقت بھی بجلی سے چلتی تھیں۔ مگر پونا جانے والی اس گاڑی کے آگے کوئلہ سے چلنے والا انجن لگا تھا۔ آخر گاڑی نے سٹی کی آواز بلند کی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد انجن نے دسل دیا۔ جو مسافر ابھی تک باہر کھڑے تھے وہ دوڑ دوڑ کر ڈبوں میں سوار ہونے لگے۔ گاڑی نے تیسری بار سٹی بجائی۔ ریل کے انجن نے دوبارہ دسل دیا۔ ٹرین کو ہلکا سا دھچکا لگا۔ دور آگے سے انجن کے چلنے کی آواز آئی اور ٹرین نے پلیٹ فارم پر کھسکا شروع کر دیا۔

کلیان کے سٹیشن تک گاڑی مین لائن پر چلتی رہی۔ کلیان سے وہ پونا شولا پور لائن پر آگئی۔ اس لائن پر یہ میرا پہلا سفر تھا۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ نہ گرمی نہ سردی۔۔۔۔۔ کلیان تک پہنچنے کے مکان اور کارخانے نظر آتے رہے۔ تاڑ اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ جگہ جگہ نظر آرہے تھے۔ تاڑ کا درخت ستون کی طرح بالکل سیدھا ہوتا ہے۔ اوپر جا کر گلدستے کی طرح اس کی شاخیں نکلی ہوتی ہیں۔ دیہاتی لوگ درخت پر چڑھ کر اس کی شاخ کاٹتے ہیں اور کٹی ہوئی شاخ کے ساتھ مٹی کی ہانڈی باندھ کر اوپر ملل کا رومال ڈال دیتے ہیں۔ ساری رات کٹی ہوئی شاخ میں سے دودھ کی طرح کا گاڑھا رس نکل نکل کر ہانڈی میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ یہ رس بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ رومال اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ اس پر کھیاں نہ گریں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہانڈی درخت پر سے اتار لی جاتی ہے۔ اس میں درخت کا جو رس ہوتا ہے اس کو تاڑی کہتے ہیں۔ مگر اس تازہ تاڑی میں نشہ بالکل نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ اگر ہانڈی کو سورج نکلنے سے پہلے پیلے نہ اتار لیا جائے تو اس میں نشہ پیدا ہوتا شروع ہو جاتا ہے۔ تازہ تاڑی کا ذائقہ میٹھے دہی کی لسی جیسا ہوتا ہے۔ میں نے تازہ تاڑی بندھیا چل کے جنگل میں آدمی باسی لوگوں کے جھونپڑے کے باہر بیٹھ کر پی تھی۔ اس کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے اور جگر کو طاقت پہنچاتی ہے لیکن اس درخت کی شاخوں اور اس کے رس کو ملا کر جو تاڑی شراب کشید کی جاتی ہے وہ بہت زیادہ نشہ آور ہوتی ہے۔ میں نے یہ تاڑی بھی پی کر دیکھی ہے۔ صرف ایک گلاس تاڑی آدمی کی مت مارنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ بسیں کی مزدور بستیوں میں تاڑی کی دکانیں عام ہوا کرتی تھیں۔ سفید رنگ کی کچی لسی ایسی تاڑی کے بڑے بڑے ٹھل بھرے ہوتے تھے۔ مزدور لوگ دکان کے باہر زمین پر بیٹھ کر مٹی کے پالوں میں تاڑی پیتے۔ ساتھ نمکین پتے کھاتے اور لڑتے جھڑتے تھے۔ رنگون میں میں نے قریبی عورتوں کو بھی اسی طرح دکان کے باہر زمین پر بیٹھ کر تاڑی پی پی کر بے ہوش ہوتے دیکھا ہے۔ اعلیٰ خاندان کی بے لالہ قام جب ذلیل ہو جاتی ہے تو تاڑی پی جاتی ہے۔

پونا کے ارد گرد کا علاقہ پہاڑی بھی ہے اور میدانی بھی لیکن زمین زیادہ تر چھری ہے اور اس کا رنگ سرخی مائل ہوتا ہے۔ مزدور پیشہ مرہٹہ عورتیں عام طور پر نیلے بارڈر والی سرخ اور سرخ بارڈر والی نیلی ساڑھیاں اس طرح پہنتی ہیں کہ

ہجوم اتنا تھا کہ دھم پیل ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ آگے جہاں پلیٹ فارم ختم ہوتا ہے وہاں ریلوے لائن پار کر کے شیش سے باہر نکل جاؤں گا۔ بغیر ٹکٹ سفر کرتے وقت میں اسی طرح شیش سے باہر نکلا کرتا تھا۔ میں ٹرین کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف چلنے لگا۔ رٹن بہت زیادہ تھا۔ میں پلیٹ فارم کے آخری سرے پر پہنچا جہاں راج گری شیش کا نام انگریزی اور اردو میں لکھا تھا تو میں نے چار پانچ سال کی ایک بچی کو روتے ہوئے دیکھا۔ اس نے نیلے رنگ کا فرائک پن رکھا تھا۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور بار بار اماں اماں پکار رہی تھی۔ میرے دل پر اس کی گریہ زاری کا بڑا اثر ہوا۔ وہاں کسی کو اس بچی کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ میں نے بچی کے قریب جا کر اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے بے بی۔ تم کیوں رو رہی ہو؟“

بچی روئے جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ بمبئی سے آئی تھی اور اس سے بچھڑ گئی ہے۔ میں نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دلاسا دیا اور کہا کہ رومت میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس لئے چلتا ہوں۔ بچی سخت ڈری ہوئی بھی تھی۔ شاید سادھوؤں کے ہجوم کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ اپنی ماں سے کبھی نہیں مل سکے گی۔ وہ روتے روتے میرے ساتھ لگ گئی۔ اتنی دیر میں پلیٹ فارم پر رٹن ذرا کم ہوا تو میں بچی کو لے کر گیٹ کی طرف بڑھا۔

میں گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک عورت بے اختیار ”دوستی میری بچی“ کہتی ہوئی میری طرف بڑھی اور اس نے بچی کو جس کا نام دوستی تھا پلیٹ فارم پر بیٹھ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں نے اس عورت کو بتایا کہ یہ بچی پلیٹ فارم پر ریلوے انجن کے پاس رو رہی تھی میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔ کیا آپ اس کی ماں ہیں؟ عورت مرہٹن نہیں لگتی تھی۔ اس کا رنگ گورا تھا اور ساڑھی بھی اس کی مرہٹن عورتوں والی نہیں تھی۔ عمر چالیس پتالیس کے درمیان ہوگی۔ جسم صحت مند تھا۔ وہ بچی کو سینے سے لگائے بار بار اس کا ہاتھ چوم رہی تھی۔ بچی بھی اب نہیں رو رہی تھی۔ عورت نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بڑی صاف اردو زبان میں کہا۔

”تم نے میری بچی کو مجھ سے ملا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ ہائے رام۔

دوستی کم ہو جاتی تو میں اسے کہاں ڈھونڈتی؟“

اس عورت کے ساتھ ایک مرد بھی تھا جو دور سے تیز تیز چلا آیا اور دوستی

ساڑھی کا ایک پلو پیچھے سے اوپر لے جا کر کمر میں اڑس لیتی ہیں۔ ٹرین کسی شیش پر رکتی تو کوئی نہ کوئی مرہٹن عورت سر پر سبز موسیوں کا ٹوکرا اٹھائے ڈبے میں موسیوں پیچھے آ جاتی۔ بمبئی کی موسی سبز رنگ کی پتلے چھلکے والی ہوتی ہے۔ یہ میں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ میں چاہتا ہوں آپ جس علاقہ میں میرے ساتھ سفر کر رہے ہیں وہاں کے ڈالنے اور خوشبو سے بھی واقف ہوتے رہیں۔ کلیان سے نکل کر پونا شولا پور ریلوے لائن پر آنے کے بعد ٹرین نے پوری رفتار پکڑ لی تھی۔ چھوٹے چھوٹے شیش آتے اور گزر جاتے۔ کہیں ٹرین کھڑی ہو جاتی۔ کسی شیش کو چھوڑ کر نکل جاتی۔ آخر متھراؤن کا شیش آگیا۔ گاڑی یہاں تھوڑی دیر کے لئے رکی۔ ابھی نہ پاکستان بنا تھا نہ بھارت آزاد ہوا تھا۔ اس لئے ریلوے شیش کے نام اردو اور انگریزی میں لکھے جاتے تھے۔ آج کل تو سب نام ہندی میں لکھے جاتے ہیں۔ بمبئی میں مجھے ریٹائرڈ پوسٹ مین نے بتایا تھا کہ متھراؤن کے آگے چند کوس کے فاصلے پر راج گری کا شیش آتا ہے۔ مجھے وہیں اترنا تھا۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق شکاری رانا کے آدمی چند رکھی کو اغوا کر کے ہمیں لے گئے تھے۔

متھراؤن سے ٹرین چلی تو مجھے چند رکھی کے خیال نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کبھی خیال آتا کہ اگر وہ یہاں نہ ملی تو پھر اسے کہاں تلاش کروں گا۔ یہ خیال بھی آتا کہ چند رکھی شکاری رانا کے پاس بھی ہوئی تو اس نے تو چند رکھی کو ایک طرح قید میں ڈال رکھا ہوگا۔ میں اسے وہاں سے کیسے نکال سکوں گا۔ میری عمر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں رانا کے آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ میں کوئی ٹارزن بھی نہیں تھا کہ نعرہ لگا کر حملہ آور ہوتا اور اپنی ہیروئن کو دشمنوں کے چنگل سے نکال کر لے آتا۔ یہ صرف اس حسین عورت چند رکھی کی محبت تھی جو مجھے نفع نقصان کا خیال کئے بغیر دشمنوں کے حصار میں کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔

آخر راج گری نام کا شیش آگیا۔ ٹرین رکی تو ڈبوں میں سے سادھوؤں اور جوگیوں کا ایک ہجوم نکل آیا۔ سارا پلیٹ فارم ان سے بھر گیا۔ خدا جانے یہاں کوئی تیرتھ استھان تھا یا کوئی مندر تھا جس کی یاترا کو یہ سادھو لوگ آئے ہوئے تھے۔ کیردے اور میندوری رنگ کی چادریں لپیٹے، ترشول ہاتھوں میں لئے یہ لوگ ٹرین سے اترتے ہی بھجن گانے لگے تھے۔ کچھ دوسرے یاتری بھی لال لال پگڑیاں باندھے تیرتھ یاترا کرنے آئے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر اتر کر شیش کے گیٹ کی طرف چلا تو

کو اپنے ساتھ لگا کر بولا۔

”گنگا بائی! تم پر بھاگوان کی بڑی کرپا ہوئی ہے جو دستخی گم ہونے کے بعد مل گئی۔ ورنہ یہاں جو بچی گم ہوتی ہے کبھی نہیں ملتی۔“

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقے میں حیرتھ یاترا کے موقعوں پر اکثر بچیاں بلکہ جوان لڑکیاں بھی گم ہو جاتی ہیں۔ انہیں خاص قسم کے جراثیم پیشہ لوگ درغلا کر یا کوئی چیز کھلا کر بے ہوش کرتے ہیں اور پھر انہیں جنوبی ہند کے مندروں میں جا کر بپاریوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں جہاں انہیں دیو داسی بنا کر رکھ لیا جاتا ہے۔

اس آدمی نے کرتہ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کندھے پر لال رنگ کا صافہ تھا۔ سر پر ہندوانہ ٹوپی ٹیڑھی کر کے بھائی ہوئی تھی اور پان کھا رہا تھا۔ شکل اور طے سے وہ مجھے کچھ دوسری ٹائپ کا آدمی لگا۔ گنگا بائی نے اس آدمی سے کہا۔

”اس لڑکے کا شکریہ ادا کرو کاشی رام۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میری بچی مجھے نہیں مل سکتی تھی۔“

اس آدمی کا نام کاشی رام تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔
”بھائی جی آپ کا بڑا بڑا شکریہ۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ شکل سے آپ پنجابی لگتے ہیں۔“

میں نے انہیں بتایا کہ میں پنجابی ہوں اور راج گری میں یونہی سیر کرنے بیٹھی سے آیا ہوں۔

”ہندو ہو کہ مسلمان؟“

میں نے کہا۔

”میں مسلمان ہوں۔“

گنگا بائی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

”بھائی تم مسلمان بھی ہو تو میرے بھائی ہو۔ تم راج گری میں ہمارے گھر میں رہو گے۔ کاشی رام خود تمہیں شرکی سیر کرائے گا۔ آؤ ہمارے ساتھ۔“
مجھے پہلے ہی کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ میں نے فوراً کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“

میں ان لوگوں کے ساتھ شیشن سے باہر آ گیا۔ باہر گنگا بائی کو لینے ایک ٹانگہ آیا ہوا تھا۔ ہم ٹانگے میں بیٹھ کر گنگا بائی کے گھر کی طرف چل پڑے۔

راج گری اگر شر نہیں تھا تو چھوٹا قصبہ بھی نہیں تھا۔ کھیتوں میں جگہ جگہ حویلی نما مکان نظر آ رہے تھے۔ سڑک پختہ تھی۔ ایک کبھی سامنے لے آ کر گزر گئی۔ اس میں ایک موٹا لالہ سونے کی زنجیر گلے میں ڈالے بڑی شان سے چاندی کی موٹھ والی چھتری کھنٹوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ گنگا بائی نے اسے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا جس کا جواب لالہ جی نے تھوڑا سا مسکرا کر اور سر ہلا کر دیا۔ ہمارا ٹانگہ ایک ایسے بازار میں سے گزر رہا تھا جس کی دونوں جانب کھلے دالانوں والی پرانی حویلیاں تھیں۔

گنگا بائی کا مکان بھی حویلی نما تھا اور راج گری کے قصبے کے باہر ایک تالاب کے پاس تھا۔ تالاب خشک ہو چکا تھا اور اس میں سرکنڈے اگ رہے تھے۔ ٹانگہ مکان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ چوکیدار نے بیڑی ایک طرف پھینک کر گنگا بائی اور کاشی رام کو پرنام کیا اور جلدی سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا۔ مکان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ سارا مکان خالی ہے۔ ڈیوڑھی میں سے گزرنے کے بعد ایک چھوٹا دالان تھا۔ دالان کی تین جانب برآمدہ تھا۔ یہاں تین چار کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ دالان کے وسط میں ایک چبوترے میں تلسی کا پودا لگا ہوا تھا۔ چبوترے کی دیواروں پر چاروں طرف سوا سینکا کے کیسری رنگ کے نشان بنے تھے۔ گنگا بائی نے کاشی رام سے کہا۔

”کاشی رام! تم دستخی کو شیلہ کے پاس لے جاؤ۔ میں بھائی کو اس کا کمرے دکھا دوں۔“

کاشی رام بچی دستخی کو لے کر دوسری طرف چل دیا۔ گنگا بائی مجھے لے کر ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اسے کمرہ سمجھ رہا تھا۔ مگر وہ ایک راہ داری تھی جو آگے ایک بڑے کمرے میں جاتی تھی۔ اس بڑے کمرے میں چاندی کا فرش بچھا تھا۔ گاؤں تھکنے لگے تھے۔ اگلا دن پڑے تھے۔ دیواروں پر کسی عورت کے ڈانس کے پوز کی تصویریں لگی تھیں۔ کونے میں ایک ہارمونیم، ٹائپو رائٹر اور طبلے کی جوڑی رکھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ گنگا بائی ناپتے گانے والے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے تو کوئی ایسا ٹھکانہ چاہئے تھا جہاں رات کو میں آکر سو سکوں اور دن کے وقت چند رکھی کو تلاش کروں۔ اگرچہ مجھے ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں چند رکھی کی تلاش کہاں سے شروع کروں گا۔

لا۔

”سنا ہے یہاں کے جاگیردار لوگوں کو شکار کا بھی بہت شوق ہے۔ کیا یہاں جھل بھی ہیں؟“

میرا مقصد شکاری رانا کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ کاشی رام بلا۔

”سب کو نہیں کچھ لوگوں کو شکار کا شوق ضرور ہے۔ یہاں رانا ذات کے دو بن آدمی شکار کھیلتے ہیں۔ مگر وہ عام طور پر شکار کھیلنے بمبئی کے پاس جنگلوں میں جاتے ہیں۔“

مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس شکاری رانا کا نام کیا ہے جس کے آدمیوں نے چند رکھی کو اغواء کیا ہے۔ اس لئے مزید کچھ پوچھنے کی گنجائش نہیں تھی۔

رات کے وقت گنگا بائی کے ہاں مجھے کی محفل لگی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے بڑے کمرے سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ طلبہ نج رہا تھا۔ ٹھکرو بھی چھٹک رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ محفل جی رہی۔ میں بستر پر لیٹا شیلا کے گانے کی آواز سنتا رہا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد کسی آدمی کے اونچی اونچی دنگے کی آواز آنے لگی۔ گنگا بائی اور کاشی رام کی اونچی اونچی آوازیں بھی آنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ میں کان لگا کر سنتا رہا۔ آوازیں ضرور آرہی تھیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد آوازیں ختم گئیں اور ایک بار پھر مجرا شروع ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد گانا بجانا ختم ہو گیا۔ دھول کے باہر ایک تانگے یا بگھی کے جانے کی آواز آئی اور خاموشی چھا گئی۔ اب گنگا بائی اور کاشی رام کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گنگا بائی کسی کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

یونہی میرے دل میں خیال آیا کہ سنتا چاہئے، یہ کس کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔ میں کمرے سے نکل کر راہ داری میں بڑے کمرے کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں اندھرا تھا۔ بڑے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے ایک دروازے سے دیکھا۔ سازندے ساز وغیرہ سنبھال رہے تھے۔ گنگا بائی گاؤں تکتے کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ کاشی رام سامنے بیٹھا تھا۔ گنگا بائی کہہ رہی تھی۔

”رانا ہو گا تو اپنے گھر ہو گا۔ آخر ہم لوگوں کو بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔“

گنگا بائی مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آئی جو بڑے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ یہاں ایک پرانے پتنگ پر بستر لگا تھا۔ دو پرانی کرسیاں پڑی تھیں۔ چھت کے ساتھ پنکھا لگا تھا۔ گنگا بائی بڑی مروت کے ساتھ بولی۔

”بھائی ہم امیر لوگ نہیں ہیں۔ ہمارے پاس یہی کچھ ہے۔ اسے قبول کرو۔ تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو میں شاید کبھی نہ چکا سکوں لیکن مجھ سے جو خدمت ہو سکی کروں گی۔ غسل خانہ ساتھ ہی ہے۔ تم منہ ہاتھ دھو کر آرام کرو۔ دوسرے کو کھانا ہم ساتھ کھائیں گے۔“

گنگا بائی چلی گئی تو میں نے منہ ہاتھ دھویا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سوچنے لگا کہ راج گری میں تو آگیا ہوں اب یہاں شکاری رانا کا کیسے پتہ چلایا جائے۔ اس شہر نما قصبے کے مکان اور حویلیاں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں واقعی ٹھاکروں اور پٹیل اور رانا ذات کے جاگیرداروں کی زمینداریاں ہیں۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دوسرے کے بعد باہر نکل کر شکاری رانا کا سراغ لگانے کی کوشش کروں گا۔ گنگا بائی سے اس لئے نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے کہا تھا کہ میں راج گری کی سیر کرنے آیا ہوں۔ شکاری رانا کی بابت اس کو خواہ مخواہ شک پڑ جائے گا کہ میں یہ سب کچھ کس لئے پوچھ رہا ہوں۔ بستر پر لیٹے لیٹے مجھے نیند آگئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب ایک ملازم لڑکا میرا کندھا ہلا کر جگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”صاحب۔ اٹھو، بائی جی بلا رہی ہیں۔ کھانا لگا دیا ہے۔“

دوسرے کمرے میں کھانا لگا تھا۔ کاشی رام، وسنتی اور گنگا بائی کے علاوہ وہاں ایک نوجوان خوش شکل لڑکی بھی تھی جس نے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گنگا بائی نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ یہ شیلا تھی جو گنگا بائی کی بڑی بیٹی تھی۔ یہاں یہ راز بھی کھل گیا کہ یہ تانپنے گانے والی عورتیں اور رنگ آباد ضلع کی رہنے والی ہیں۔ راج گری میں آباد ہو کر ایک عرصے سے یہی دھندا کر رہی ہیں۔ یہاں آنے کی وجہ راج گری کے امیر جاگیردار پٹیل اور رانا تھے جو ان کا مجرا سننے اور روپیہ لٹاتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد کاشی رام مجھے اپنے تانگے میں بٹھا کر راج گری قصبے کی سیر کرانے لے گیا۔ قصبے کے باہر دور دور تک پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ مغلوں اور مرہٹوں کے زمانے کے کئی ایک کھنڈر بھی دیکھے۔ میں نے راستے میں کاشی رام سے

اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔“
کاشی رام کہنے لگا۔

”گنگا بائی ہمیں یہاں رہتا ہے۔ ان لوگوں سے بگاڑ کر تو نہیں رہ سکتے۔“
گنگا بائی نے غصے میں جواب دیا۔

”مگر ان لوگوں کی جوتیاں بھی تو نہیں اٹھا سکتے۔ میں آج شہر کے تھانے جا کر بتا دوں کہ اس رانا بکرم نے گھر میں ایک شریف عورت کو اغوا کر کے ڈال دیا ہے تو اسے ثانی یاد آ جائے گی۔“

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جس رانا کی مجھے تلاش تھی وہ مجھے مل گیا تو یقیناً یہی بکرم نام کا وہ رانا تھا جس نے چند رکھی کو اغوا کر لیا تھا۔ میں مزید غور کرنے لگا۔ مگر اس کے بعد گنگا بائی رانا کو گالیاں ہی دیتی رہی۔ اس کے بارے میں مزید کوئی معلومات نہ حاصل ہو سکیں کہ یہ رانا بکرم کہاں رہتا ہے اور کہاں سے ہے۔ میں دبے پاؤں چل کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ رانا بکرم کا کہاں سے پتہ چلانا چاہئے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں گنگا بائی کو ساری بات بتا دوں۔ وہ اپنا دشمن بھی سمجھتی ہے۔ اس کے سخت خلاف بھی ہے۔ ضرور میری مدد کرے گی۔ مجھے روشنی کی کرن نظر آ گئی تھی۔ اس کے بعد میں اطمینان سے سو گیا۔

دوسرے روز میں نے موقع پا کر گنگا بائی کو ساری بات بیان کر دی اور اسے دیا کہ میں اسی عورت چند رکھی کی تلاش میں راج گری آیا ہوں جسے رانا کے بی بی کے جنگل سے اغواء کر کے لے آئے ہیں۔ گنگا بائی میری بات غور سے نہی رہی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ چند رکھی ایک ایٹور بھگت قسم کی پارسا عورت ہے تو اس نے رانا کو میرے سامنے دو تین گالیاں دیں اور کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ میں آج ہی پتہ کرواتی ہوں کہ اس بد معاش رانا نے رکھی کو کہاں رکھا ہوا ہے۔“
میں نے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کاشی رام کو بھی یہ سب کچھ بتا دیں گی؟“
مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ رانا کو جا کر نہ بتا دے۔ گنگا بائی کہنے لگی۔
”کاشی رام میرا خاص اور بڑے بھروسے کا آدمی ہے۔ تم اس کی طرف سے بے فکر رہو۔ بلکہ وہی چند رکھی کا سراغ لگائے گا۔“
تھوڑی دیر وہ کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

”تم دیکھ لیتا۔ اس رانا بکرم کو رام بھجینی کا سراپ لگے گا۔ یہ کوڑھی ہو کر رہے گا۔“

یہ میرے حق میں بڑی اچھی بات تھی کہ گنگا بائی رانا کے سخت خلاف تھی۔ یہ صرف ایک تجسس باقی تھا کہ رانا بکرم نے جس عورت کو اغواء کر لیا ہے وہ کون سی ہے؟ میں نے گنگا بائی سے کہا۔
”بائی جی! آپ یہ ضرور معلوم کریں کہ اس عورت کا نام چند رکھی ہے یا نہیں اور ہے؟“

گنگا بائی بولی۔
”تم فکر ہی نہ کرو۔ میں سب کچھ معلوم کر لوں گی۔ میرے پاس بڑے

کلکتے کی طرف جاتی ہے۔ میرے آدمی چند رکھی کو آدھی رات کے وقت نکال کر لے آئیں گے۔ تمہیں اسی وقت اسے لے کر کولہا پور والی کلکتہ ایکسپریس پکڑنی ہوگی۔ کاشی رام شیشین پر تمہارے ٹکٹ زبرد کر موجود ہوگا۔ بس مجھے صرف دو دن کی ملت دے دو۔“

گنگا بائی واقعی بڑی دلیر عورت تھی۔ ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اس دوران گنگا بائی گھر پر بہت تھوڑے وقت کے لئے آتی اور پھر چلی جاتی۔ کاشی رام بھی اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دوسرے دن شام کو دونوں آئے تو گنگا بائی مجھے بڑی رازداری سے اپنے کمرے میں لے گئی۔ کہنے لگی۔

”سب کام ٹھیک ہو گیا ہے۔ میرے آدمی آج رات کو چند رکھی کو رانا کی بیٹی والی کوٹھی سے نکال کر یہاں لے آئیں گے۔ یہاں سے تم اسے اپنے ساتھ لے کر شیشین چلے جاؤ گے جہاں کاشی رام پہلے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہاں سے تو میں تم دونوں کو اپنی حفاظت میں نکلا دوں گی۔ آگے کے تم ڈسے وار ہو گے ٹھیک ہے؟“

میں نے کہا۔

”میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں گنگا بائی۔“

گنگا بائی نے سگریٹ سلا کر ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ میں عورت ذات ہوں۔ عورت کے دکھ درد کو اچھی طرح محسوس کر سکتی ہوں۔“

اس نے کاشی رام سے کہا۔

”کاشی رام! تم دو ٹکٹ لے رکھنا۔“

کاشی رام نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

”ٹکٹ کون سے شہر کے لینے ہوں گے؟ گاڑی تو سیدھی کلکتے جائے گی۔“

گنگا بائی نے پوچھا۔

”چند رکھی کا گھر بار کہاں ہے؟ تم نے مجھے یہ بالکل نہیں بتایا۔“

میں نے کہا۔

”مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ کیرواڑی میں اپنے برہمن ماما پتا کے گھر رہتی تھی۔ اب معلوم نہیں یہ کیرواڑی کہاں پر ہے۔“

جاسوس ہیں۔“

اس نے کاشی رام کو بھی ساری بات بتا دی اور دونوں تانگے میں بیٹھ کر گھر سے نکل گئے۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ واپس آئے۔ آتے ہی گنگا بائی اور کاشی رام میرے کمرے میں آگئے۔ گنگا بائی نے کہا۔

”اس عورت کا نام چند رکھی ہی ہے اور وہ بڑی ستی ساوتری عورت ہے۔ رانا نے اسے یہاں سے کچھ دور اپنی بیٹی کی کوٹھی میں بند کر رکھا ہے۔ وہاں پرے دار ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ میرے جاسوس نے بتایا ہے کہ چند رکھی ہر وقت دھیان میں مشغول رہتی ہے مگر رانا اس پر برا ظلم کرتا ہے۔ رات شراب پی کر اسے مارتا بھی ہے۔“

میرے دل پر اس بات کا شدید اثر ہوا۔ چند رکھی تو نازک پھول کی طرح ہے۔ میرا جی چاہا کہ ابھی جا کر رانا کو گولی سے اڑا دوں۔ میں نے گنگا بائی سے کہا۔

”بائی جی! جس طرح بھی ہو چند رکھی کو اس بد معاش کے چنگل سے نکالیں میری مدد کریں۔ میں آپ کا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا۔“

گنگا بائی کہنے لگی۔

”تم نے میری بیٹی مجھے واپس دلا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو شاید نہ چکا سکوں لیکن یہ تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ چند رکھی کو اس راکشش قبضے سے نکال کر تمہارے حوالے ضرور کر دوں گی۔“

کاشی رام خاموشی سے سگریٹ پیتے ہوئے ہمارے باتیں سن رہا تھا۔ کہنے لگا

”اس معاملے میں ہمیں فوراً آگے نہیں آنا چاہئے۔ سارا کام کسی دوسرے ذریعے سے کروانا ہوگا۔“

گنگا بائی نے کہا۔

”کاشی رام تم کیوں گھبرا رہے ہو۔ رانا کوئی ہمارا بھگوان نہیں ہے لیکن جو کچھ کہنا چاہتے ہو وہ میں بھی خوب سمجھتی ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک جائے گا۔“

وہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”ہمیں سارا کام آدھی رات کے وقت کرنا ہوگا۔ کیونکہ رات کے دو کولہا پور سے ایک ٹرین راج گری آتی ہے۔ جو مالگاؤں اور جبل پور سے ہوتی

”ان لوگوں کو اب تک آ جانا چاہئے تھا۔“

ہم گنگا بانی کے کمرے میں ہی بیٹھے تھے۔ وہ باہر نکل گئی۔ دو تین منٹ بعد
اپس آ گئی۔ چہرے پر فکر مندی کے اثرات تھے۔ سگریٹ کے ساتھ دوسرا سگریٹ
ہانے کے بعد بولی۔

”کیس کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ میرے آدمی بڑے
وشیار ہیں۔“

اس کے آدمی واقعی بڑے ہوشیار تھے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد گنگا بانی کا
چکیدار بھاگا بھاگا اندر آیا اور بولا۔

”بانی جی وہ لوگ آ گئے ہیں۔“

گنگا بانی اٹھ کھڑی ہوئی۔ چکیدار سے کہا۔

”تاکہ نہیں لائے؟“

”جی وہ پیدل ہی آئے ہیں۔ عورت بھی ان کے ساتھ ہے۔“

گنگا بانی نے اپنے پرس میں سے دس دس روپے کے تین نوٹ نکال کر مجھے
دے دیے اور کہا۔

”یہ اپنے پاس رکھو۔ راستے میں ضرورت پڑے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔“

میں نے نوٹ جیب میں رکھے اور گنگا بانی کے ساتھ حویلی سے باہر آ گیا۔
رات خاموش اور تاریک تھی۔ مجھے دو آدمی برآمدے کے ستون کے پاس کھڑے نظر
آئے۔ انہوں نے سر چادروں میں لپیٹ رکھے تھے۔ ایک عورت بھی ان کے ساتھ
ہادر لیٹے کھڑی تھی۔ میں نے اس کے قد بت سے اندھیرے میں بھی اسے پہچان لیا۔
چند رکھی ہی تھی۔ ہم ان کے پاس آ گئے۔ میں چند رکھی کے قریب گیا تو ستاروں
کی چمکی سی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ ایسا لگا جیسے وہ بت بیمار ہے۔ میری سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں۔ اس سے کیا بات کروں۔ اسی دوران گنگا بانی
نے اپنے آدمیوں سے پوچھا۔

”سواری کہاں چھوڑ آئے ہو؟“

ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔

”تلیا کی دوسری طرف تاکہ کھڑا ہے۔“

”سارا کام ٹھیک ہو گیا تھا؟“

گنگا بانی نے کاشی رام کی طرف دیکھا۔ کاشی رام بولا۔

”میرا خیال ہے کہ جبل پور کے پاس اس ٹام کاریلوے سٹیشن ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ گنگا بانی بولی۔ ”کیسرواڑی تمہارے راستے میں ہی آئے گا۔“
میں نے پوچھا۔

”جو دو چکیدار پہرہ دیتے ہیں کیس وہ شور تو نہیں مچا دیں گے؟“

گنگا بانی نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”انہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑیں گے کہ وہ شور مچا سکیں۔ یہ بات تم مجھ

پر چھوڑ دو۔ میں نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ اگر وہاں بد معاش رانا بھی ہوا تو

چکیداروں کے ساتھ وہ بھی بے ہوش پڑا ہوگا۔“

تب میں نے گنگا بانی سے کہا۔

”میرا خیال ہے جبل پور تک کے دو ٹکٹ لے لیتے ہیں۔ مگر میرے پاس

اتنے پیسے نہیں ہوں گے۔“

گنگا بانی نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

”پیسوں کی تم فکر نہ کرو۔ میرے پاس بھی تمہارے ہی پیسے ہیں۔“

یہ ڈراما رات کو شروع ہونے والا تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال

اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ کیس کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ یہ لوگ

رانا اور اس کے چکیداروں کو بے ہوش کر کے وہاں سے چند رکھی کو نکالنے والے

تھے۔ لیکن اگر وہ ہوش میں آ گئے تو کیا ہوگا؟ رانا یہاں کا بااثر جاگیردار ہے۔ ا

کے آدمی تو بندوقیں لے کر سٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔ میں دیر تک انہی خیالات

الجھا رہا۔ رات کو کھانا کھانے کو بھی جی نہ چاہا۔ گنگا بانی اور کاشی رام بھی میرے

ساتھ ہی جاگ رہے تھے۔ اس رات گنگا بانی نے شیلہ کی بیماری کا بہانہ بنا کر مجرا

نہیں کرایا تھا۔

رات کے گیارہ بجے کاشی رام یہ کہہ کر نکل گیا کہ میں سٹیشن پر جاتا ہوں

اس کے بعد میں اور گنگا بانی بیٹھے جاگتے رہے۔ شیلہ بھی دستی کو لے کر سو گئی

صرف چکیدار حویلی کے باہر موجود تھا۔ گنگا بانی نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہوا تھا

رات کے گیارہ بج گئے۔ پھر ایک بج گیا تو گنگا بانی کچھ پریشان سی ہو کر

اور بولی۔

”سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب آپ اپنی امانت سنبھالیں اور ہمیں جانے دیں۔“

گنگا بائی نے پہلے ہی سے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھ لئے تھے۔ اس نے نوٹ اس آدمی کو دیئے اور کہا۔

دو دنوں آدمی کوئی بات کئے بغیر ایک طرف تیز تیز قدم اٹھاتے چل دیئے اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ گنگا بائی نے مجھ سے کہا۔

میں نے کہا۔

گنگا بائی نے چند رکھی کو ہاتھ باندھ کر کہا۔

”آپ ایثار کی بھگتی ہیں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔“

بلا کر کہا۔

”ہمارے مہمانوں کو جتنی جلدی ہو سکے شیشن پر پہنچا دو۔ تا نگہ تلیا کی پچھل

طرف کھڑا ہے۔“

”ٹھیک ہے بائی جی۔“

میں گنگا بائی کا شکریہ ادا کرنے لگا تو وہ بولی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔ اب یہاں سے نکل چلو۔“

میں نے چند رکھی کو ساتھ لیا اور چوکیدار کے پیچھے چل پڑا۔ سوکھی تلپائی دوسری جانب درختوں اور جھاڑیوں کے پاس ایک ٹانگہ کھڑا تھا۔ چوکیدار بائیں سنبھال کر آگے بیٹھ گیا۔ میں اور چند رکھی ٹانگے کے پیچھے بیٹھ گئے اور ٹانگہ شیش کی طرف روانہ ہو گیا۔

پکی سڑک پر آتے ہی تانکہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ چند رکھی میرے ساتھ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی۔ ہم ٹھیک وقت پر شیشن پہنچ گئے۔ کاشی رام پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ شیشن کے باہر ہی کھڑا تھا۔ ہمیں تانکے سے اترتے دیکھا تو ہمارے پاس آگیا۔ مجھے دو ٹکٹ دے کر بولا۔

”میں اگلے روز تمہاری جھونپڑی میں گیا تو تم وہاں نہیں تھیں۔ میں نے بہت تلاش کیا۔ تم نہ ملیں تو دل اداس ہو گیا۔ پھر بمبئی میں میرا دل نہ لگا۔ میں تمہاری تلاش میں راج گری آ گیا۔“

چند رکھی نظریں نیچی کئے پلٹ فارم کے فرش کو تک رہی تھی۔ اس نے آگے سے کچھ نہ کہا۔ میں بولتا گیا۔

”راتا کے آدمیوں کی زبانی میں نے راج گری کا نام سن رکھا تھا۔ یہاں آیا تو گنگا بائی مل گئی۔ بڑی درد دل رکھنے والی عورت ہے۔ اس نے میری بڑی مدد کی۔ اگر یہ مدد نہ کرتی تو میں تمہیں جس میں راتا کی قید سے نہیں چھڑا سکتا تھا.....“

میں خاموش ہوا تو ایک بار پھر وہی خاموشی طاری ہو گئی۔ آخر میں نے بیجا بھڑک کر پوچھا۔

”چند رکھی جی! تم ٹھیک ہو ناں؟“

چند لمبی نے اثبات میں سر ہلایا۔ جیسے کہ رہی ہو۔ میں ٹھیک ہوں۔ اس

ایک پاکباز پارسا غورت تھی۔ وہ ایک بد معاش کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ اس پر اس صدمے کا زبردست اثر ہوا ہے۔ میں اسے خود اس کے گھر چھوڑ کر آؤں گا۔ دو تین دنوں میں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ چند رکھی کو اس کے گھر چھوڑ آنے کے بعد میں کیا کروں گا؟ کہاں جاؤں گا؟ میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا؟ اس کی شکل نظر نہیں آئے گی تو اسے کہاں تلاش کروں گا؟

اسی لمحے میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں بھی چند رکھی کے ساتھ ہی رہوں گا۔ اس کے گھر میں نوکر بن کر رہ لوں گا۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو کیسرواڑی میں چند رکھی کے شہر میں کسی جگہ نوکری کر لوں گا۔ اس طرح کم از کم اس کے دیدار سے تو محروم نہیں ہوں گا۔

ٹرین بڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ ڈبے کے اکثر مسافر سو رہے تھے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ میں اتر کر چند رکھی کے پاس گیا۔ وہ اسی طرح چپ چاپ سی بیٹھی تھی۔ میں نے جیب سے ایک ٹکٹ نکال کر اس کو دیا اور کہا۔

”یہ جبل پور تک کا ٹکٹ ہے۔ اسے اپنے پاس رکھنا۔ چائے پانی کی ضرورت تو نہیں؟“

چند رکھی کے چہرے پر ایک کریناک تاثر ابھر آیا۔ اس نے ٹکٹ کی باندھ کر ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا۔ پھر بڑی کمزور آواز میں کہا۔

”نہیں۔“

انجن نے وسل دیا۔ میں نے کہا۔

”میں اگلے اسٹیشن پر آؤں گا۔“

جب میرا ڈبہ آیا تو میں دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی ٹرین نے سپیڈ بڑی۔ میں چند رکھی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ میں نے اپنا سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ پچھلی رات کے اندھیرے میں باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا۔ سر نیچے گرنے لگا تو ایک دم جاگ پڑا۔ نیند کا زبردست غلبہ تھا۔ میں نے وہیں تھوڑی سی جگہ بنالی اور سمٹ سمٹا کر سو گیا۔

دوران کچھ مسافر پلیٹ فارم پر نمودار ہو چکے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے اندر سے ایک آدمی باہر نکلا۔ دیوار کے ساتھ ریلوے لائن کا ایک ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ اس نے اسے دو تین بار بجا کر اعلان کیا کہ ٹرین آنے والی ہے۔ چند رکھی بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی تھی۔ مجھے خیال آنے لگا کہ اس صدمے سے کہیں اس کی قوت گویائی تو ختم نہیں ہو گئی۔

اتنے میں زور سے ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ چار چھ مسافر جو پلیٹ فارم پر بیٹھے تھے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے چند رکھی سے کہا۔

”گاڑی آگئی ہے۔“

پھر میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس جبل پور تک کے دو ٹکٹ ہیں۔ اگر وہ اپنے آبائی گھر واپس جانا چاہتی ہے تو کیسرواڑی جبل پور کے راستے میں ہی آتا ہے۔ اس پر بھی چند رکھی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب ٹرین کے انجن کی روشنی پلیٹ فارم پر پڑنے لگی تھی۔ پھر ٹرین شور مچاتی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ میں نے چند رکھی سے کہا۔

”کیا یہاں سے چلو گی نہیں؟“

چند رکھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ٹرین میں زیادہ رش نہیں تھا۔ عورتوں کے ڈبے میں چند ایک عورتیں تھیں جن میں سے اکثر سو رہی تھیں۔ میں نے چند رکھی کو زنانہ ڈبے میں سوار کرایا اور کہا۔

”میں ہر اسٹیشن پر جہاں گاڑی کھڑی ہوگی آکر تمہیں دیکھ جایا کروں گا۔“

ٹرین راج گری کے اسٹیشن پر زیادہ دیر نہ رکی۔ دوسرے لمحے انجن نے وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور ٹرین کھسکے لگی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ زنانہ ڈبہ گزر گیا۔ اس کے ساتھ والے دو ڈبے بھی گزر گئے۔ ان ڈبوں میں بڑا رش تھا۔ میں تیسرے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ ٹرین راج گری کے اسٹیشن سے نکل گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں چند رکھی کو بد معاشوں کی قید سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کھڑکی کے پاس تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ رات کے پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ چند رکھی

عورت نے کہا۔

”اندھیرا تھا ابھی۔ پتہ نہیں کون سا شیش تھا۔“

پھر وہ ایک چائے والے لڑکے کو آوازیں دینے لگی۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے ڈبے کی طرف چلا۔ دل میں ایک طوفان سا بچ گیا تھا۔ چند رکھی اچانک ٹرین سے کیوں اتر گئی؟ وہ کہاں گئی ہوگی؟ وہ کیوں چلی گئی؟ اپنے ڈبے تک آتے آتے میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں اپنے ڈبے کے ہاتھ روم میں گھس گیا۔ دروازہ بند کیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آنسو کیا بنے تھے، میں بچوں کی طرح رونے لگا۔ مجھے معلوم تھا اب چند رکھی سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ پھر کبھی وہ کنول پھول ایسا چہرہ نظر نہیں آئے گا۔

کسی نے باہر سے دروازے پر دو تین ہاتھ مارے۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھے۔ رومال کو پانی سے گیلیا کیا اور اپنا منہ پونچھتا ہوا باہر آ گیا۔ کھل کر رونے سے دل کا غبار کافی ہلکا ہو گیا تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ اب کیا کروں؟ کس کے لئے جبل پور جاؤں گا؟ چند رکھی نے تو میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ تو مجھ سے بچھڑ گئی۔ نہ جانے رات کے پچھلے پہر کس ویران شیش پر اتر گئی۔ وہ تو جنگل کی دیوی تھی۔ جنگل نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ہو گا۔ میری آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چھلکنے لگے۔ میں نے چہرہ کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ پلیٹ فارم پر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آنسوؤں کو روکا۔ کاش میں انسانوں سے دور کسی جنگل میں ہوتا۔ پھر وہاں کسی درخت کے ساتھ لگ کر خوب روتا۔ میرا حال اس بچے کی طرح تھا جس کا رنگین غبارہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہو اور وہ اسے آسمان کی دستوں میں جاتا حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو۔

مجھے انجن کی چیخ نے چونکا دیا۔

ٹرین چل پڑی تھی۔ پھر ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی۔ مجھے اب سفر بے مقصد لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی آگے شیش پر اتر جاتا ہوں یا کسی جنگل میں ٹرین کھڑی ہوگی تو وہاں اتر جاتا ہوں۔ میں جبل پور جا کر کیا کروں گا۔ میرے لئے اب ہر شیش ایک جیسا تھا۔ اجنبی اداس اور بے حروت۔ ٹرین خدا جانے شہر کے مکانات سے گزر رہی تھی یا کھیتوں میں سے گزر رہی تھی یا پہاڑی علاقے میں سے

جس وقت آنکھ کھلی باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ڈبے کے دوسرے مسافر بھی جاگ پڑے تھے۔ ٹرین پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے ایک مسافر سے پوچھا۔

”پیچھے کون سا شیش تھا؟“

میرا مطلب تھا کہ رات تین بجے کے بعد ٹرین صبح ہونے تک پیچھے نکلے شیش چھوڑ آئی تھی۔ مسافر بولا۔

”میںڑھا پور نکل گیا ہے۔ اب بیدر کا شیش آنے والا ہے۔“

بیدر حیدر آباد دکن کا شہر تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ٹرین شولا پور بھی پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ میں نے چند رکھی کا حال نہیں پوچھا تھا۔ پتہ نہیں اس نے ناشتہ بھی کیا ہو گا کہ نہیں۔ میں بے چینی سے ٹرین کے رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی آدمی کھٹنے بعد ٹرین کی رفتار ہلکی ہوئی شروع ہوئی۔ بیدر شہر کا شیش آ رہا تھا۔ یہ کوئی بڑا شہر تھا۔ کافی بڑا جنگل تھا۔ ٹرین رکی تو میں ڈبے سے اتر کر بھاگتا ہوا چند رکھی کے ڈبے کی طرف گیا۔ چند رکھی اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ ہاتھ روم میں گئی ہوگی۔ میں ڈبے کے باہر ہی کھڑا ہو کر بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب تین چار منٹ گزر گئے تو میں نے ساتھ والی کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی عورت سے پوچھا کہ یہاں جو عورت بیٹھی تھی کیا وہ ہاتھ روم میں گئی ہے؟ اس پر عورت نے میری طرف تعجب بھری نگاہ ڈالی اور بولی۔

”وہ تو صبح سویرے ہی ایک شیش پر اتر گئی تھی۔“

مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ میں عورت کا منہ دیکھا رہ گیا۔ وہ بولی۔

”کیا تم اس کے مرد ہو؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور بڑی مشکل سے کہا۔

”نہیں۔ میں --- وہ کون سے شیش پر اتر گئی تھی؟“

سندروں کی تیز بارشوں میں بھیگتے استوائی جزیرے اور پونھوار کی ہری بھری دھریوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے خوشبودار کاسنی پھول، شام کے اداس لمحوں میں بچل کے ریسٹورانوں میں گونجتے رابندر سنگیت کے دردناک گیت اور کوہ مری کی مال روڈ پر گرتی برف میں ارل گرے چائے اور ایران مور تمباکو کی گرم خوشبو۔۔۔۔۔ یہ سب میری محبتوں کے آسمانوں کے بکھرے ہوئے ستارے ہیں۔ یہی میری زندگی ہے۔ یہی میرا ماضی، حال اور مستقبل ہے۔ یہی میرا کیریئر ہے۔ اسی میں میرا سب کچھ ہے۔ اگر میں ان کے اندر ہوں تو سب کچھ ہوں، اگر باہر ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔

ٹرین ایک اور دریا کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ دریا مجھے دیکھ رہا تھا، جیسے کہہ رہا تھا۔ مجھے وہاں ملنا جہاں میں سمندر میں گرنا ہوں۔ دریا پیچھے رہ گیا۔ کوئی اور شہر آ رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں یہ کونسا شہر تھا۔ ٹرین رک گئی۔ کافی بڑا شیشن تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اتر کر ٹھلنے لگا۔ سمندر مجھے بلا رہا تھا۔ میں واپس اپنے شہر امرتسر نہیں جانا چاہتا تھا۔ یہ شہر شبانہ سے خالی تھا۔ اس کا گلی والا مکان شبانہ سے خالی تھا۔ یہ شہر میری سوگوار یادوں کا بابل و نیوا تھا۔ اس کے گلی کوچوں میں اس کی نہروں اور اس کے باغوں میں میری ناکام محبت کے کھنڈر زمین بوس تھے۔ میں کیسے امرتسر واپس جاسکتا تھا۔

ٹرین چلی تو میں نے ایک مسافر سے پوچھا۔

”آگے کونسا بڑا شہر ہے؟“

”جبل پور۔۔۔“

”اس کے آگے؟“

”اس کے آگے تو بڑا شہر کلکتہ ہی ہے۔“

ٹھیک ہے میں نے اپنے دل سے کہا۔ کلکتہ چلو۔

گاڑی جبل پور پہنچی تو میں نے وہاں سے کلکتے کا ٹکٹ بنا لیا۔ اور اسی گاڑی میں سوار ہو کر کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کلکتہ وہاں سے کافی دور تھا۔ سارا دن اور ساری رات گاڑی سنا کر کرتی رہی۔ دوسرے دن صبح کے وقت گاڑی کلکتے کے ہوٹل شیشن پر جا کر رکی۔ جیسا کہ میں اپنی داستان بیان کرتے ہوئے شروع میں لکھ چکا ہوں کلکتہ میرے لئے کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ یہاں امرتسر کے شال مرچنٹ، روتگر اور ٹپ گر کشمیریوں کا شروع ہی سے کاروبار رہا تھا۔ ہماری فیملی کے کچھ لوگ

گزر رہی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کھڑکی کے باہر ضرور دیکھ رہا تھا مگر مجھے سوائے چند رکبھی کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبھی میں اسے دیکھتا کہ وہ زرد لباس پہنے ایک ہاتھ میں کرمڈل اور دوسرے ہاتھ میں گیندے کے پھول لئے جھاڑیوں میں سے گزرتی چلی آ رہی ہے۔ کبھی وہ مجھے اپنی گپھا میں آنکھیں بند کئے بیٹھی نظر آتی۔ اس کا چہرہ گیندے کے پھول کی طرح سنہری اور شکفتہ لگتا۔ کبھی مجھے اس کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دیتی۔ جیسے ہوا مولسری کی پھولوں سے بھری ہوئی شاخوں میں سے گزر رہی ہو۔ ایک بار دل نے کہا۔ کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دوں۔ کوئی دریا آئے تو چلتی ٹرین میں سے چھلانگ لگا دوں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم خود ایک دریا کی لہر ہو۔ دریا کی لہر دریا میں مل جائے گی۔ جب ٹرین ایک دریا پر سے گزرنے لگی تو میں چھلانگ نہ لگا سکا۔ ڈر گیا ابھی مجھے زندہ رہنا تھا۔ ابھی کئی برائیاں کرنی تھیں۔ ہزاروں ملال اور پچھتاوے زندگی کی شاہراہ پر کھڑے میری راہ دیکھ رہے تھے۔ اہم نہ جانے کتنے ایسے چہروں کو دیکھنا تھا جن کو دیکھنے کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ ابھی زندگی کے ماہ و سال کی کھیتی میں کئی کانٹے بونے تھے اور ان کی فصل کاٹ تھی۔ کئی صدے اٹھانے تھے۔ کئی دکھ جھیلنے تھے۔ ہزاروں خوشیوں سے اپنا دامن بھی بھرتا تھا اور لاکھوں غموں کا بوجھ بھی اٹھاتا تھا۔ عرقید کی زنجیر پاؤں میں باندھا ابھی کئی وادیوں، بازاروں، گلی کوچوں، چمن زاروں اور پتے صحراؤں سے گزرتا تھا ابھی میرے دامن پر کئی داغ کٹنے تھے اور مجھے وقت کے دریا پر بیٹھ کر ان داغوں زندگی کے آخری لمحات تک دھوتے رہنا تھا۔

ٹرین شور چاتی دریا کے پل پر سے گزر گئی۔

اب میں قدرے صاف ذہن کے ساتھ سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کہاں جانا چاہیے۔ میں نے اس وقت تک اپنی زندگی کا مقصد متعین نہیں کیا تھا جو عمر میں متعین کر دیا جاتا ہے یا ماں باپ مل کر کر دیتے ہیں۔ میں قدرت کے حشر مر رہا تھا۔ خوبصورت اداس خاموش مسکراتی عورتوں کے چہرے، بارش میں، باغ، سمیری راتوں کی تاریکی میں سوئے ہوئے بیباک جنگل، ان جنگلوں کے برگ درخت، ان درختوں کے اندر سفر کرتی خوشبوئیں، نازک نازک سنہری کوٹ، سردیوں کی کمر آلود جھکوں میں دھند میں ڈوبے شہروں کے باغ، گرم نیلے آسمان اڑتے ہوئے سفید، سبز اور سرخ پرندے اور پارکوں میں کھیلتے بچے اور

سال شالیں وغیرہ لے کر کلکتے جایا کرتے تھے۔ یہ لوگ کلکتے میں چھ ماہ رہتے۔ اس کے بعد امرتسر واپس آ جاتے۔ آتی دفعہ کلکتے کے کالے سلپر اور چار خانہ دھوئیاں ضرور ساتھ لاتے۔ بچپن میں میں کالے سلپر اور چار خانہ دھوتی پہنا کرتا تھا۔ سردیوں میں اوپر گرم شال لے لیتا۔ گرم کوٹ پہننے کی نوبت کبھی کبھار ہی آتی تھی۔ کشمیری گرم شالیں ہمارے گھر میں ادھر ادھر پڑی رہتی تھیں۔ کمروں میں درری کے اوپر جازم بچھتی تھی اور سردیوں میں چارپائیوں پر گدیوں کی دیگر گرم دریاں بچھائی جاتی تھیں۔ یہ گرم دریاں شالوں کی لمبی کٹڑوں سے بنی جاتی تھیں اور صرف امرتسر کے رفوگر ٹپ گر اور شال مرچنٹ کشمیریوں کے گھروں میں ہی ہوتی تھیں۔ امرتسر میں ان دنوں بڑی شدید سردی پڑتی تھی۔ بارش ہوتی تو کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے ساوار میں سبز چائے پیتی۔ کبھی قہوہ بنایا جاتا اور کھنڈ قلیوں اور نمکین قلیوں کے ساتھ پیا جاتا۔ اب نہ وہ کھنڈ قلیے اور نمکین قلیے کیسے نظر آتے ہیں اور نہ وہ سنہری رنگت والا خوشبودار قہوہ ہی کیسے بنتا ہے۔ بہر حال میں اپنی داستان کو آگے بڑھاتا ہوں۔ کلکتے کے شیش پر اتر کر سوچنے لگا کہ کہاں جاؤں؟

ذکریا سٹریٹ میں شالوں کا کاروبار کرنے والے رشتے دار ضرور رہتے تھے مگر خطرہ تھا کہ وہ مجھے پکڑ کر بٹھالیں گے اور پیچھے گھر خط لکھ دیں گے کہ لڑکے کو ہم نے پکڑ لیا ہے کوئی آکر واپس لے جائے۔ ایسا میرے ساتھ دو ایک بار ہو چکا تھا کہ میں بڑی خوشی خوشی ذکریا سٹریٹ اپنے رشتے داروں کے ہاں گیا۔ انہوں نے بڑی آؤ بگٹ کی مگر چپکے سے پیچھے والد صاحب کو خط لکھ دیا کہ برخوردار ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے کوئی آدمی بھیج کر اسے لے جائے۔ والد صاحب نے اپنے ایک شاگرد پهلوان کو بھیج دیا جس نے آتے ہی مجھے دبوچ لیا اور اپنی نگرانی میں مجھے واپس لے گیا۔ ان کشمیری رفوگر ٹپ گر اور شال مرچنٹ رشتے داروں میں صرف خواجہ قمر دین ایک ایسا شخص تھا جو مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس دلچسپ شخص کے بارے میں میں پہلے ہی تھوڑا بہت لکھ چکا ہوں۔ خواجہ قمر دین کی عمر اس وقت چالیس ہتالیس سال کی تھی۔ گورا چٹا صحت مند خوبصورت آدمی تھا۔ پیٹ کا کالا پمپ شو، سفید شلوار، بوسکی کی قمیض، گلے میں سونے کی زنجیری، انگلیوں میں سونے کی زمر اور عقیق والی انگوٹھیاں، کندھے پر کبھی عام شال اور کبھی قیمتی جامہ دار ڈالی ہوتی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ ہاتھ میں کریوں اے سکرٹوں کا ڈبہ ہوتا۔ خواجہ صاحب شہزادوں کی طرح ذکریا سٹریٹ میں داخل ہوتے اور امجدیہ ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتے۔

خواجہ صاحب ہمارے بڑے قریبی رشتے دار تھے۔ جوانی میں ہی انہیں شراب اور جوئے کی لت پڑ گئی تھی جو اب تک ان کے ساتھ تھی۔ کلکتے میں نہ تو ان کی کوئی دکان تھی اور نہ امرتسر سے مال لا کر وہاں بیچتے تھے۔ وہ کلکتے میں مینے میں دو ایک بار پھیری لگاتے تھے۔ یعنی کسی دکان دار کی چھ سات شالیں، قالین کے دو ایک ٹکڑے لے کر عیسیٰ میں ڈالتے اور ٹالی سنج اور پالی سنج میں جو غیر ملکی رہتے تھے ان کے ہاں جاتے اور دو چار ٹکڑے فروخت کر آتے۔ عام طور پر وہ اس زمانے میں دو سو کی شال پانچ سو میں اور اسی طرح قالین کے چھوٹے ٹکڑے کو سترہ اور

بخارا کی تاریخی روایات کا حامل بتا کر منگے داموں بیچتے۔ واپس آکر اپنے واقف کار
دکاندار کو اصل مال کی قیمت منافع کے ساتھ دینے کے باوجود ان کے پاس کافی رقم بچ
جاتی۔ اس کے بعد ان کے دو ہی کام ہوتے تھے۔ شراب پینی اور جوا کھیلنا۔۔۔ وہ
آٹھ جماعتیں پاس تھے مگر میں نے انہیں بالی گنج کے انگریزوں اور امریکیوں کے آگے
ایسی انگریزی فر فر بولتے دیکھا ہے جو نہ میری سمجھ میں آتی تھی نہ امریکی اور انگریز
گاہکوں کی سمجھ میں آتی تھی مگر خواجہ صاحب سو روپے کی شال پانچ سو میں فروخت
کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ہمیشہ اعلیٰ لباس پہنتے۔ اعلیٰ سگریٹ پیتے، قیمتی
انگریزی شراب پیتے اور نکلنے کے بازار حسن سونا گاجی کی حسین ترین طوائف کا بڑا
سنتے اور بے دریغ روپیہ لٹاتے۔

ایک بار جوئے میں بیوی کا سارا زیور اپنی سونے کی انگوٹھیاں، سونے کی
زنجیریں سب کچھ ہار گئے۔ زکریا سٹریٹ کے دکانداروں نے اب ان پر اعتبار کر
چھوڑ دیا تھا اور انہیں پھیری پر لے جانے کے لئے مال دیتے ہوئے کتراتے تھے
خواجہ صاحب بڑے پریشان ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔
”سودا! ہمارا نکاح نامہ تمہارے پاس ہے؟“

اس نے صندوق میں سے نکاح نامہ نکال کر دے دیا۔ اس زمانے کے نکاح
نامے بڑے بڑے ہوتے تھے۔ رنگ برنگ پھولدار حاشیہ ہوتا تھا اور عبارت نسخ
اس طرح لکھی ہوتی تھی کہ عربی زبان کی تحریر لگتی تھی۔ خواجہ صاحب کا نکاح
ویسے بھی پرانا ہو کر خستہ ہو چکا تھا۔ نکاح نامہ لے کر ٹیکسی میں بیٹھے اور سیدھا بالی
یا ٹالی گنج میں ایک انگریز کے بنگلے پر آ گئے۔ اس انگریز کو نوادرات اور پرانی چیز
جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ جاتے ہی نکاح نامہ کھول کر اس کے آگے رکھ دیا اور
خاص ایجاد کردہ انگریزی زبان میں بولنا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب کا بھانجہ احسن
کے ساتھ تھا۔ احسن نے مجھے بتایا کہ ماموں فر فر انگریزی بولتے جا رہے تھے۔ یہ
خواجہ صاحب نے اس انگریز کو بتایا کہ میں تمہارے لئے ایک ایسی تاریخی دستاویز
کر آیا ہوں جو تمہیں ہندوستان میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ بوڑھے انگریز نے
نکاح نامے کو غور سے دیکھا اس پر لکھی ہوئی عربی تحریر اور نکاح خواں کی لکھی
انگوٹھی کی مہر کو دیکھا اور پوچھا۔

”ویل خواجہ! یہ کیا ہے؟“

خواجہ صاحب نے کہا۔

”صاحب! یوں سمجھ لو کہ میں تمہارے پاس اپنے باپ دادا کی ساری جائیداد

پہنچے آیا ہوں۔“

بوڑھا انگریز بڑی دلچسپی سے نکاح نامہ کو دیکھنے لگا۔

”ویل خواجہ! یہ کیا ہے؟“

جب خواجہ صاحب نے محسوس کیا کہ انگریز کا اشتیاق فقط عروج پر پہنچ چکا
تو بولے۔

”صاحب! تمہیں معلوم ہے ہلدی گھاٹ پر مرہٹوں اور بادشاہ اکبر کی مغل
وں کے درمیان جنگ ہوئی تھی؟“

بوڑھے انگریز نے کہا۔

”لیں! ہمیں معلوم ہے۔“

خواجہ صاحب نے کہا۔

”اور ہلدی گھاٹ پر مرہٹوں اور مغلیہ فوج کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا

”لیں۔ ہمیں معلوم ہے۔“

خواجہ صاحب نے نکاح نامے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ وہی تاریخی معاہدہ ہے۔ یہ دیکھو یہ مغل پہ سالار کے دستخط ہیں۔“

اور خواجہ صاحب نے نکاح نامے پر نکاح پڑھانے والے مولوی صاحب کی
ٹھکی کی مہر پر انگلی رکھ دی۔ پھر نکاح نامے پر جہاں اپنے اگلے سیدھے دستخط کئے
تھے اس پر انگلی رکھ کر کہا۔

”اور یہ مرہٹہ سردار بالاجی باجی راؤ کے دستخط ہیں۔“

انگریز نے سوال کیا کہ خواجہ یہ معاہدہ تمہارے ہاتھ کیسے لگ گیا۔ اس پر

اب صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا۔

”ہمارے نانا کے والد مغل فوج کی طرف سے اس جنگ میں لڑے تھے۔

مانہوں نے کسی طرح یہ معاہدہ اڑا لیا اور تب سے یہ ہمارے خاندان میں ایک
نادراست کے طور پر چلا آ رہا ہے اب میرے حالات خراب ہو گئے ہیں اس لئے
درو کر تمہارے پاس فروخت کر رہا ہوں۔“

کے پاس ہی تھا۔ میں وہاں پہنچا تو لالہ گھر پر نہیں تھے۔ ان کی بیوی آپا سوداں باورچی خانے میں کچھ پکا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ کسنے لگیں۔
”تمہارے لالہ بازار گئے ہیں۔ ابھی آجائیں گے بیٹھو۔ ناشتہ کیا ہے کہ نہیں؟“

میں نے کہا۔

”نہیں کیا آپی۔“

آپا سوداں نے مجھے ناشتہ کرایا۔ اتنے میں لالہ قمر بھی آگئے۔ آتے ہی مجھ پر نظر پڑی تو بولے۔
”واہ! کب آئے ہو نکلتے؟“

میں نے کہا۔

”صبح کی گاڑی سے آیا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں یہ بتاؤ گھر سے بھاگ کر آئے ہو ناں؟“

میں شرمندہ سا ہو کر مسکرایا تو لالہ خوش ہو کر بولے۔

”شاباش! جب تم گھر سے بھاگ کر آتے ہو تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔“

آپا سوداں کسنے لگی۔

”ایسی تعلیم تو نہ دیں اسے۔ گھر سے بھاگنا کوئی اچھی بات ہے۔ آپو جی کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی؟“

ہم اپنی والدہ صاحبہ کو آپو جی کہا کرتے تھے۔ لالہ قمر نے اسے جھڑک کر

کہا۔

”تم چپ کرو۔ تمہیں کیا پتہ آدمی مرد کیسے بنتا ہے۔ ارے یہ گھر سے

بھاگے گا نہیں تو دنیا میں اپنا مقام کیسے پیدا کرے گا۔ بس ٹھیک ہے۔ اس کے آنے کی

خوشی میں آج ساگ مچھلی اور کوftے پکیں گے۔“

لالہ قمر کی اعلیٰ پوشاک اور سونے کی انگوٹھیوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ آج

کل ان کی جوئے میں جیت ہو رہی ہے۔ مجھ سے پوچھا۔

”زکریا سٹریٹ کی طرف تو نہیں گئے ناں؟“

میں نے کہا۔

”جی نہیں۔ وہ لوگ تو مجھے پکڑ لیتے ہیں۔“

بوڑھے انگریز کو یقین آیا نہ آیا ہو گا لیکن نکاح نامے کو وہ کوئی پرانی دستاؤ ضرور سمجھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔
”ویل خواجہ! تم اس کا کیا بے گا؟“

خواجہ نے کہا۔

”صاحب! یہ ہماری فیملی کی سب سے قیمتی شے ہے۔ اگر میں اسے عجائب گھر والوں کو دے دوں تو مجھے کچھ نہیں تو دس ہزار روپے ضرور مل جائیں گے لیکن تم میرے پرانے گاہک ہو اور تمہیں اس قسم کی تاریخی چیزیں جمع کرنے کا شوق بھی ہے۔ اس لئے میں تم سے اس کے صرف آٹھ ہزار روپے لے لوں گا۔ نہ کم نہ زیادہ۔“

سات ہزار روپے پر سودا ہو گیا اور خواجہ قمر دین اپنا نکاح نامہ سات ہزار میں انگریز کے ہاتھ فروخت کر کے سیدھے گھر آئے اور بیوی کے آگے سارے روپے رکھ دیئے اور کہا۔

”نکاح نامہ بیچ آیا ہوں۔ مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس کی ایک کاپی امرت والے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔“

سات ہزار روپے اس زمانے میں بڑی کافی رقم ہوا کرتی تھی۔ یہ 1940ء کا زمانہ تھا۔ خواجہ صاحب نے بیوی کو نیا زیور بنا کر دیا۔ اپنی بھی نئی انگوٹھ بنوائیں۔ دوسرے دن رات کو وہ بوسکی کی فیض اور سیاہ پمپ شوپنے کریوں ا۔ ڈبہ ہاتھ میں لئے سونا گاچی میں بھرا س رہے تھے۔

میری آوارہ گردیوں کے زمانے میں بھی زکریا سٹریٹ میں میرا ان کا سامنا ہو جاتا تو مجھے اشارے سے اپنے پاس بلاتے اور والدہ اور والد صاحب کا پوچھتے اور پھر مجھے امجدیہ ہوٹل میں لے جا کر خوب کھلاتے پلاتے۔ جاتے ہوئے دس روپے دیتے۔ میں بادل خواستہ انکار کرتا تو کہتے۔

”پردیس میں ہو تمہارے کام آئیں گے۔ جاؤ کھاؤ پیو۔ ضرورت پڑ

گھر آکر اور لے جانا۔“

میں بوڑھے شیش سے باہر نکل آیا تھا۔ کسی رشتے دار کے ہاں جانا ا۔ تھا جیسے شکار خود جال میں جا کر پھنس جائے۔ سوچا لالہ قمر کے ہاں چلتا ہوں خواجہ قمر دین کو لالہ کہا کرتا تھا۔ ان کا قلیٹ لوڑ چیت پور روڈ کے پیچھے موٹ

لالہ قمر نے زکریا سٹریٹ والے اپنے اور میرے سارے رشتے داروں کو گالی دی اور کہا۔

”اوسر کبھی نہ جانا۔ وہ سب روپے پیسے کے غلام ہیں۔ دنیا دار لوگ ہیں۔ انہیں گولی مارو۔ یہاں جتنے دن چاہے میرے پاس رہو۔ کھاؤ پیو عیش کرو۔“ جب آپا سوداں نے کہا کہ لڑکے کی یعنی میری پڑھائی کا حرج ہو گا اور مجھے واپس جانا چاہئے تو لالہ قمر نے کریوں اے سگریٹ کا لمبا کش لگانے کے بعد کہا۔

”پڑھ لکھ کر ہم نے کیا کر لیا ہے جو یہ کرے گا؟ یاد رکھنا۔ امرتسری کشمیریوں کے لڑکوں کو صرف دو کام سوٹ کرتے ہیں۔ عشق محبت کرنا اور پہلوانی کرنا۔ بس۔“

دوپہر کو لالہ قمر مجھے اپنے ساتھ کلکتے کی سیر کرانے لے گئے۔ ہم وکٹوریہ میموریل بھی گئے۔ یہ عجیب گھر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ مگر لالہ قمر کے ساتھ زیادہ مزا آیا۔ خاص طور پر وہ جو کنسٹری کر رہے تھے وہ وہاں کا کوئی تجربہ کار گائیڈ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وکٹوریہ میموریل کلکتے میں تاج محل کی طرز کی انگریزوں کی بنائی ہوئی نارت ہے جہاں ہندوستانی اور برطانوی نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ایک خوبصورت باغ میں بنی ہوئی دو منزلہ سنگ مرمر کی عمارت ہے جس کے سامنے ایک بھیل ہے۔ بھیل میں کنول کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ ہم برطانیہ کے شاہی خاندان کی رنگین تصویریں دیکھ رہے تھے۔ لالہ قمر نے کہا۔

”انگریزوں نے دنیا میں ایک ہی زبردست کام کیا ہے۔ انہوں نے جو وکلی بنائی ہے اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔“

سورج غروب ہونے کے بعد لالہ قمر کمرے میں سکاچ کی بوتل لے کر بیٹھ گئے۔ ایک سیر دی سے بھرا ہوا پیالہ اور بھنی ہوئی کلیجی کی پلیٹ سامنے رکھ لی۔ خوب نما دھو کر بوسکی کی نئی قیض اور جالی کے ٹشے کی نئی شلوار پہن رکھی تھی۔ کریور اے کاڈیہ اور سنہری لائٹرمیز پر شیشے کے چکدار گلاس کے پاس ہی پڑا تھا۔ کپڑوں بڑا عمدہ پرفیوم لگا رکھا تھا۔ شراب بناتے ہوئے بولے۔

”میں تو اس بری عادت میں پڑ گیا ہوں تم کبھی اسے ہاتھ بھی نہ لگنا سگریٹ بے شک پیانا۔ مجرا بے شک سنتا۔ مگر شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگنا۔ یہ شیرینی دودھ ہے۔ اسے پچانا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ ارے میں نے تو اس شیرینی پر سوا

ڈال رکھی ہے۔ کبھی چار ڈبل پیگ سے زیادہ نہیں پیتا۔“ اتنے میں آپا سوداں مزید بھنا ہوا گوشت لے کر آگئیں۔ انہوں نے لالہ سے کہا۔

”آج پھر زیادہ نہ پی جانا۔ لڑکا کیا کہے گا۔“ لالہ قمر نے گلاس پر ہاتھ رکھ دیا اور جھڑک کر کہا۔

”سارا مزا خراب کر دیا۔“

پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

”کبھی کبھی یہ شیرینی ہاتھ سے نکل جاتی ہے جیسے نوجوان گھوڑی نہیں کبھی کبھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی؟ بس اسی طرح کبھی کبھی یہ شیرینی بھی میرے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ بس تم اسے ہاتھ نہ لگانا۔“

میں اٹھ کر کچن میں آپا کے پاس جانے لگا تو لالہ قمر نے میرا بازو پکڑ کر مجھے زبردستی بٹھالیا۔

”ارے یہاں سے چلے جاؤ گے تو تمہیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ شراب آدمی کا کیا حال کرتی ہے۔“

دو ڈبل چڑھانے کے بعد لالہ قمر بڑے موڈ میں آگئے تھے۔ پہلے پیگ پر وہ اپنے تمام رشتے داروں کی تعریف کر رہے تھے کہ رشتے دار آخر رشتے دار ہوتا ہے اور اپنا خون ہوتا ہے۔ دوسرے پیگ پر ان کا لہجہ بدل گیا۔ کہنے لگے۔

”مگر کوئی کوئی رشتہ دار بڑے حاسد ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے رشتے دار کو خوش ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔“

تیسرے پیگ کے بعد وہ تمام رشتے داروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے انہیں گالیاں دے رہے تھے۔ میں کسی بہانے اٹھ کر آپا کے پاس کچن میں آگیا۔ آپا سوداں کہنے لگیں۔

”مجھ سے ان کا سلوک بڑا اچھا ہے۔ مجھے ہر طرح کا آرام دیتے ہیں مگر جوئے اور شراب نے ان کی زندگی برباد کر دی ہے۔ تم نے خود انہیں دیکھ لیا ہے۔ تم ابھی نوجوان ہو خبردار ساری زندگی کبھی جوئے اور شراب کے قریب نہ جانا۔

مارے مذہب نے یونہی ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیا۔ یہ آدمی کو تباہ کر دیتی ہیں۔“

رات کو لالہ قمر سونا گاچی گانا سننے چلے گئے اور میں کچھ دیر آپا سے باتیں کرنے کے بعد سو گیا۔

اگلے دن میں اکیلا نکلنے کی سیر کرنے نکل گیا۔ خضر پور بیٹی پرست سے لوگوں کو گیٹ کی طرف اپنے سامان کے ساتھ جاتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک سمندری جہاز رنگون جا رہا ہے۔ رنگون کے بارے میں بڑی پراسرار باتیں سن رکھی تھیں اور ایک فلم میں رنگون کے کسی جنگل میں بارش ہوتی بھی دیکھ لی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر آوارہ گردی کرنی ہے تو کیوں نہ رنگون چلا جائے۔ ایک آدمی سے پوچھا کہ رنگون کا کرایہ کتنا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی کا جہاز کے ڈیک کا کرایہ پچیس روپے ہے۔ میرے پاس دس روپے کم تھے۔ برما پر بھی اس زمانے میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ ویزا پاسپورٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف میڈیکل چیک اپ کے بعد دو تین نیچے لگا دیئے جاتے تھے۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اگلا بحری جہاز تین دن کے بعد رنگون روانہ ہوگا۔ میں نے لالہ قمر سے بات کی تو وہ کہنے لگے۔

”بس ٹھیک ہے۔ رنگون ضرور جاؤ۔ اس طرح تمہارا بحر کھل جائے گا۔ مگر وہاں رہو گے کہاں؟ کھاؤ گے کہاں سے؟“

ان چیزوں کے بارے میں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ بس اللہ کا نام لے کر جدھر جانا ہوتا تھا چل پڑتا تھا۔ میں نے جواب دیا۔

”وہاں پہنچ گیا تو کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گا۔“

”شاباش میں چاہتا ہوں کہ کشمیریوں کے بچے شیر کے بچوں کی طرح جنگل میں چل پھر کر اپنی خوراک آپ پیدا کریں۔“ میں نے انہیں کہا کہ میرے پاس کرائے کے پیسے پورے نہیں ہیں۔ لالہ قمر نے ہنس کر میرے کندھے پر تھاپی مارتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیا ہوا؟ میں یہاں کس لئے بیٹھا ہوں۔ کتنے پیسے کم ہیں؟“

”صرف دس روپے۔“

”بس؟ جہاز کب جا رہا ہے؟“

میں نے کہا۔

”تین دن بعد کلکتے سے روانہ ہوگا۔“

”فکر نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

لالہ قمر نے مجھے نئی پتلون نئی قمیض اور نئے بوٹ لے کر دیے۔ جہاز دوپہر کے وقت روانہ ہونے والا تھا۔ وہ مجھے امجدیہ ہوٹل میں لے کر آگئے۔ مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور باتیں کرنے لگے۔

”میری ایک دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں شراب کبھی نہ پینا۔ جو کبھی نہ کھینا۔ ایک اور بات سن لو۔ شریف عورتوں پر کبھی بری نگاہ نہ ڈالنا۔ اور یہ جو طوائف عورتیں ہوتی ہیں ان کو کبھی شریف نگاہوں سے نہ دیکھنا۔ شریف عورتوں سے نظریں جھکا کر بات کرنا لیکن طوائفوں سے آنے سنانے آکر کھل کر بات کرنا۔ کبھی گھٹیا سگریٹ نہ پینا۔ فالتے کر لینا مگر روکھی سوکھی روٹی کبھی نہ کھانا۔ جب کھانا ساگ مچھلی اور پلاؤ بریانی کھانا۔ چلو جہاز والوں کے دفتر میں چلے ہیں۔ وہاں سے تمہارا ٹکٹ بھی لینا ہے۔“

جہاز دوسرے روز روانہ ہونے والا تھا۔ لالہ قمر نے ایک دن پہلے میرا ڈیک کا ٹکٹ خرید کر مجھے دے دیا۔ مجھے خود بندرگاہ یعنی کلکتے کی خضر پور جیٹی پر چھوڑنے آئے۔ بڑے گیٹ کے پاس آکر انہوں نے مجھے روکا۔ جیب سے دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر دیئے اور کہا۔

”انہیں کجوسوں کی طرح سوچ سوچ کر خرچ نہ کرنا۔ بس بے دھڑک خرچ کر ڈالنا۔ اگر سوچ سوچ کر خرچ کرو گے تو آگے سے روپے آنا بند ہو جائیں گے۔ جاؤ۔“

میں انہیں سلام کر کے گیٹ میں سے گزرتا ہوا بڑے ہال میں پہنچ گیا۔ یہاں کتنے ہی مسافر اپنے اپنے سامان کے پاس بال بچوں سمیت بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ مسافروں میں ہر صوبے کے لوگ تھے۔ ہر صوبے کا لباس نظر آ رہا تھا۔ ان میں بنگالی بھی تھے مدراسی بھی تھے مگر گجراتی اور سورتی مین لوگ زیادہ تھے۔ ایک گھنٹے بعد ہال کا دوسرا گیٹ کھلا۔ سارے مسافر اس طرف دوڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ گیٹ پر ٹکٹ چیک ہوتے تھے۔ یہاں بھی آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ سامنے جیٹی کا دارف یعنی پلیٹ فارم تھا۔ ایک بہت بڑا سمندری جہاز کھڑا تھا۔ اس کی

ایک جانب بڑے بڑے تختوں کی سیڑھی لگی تھی جس پر سے قلی مسافروں کا سامان لے کر اوپر جا رہے تھے۔ جہاز کی پہلی منزل اور دوسری منزل کی لمبی گیلریوں میں فٹ اور سینڈ کلاس کے مسافر پہلے سے سوار ہو چکے تھے اور گیلری کی رینگ کے ساتھ لگے تھرڈ کلاس کے مسافروں کی بدحواسیوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ کوئی مسافر سامان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ کوئی عورت بچے کو سنبھال رہی تھی۔ کوئی کسی کو آواز دے رہا تھا۔ کوئی کسی کو بلا رہا تھا۔ جہاز کی پچھلی طرف چوڑے تختوں والی سیڑھی لگ گئی تھی۔ یہ سیدھی اوپر اپر ڈیک پر جاتی تھی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی اپر ڈیک پر آگیا۔ زندگی میں پہلی بار سمندری جہاز پر سفر کا اتفاق ہو رہا تھا۔ اوپر جاتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ جہاز بہت بے معلوم انداز میں اوپر نیچے ہو رہا ہے۔

کافی کشادہ ڈیک تھا۔ مسافر شور مچاتے قلیوں کو آوازیں دیتے ڈیک کے درمیان ترپال کے بہت بڑے سائبان کے نیچے اپنا اپنا سامان لگوا رہے تھے۔ میرے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ میں ڈیک کی دوسری طرف جا کر جنگلے پر جھک کر دیکھنے لگا۔ نیچے دریا کا گدلا گدلا پانی تھا۔ یہ دریائے گنگی تھا جو پیچھے سے دریائے جنا کے نام سے آتا تھا اور بنگال میں داخل ہونے کے بعد دریائے گنگی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ دریا کا دوسرا کنارہ کافی دور تھا۔ وہاں درختوں کے جھنڈ دور تک چلے گئے تھے۔ دریا میں دو تین سیئر اور ماہی گیروں کی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ جہاز پر مسافروں کا شور مچا ہوا تھا۔ جہاز کے پیچھے کی جانب آبی پرندے غوطہ لگا کر نیچے آتے اور پھر اوپر اٹھ جاتے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بھی نظر آ رہے تھے۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں جنگلے سے ہٹ کر جہاز کے سامنے والے حصے میں آگیا۔ یہاں ڈیک کے دونوں جانب کے جنگلے آکر مل جاتے تھے۔ یہاں لوہے کے راڈ کے اوپر جہاز والوں کا اپنا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر دیکھا۔ جہاز کے پینڈے میں سے لنگر کا آہنی سنگل دریا کے پانی کے اندر گیا ہوا تھا۔

جہاز بے معلوم انداز سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ کونے میں بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ یہاں ہوا ذرا تیز تھی۔ میرا دل سگریٹ پینے کو چاہا۔ میری جیب میں کیونڈر کا پیکٹ تھا مگر میں نے سگریٹ نہ نکالا۔ تیز ہوا میں سگریٹ پینے کا مزہ ضائع ہو جاتا ہے۔ فضا ساکن ہو تو سگریٹ کی خوشبو آدمی کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ تیز ہوا چل رہی ہو تو یہ خوشبو اڑتی جاتی ہے۔ میں بیٹھا سوچنے لگا کہ

سائے نہیں اترے تھے کہ میں نے دریا کو ڈیک پر سے جھک کر دیکھا۔ دریا کے گدے پانی میں سمندر کے پانی کی نیلی نیلی لہریں شامل ہونے لگی تھیں۔ دریا نے کہا تھا، مجھے وہاں آکر ملنا۔ جہاں میں سمندر میں گرتا ہوں۔ یہ وہی مقام تھا۔ دریا سمندر سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ میں دریا کی لہروں کو سمندر کی نیلی لکیروں کے ساتھ گلے ملتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے رنگوں کے دریا ایراوتی کے ملاحوں کا گیت یاد آگیا۔ یہ گیت بلکہ اصلی گیت کا ترجمہ میں نے امرتسر میں لائبریری کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔

ایراوتی! اری او ایراوتی!
 سب ندیاں پیاری ہیں
 سب سے پیاری ہے ایراوتی
 دن بھر میں ناؤ کھیتا ہوں
 تیرے پانیوں پر او ایراوتی!
 ملاح کی زندگی بجائے خود ایک گیت ہے
 تیرے پانیوں پر --- ایراوتی!
 سندر لڑکیاں ناچ رہی ہیں، جھوم رہی ہیں
 تیزی سے، کبھی دھیرے دھیرے
 تم نے یہ ناچ کہاں سے سیکھا ہے؟
 بناؤ ایراوتی کی بیٹیو!
 ہم ہیں مور اور تم ہو مورنیاں
 مور مارے جائیں گے اور تم ردیا کرو گی
 دریا کے اس موڑ پر ناچ سیکھا تھا یا اس پہاڑ پر
 جہاں سے ایراوتی نکلتی ہے؟

ایراوتی میں ہمارے آنسو ساتے رہے ہیں بھائیو!
 ایراوتی کتنی میلی ہو رہی ہے
 اور جب غریبی ہمارے گلے گھونٹ دے گی
 ایراوتی اسی طرح بہتی رہے گی

رنگوں پہنچ کر کسی نہ کسی جگہ چھوٹا موٹا کام تلاش کر لوں گا اور پھر شہر کی سیر کر دوں گا۔ برا کے جنگل دیکھوں گا۔ ان جنگلوں کی بارشیں دیکھوں گا۔ میں دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے جہاز چلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں اٹھ کر جہاز کے بیٹی والے جنگل پر آگیا۔

جہاز کی ایک سیڑھی اتار دی گئی تھی۔ دوسری سیڑھی اتاری جا رہی تھی۔ دونوں جانب مزدور لوگ پلیٹ فارم پر لوہے کے بھاری ستون سے بندھے ہوئے موٹے رے کھول رہے تھے۔ عرشے کے فرش میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ پھر جہاز کے انجن چلنے کی آواز آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی جہاز کی دونوں جانب کے لنگر اٹھنے لگے۔ لنگر اٹھانے والی چرخی زور سے گھوم رہی تھی۔ جب لنگر چرخی کے ساتھ پلیٹ دیئے گئے تو جہاز نے تین چار بار دسل دیئے۔ میں نے نیچے دیکھا۔ جہاز پلیٹ فارم سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ مجھے پلیٹ فارم کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے بڑے بڑے تار نظر آنے لگے۔ یہ اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ جہاز جیٹی کے ساتھ لگتے وقت رگڑ نہ کھائے۔ بیٹی پر کھڑے لوگ گیلری اور اوپر کے ڈیک پر کھڑے لوگوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔

جہاز اور پلیٹ فارم کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ بندرگاہ کے پلیٹ فارم کو گودی بھی کہتے ہیں مگر یہ نام مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے بار بار پلیٹ فارم لکھ رہا ہوں۔ جہاز دیر تک آگے یا پیچھے جانے کی بجائے پہلو کی طرف پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ جب بیٹی یعنی بندرگاہ اور جہاز کے درمیان کافی فاصلہ پڑ گیا تو جہاز دریا میں سیدھا چلنے لگا۔ میں جلدی سے جہاز کے عقبی ڈیک پر آگیا۔ کلکتہ کی بندرگاہ دور ہو رہی تھی۔ پہلے رخصت کرنے والے لوگوں کی شکلیں غائب ہو گئیں۔ پھر بندرگاہ کی عمارت بھی چھوٹی ہوتی گئی۔ جہاز کے سارے انجن چل رہے تھے۔ جہاز آگے نکل آیا تھا۔ میں جہاز کے سامنے والی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ دریا کا بائیں جانب والا کنارہ ابھی پیچھے ہٹ رہا تھا۔ دریا میں لوہے کے بنے ہوئے بڑے بڑے گولے جگہ جگہ ابھرے ہوئے تھے۔ یہ جہاز کو شاید راستہ دکھا رہے تھے۔

سورج مغرب کی جانب غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ سنہری ہو کر سمٹ رہی تھی۔ دریا کے کنارے دور رہ گئے تھے۔ دریا کا پاٹ بہت کشادہ ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ کلکتہ کے کارخانوں کی چنیاں بھی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ابھی شام کے

نہیں کرتے۔ ساوار گرم کر کے محفل کیوں نہیں لگاتے۔ رات کو سارے گیت جاگ پڑتے ہیں۔ سارے درد بیدار ہو جاتے ہیں۔ فٹے نے بھی یہی لکھا ہے۔
”رات کو چشموں کی آواز زیادہ قریب سے سنائی دینے لگتی ہے دن کے وقت جو درد سو رہے ہوتے ہیں وہ رات کو بیدار ہو جاتے ہیں۔“

میں تیز ہوا میں سگریٹ نہیں سلگاتا چاہتا تھا۔ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ تیسرے درجے کے مسافروں کے واسطے کینٹین نیچے لوئر ڈیک میں ہے۔ میں تنگ بیڑھیاں اتر کر نیچے لوئر ڈیک میں آگیا۔ یہاں جگہ جگہ مسافروں کی ٹولیاں اپنے اپنے سالان کے انبار لگائے جمع تھیں۔ ایک طرف چھوٹی سی کینٹین بنی ہوئی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک کالا کلونا مدراسی تانبے کے بڑے حمام کے پاس بیٹھا گاہکوں کو کھانے پینے کی چیزیں دے رہا تھا۔ فضا میں گرمی اور جس تھا۔ صرف وہاں تازہ ہوا آ رہی تھی جہاں ہوا دان لگا ہوا تھا۔ یہ ہوا دان بڑے پائپ کی شکل میں تھا جس کا منہ اوپر جہاز کے عرشے پر جا کر ٹیڑھا ہو کر کھلتا تھا۔

میں نے مدراسی کینٹین والے سے چائے مانگی تو اس نے شکستہ ہندوستانی میں بتایا کہ کینٹین میں صرف کافی ملتی ہے چائے نہیں۔ میں نے کافی کا ایک گلاس لیا اور کاؤنٹر پر ایک طرف ہو کر پینے لگا۔ جنوبی ہند میں کافی بہت پی جاتی ہے۔ میں نے مدراس اور ترچناپی میں بھی کافی پی تھی۔ یہ کافی بھی تازہ اور تلخ تھی۔ مجھے بہت اچھی لگی۔ اس میں ساگوان کے درخت کی خوشبو آ رہی تھی۔ یہ مقامی کافی تھی۔ انگریزی یا امریکن کافی نہیں تھی۔ یورپ کی کافی سے مجھے رومن دور کے پرانے قلعوں کی اونچی فصیلوں کی ڈھلانوں پر خاموش کھڑے ساپرس کے درخت یاد آ جاتے ہیں۔ قلعوں کی خاموش ویران راہ داریاں یاد آتی ہیں اور ان قلعوں کے وہ ایوان یاد آ جاتے ہیں جہاں کبھی حسین شہزادیاں بے آواز قدموں سے اپنے مخملیں لباس کی سرسراہٹوں کے ساتھ چلا کرتی تھیں۔ لیکن جنوبی ہند کی کافی مجھے ساگوان کے درختوں والے جنگلوں میں لے جاتی ہے جہاں تاریک اندھیری راتوں میں دریا خاموشی سے بہتے ہیں اور بانس کے جھنڈوں پر اوس گرتی ہے۔۔۔ کافی پی کر میں نے سگریٹ سلگایا تو مجھے خوشبوؤں میں ڈوبے تاریک معبودوں میں رقص کرتی دیوداسیوں کے سائے لہراتے نظر آنے لگے۔ جب تک میرا پورا سگریٹ ختم نہیں ہو گیا میں وہیں کاؤنٹر کے بائیں کھڑا دیوداسیوں کے رقص کرتے سایوں کو دیکھتا رہا۔ سگریٹ ختم ہو گیا۔ رقص

بہتی جا ماں ایراوتی!

تیزی سے کبھی دھیرے دھیرے

ایراوتی تو چپ کیوں ہے؟

اداس کیوں ہے؟

ہمارے آنسو شوق سے پنے جا

ہیشہ ہیشہ کے لئے ہم ہیں تیرے بیٹے

بہتی جا ماں ایراوتی! تیزی سے

کبھی دھیرے دھیرے۔۔۔

میں نے اپنے دل سے کہا۔ رنگون پہنچ کر سب سے پہلے ایراوتی دریا کو دیکھوں گا۔ ایراوتی دریا کی لہروں کو پیار کروں گا۔ اس وقت مجھے لاہور کا دریائے راوی یاد آگیا۔ اگر میں راوی کا ملاح ہوتا تو ضرور دریائے راوی کی لہروں کا ایک گیت بتاتا۔ اور راوی کی لہروں کو کہتا۔

راوی کی لہرو! تم میں میرے آنسو

ساتے رہے ہیں

راوی کی لہرو! تم اداس کیوں ہو

چپ کیوں ہو؟

میرے آنسوؤں کے موتی لے کر تم کون سے سمندر کو جاتی ہو؟

مگر میں لاہور کے دریائے راوی سے بہت دور تھا اور مزید دور ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی جہاز ہنگی دریا میں ہی رواں دواں تھا۔ زمین پر سارے دریا ایک دوسرے سے دور دور ہو کر بہتے ہیں۔ سمندر میں جا کر سارے دریا ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ پھر وہاں کسی دریا کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ دریا اپنا نام کبھی نہیں رکھتا۔ میرا سگریٹ پینے کو بہت جی چاہا۔ دریا پر شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ جہاز کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ مجھے اپنے لئے ڈیک پر کوئی جگہ بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ڈیک بہت کشادہ تھا۔ میں رات کو کسی جگہ پر پڑ کر سو سکتا تھا۔ دیے بھی مجھے رات کو سونا پسند نہیں ہے۔ دوسروں کو سوتے دیکھ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ یہ لوگ اٹھ کر باتیں کیوں

نہ آگئی۔ جب آنکھ کھلی تو جہاز کافی ڈول رہا تھا۔ باقاعدہ رولنگ شروع ہو گئی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر سنبھل سنبھل کر چلتا جہاز کے سرے پر آیا جہاں بیٹھنے کے لئے لوہے کی سیٹ بنی ہوئی تھی۔ آہستہ سے ریٹنگ کو پکڑ کر دیکھا تو دریا اور زمین غائب ہو چکی تھی۔ چاروں طرف گہرے سیاہ رنگ کا سمندر ہی سمندر تھا۔ بڑی بڑی موجیں اپنی جگہ پر اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ جیسے سمندر سانس لے رہا ہو۔ جہاز سمندر کو کانٹا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جہاز کے ٹکونے حصے سے ٹکرا کر سمندر کی موجیں دائیں بائیں اسقدر تیزی سے پیچھے کو جا رہی تھیں کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ میں حیران تھا کہ سمندر اتنا کالا سیاہ کیوں ہے۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ اس وقت مجھے زمین بہت یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو میرے زندہ بچنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ مجھے پڑھی ہوئی وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں جہاز ڈوب جاتا ہے اور جہاز کے مسافر تختوں پر بیٹھ کر جان بچاتے ہیں اور پھر کھلے سمندر میں اللہ کے بھروسے پر نکل پڑتے ہیں۔ میں نے سمندر کو دیکھا۔ سمندر کو دیکھ کر مجھ پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ خدا کی خدائی یاد آرہی تھی۔ اس سمندر میں اگر میں کسی تختے پر جان بچا کر بیٹھنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو اتنے بڑے سمندر میں کتنی دیر تک زندہ رہ سکوں گا۔

زمین! زمین! پیاری زمین! کاش زمین پھر سے نظر آ جائے۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا واپس لنگر کی مشین کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ڈیک پر دوسرے مسافر اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔ کوئی سامان ٹھیک کر رہا تھا۔ کوئی بستر جھاڑ کر دوبارہ بچھا رہا تھا۔ کچھ مسافروں نے اپنی خواتین کے پردے کے واسطے چادریں اور کھیں مان رکھے تھے۔

جہاز کچھ اس طرح ڈول رہا تھا کہ کبھی دائیں ہو جاتا کبھی بائیں اور کبھی آگے کو جھک جاتا اور کبھی اوپر کو اٹھ جاتا۔ مجھے چکر آنا شروع ہو گئے۔ مجھے فکر پڑ گیا کہ یہاں میری طبیعت خراب ہو گئی تو کیا کروں گا۔ یہاں تو مجھے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں۔ میں نے سوچا نیچے لوئر ڈیک پر چلتا ہوں۔ شاید وہاں چکر نہ آئیں۔ میں دیوار کو پکڑ کر زینے تک پہنچا۔ پھر زینہ اتر کر نچلے ڈیک میں آ گیا۔ یہاں ایک طرف پوریوں نے گانے بجانے کی محفل لگائی ہوئی تھی۔ ڈھولک بجا کر کوئی گیت گارہے تھے۔ جہاز یہاں بھی ڈول رہا تھا لیکن اوپر کی نسبت رولنگ کم محسوس ہو رہی تھی۔ کینٹین پر

ختم ہو گیا۔
اور میں زینہ چڑھ کر اوپر والے ڈیک پر آ گیا۔ جہاں لنگر ڈالنے والی مشین لگی تھی۔ وہاں اوپر ایک بلب روشن تھا۔ میں نے وہیں لیٹ کر رات بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ مگر جنگ ابھی تک یورپ میں ہی لڑی جا رہی تھی ساؤتھ ایٹیا ابھی تک پرامن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جہاز پر رات کو بلیک آؤٹ نہیں ہوا تھا۔ کلکتہ میں بھی بلیک آؤٹ نہیں ہوتا تھا یہاں جنگ اخباروں کی خبروں اور کارخانوں میں سامان تیار کرنے تک ہی محدود تھی۔ جاپان نے ابھی اعلان جنگ نہیں کیا تھا۔ ڈیک پر مسافروں نے اپنی اپنی جگہیں بنالی تھیں۔ رات ہو چکی تھی۔ جہاز ایک خاص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے جنگلے کے پاس جا کر جھک کر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جہاز ابھی دریا میں ہی ہے یا سمندر میں داخل ہو گیا ہے میرے قریب ہی ایک مسافر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا جہاز سمندر میں جا رہا ہے؟“

وہ بولا۔

”نہیں۔ سمندر آدھی رات کے بعد آئے گا۔ اس وقت جہاز ڈولنا شروع

کر دے گا۔“

میں لنگر ڈالنے والی مشین کے پاس آ کر نیم دراز ہو گیا۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ میرے اوپر تریپال کا بہت بڑا سامان لگا تھا۔ اگر بارش ہوئی تو میں محفوظ رہ سکتا تھا۔ میں ڈیک پر رہ کر بارش دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ تین دن کا سمندری سفر تھا۔ جہاز بہت پرسکون انداز میں ڈول رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ جہاز میں چکر ضرور آئیں گے۔ راولپنڈی سے کوہ مری جاتے ہوئے مجھے بس میں بھی چکر آ جایا کرتے تھے۔ لیکن جہاز اتنے آرام سے ڈول رہا تھا کہ ابھی تک مجھے ایک بھی چکر نہیں آیا تھا۔

میں بڑا مطمئن تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے بھوک محسوس ہوئی۔ میں لوئر ڈیک والی کینٹین پر آ گیا۔ یہاں تھوڑے بہت چاول کھائے اور ایک پورا سگریٹ کرنے کے بعد اوپر آ کر لیٹ گیا۔ بادلوں کی وجہ سے بھی ہوا ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

”یہ کس قسم کی دوائی تھی اس کا نام معلوم ہے تمہیں؟“
کریم الدین نے ہنس کر کہا۔
”یہ براہی تھی۔“

میں نے پہلے کبھی براہی نہیں پی تھی۔ سنا ضرور تھا کہ آدمی کو زیادہ سردی لگے یا نمونیہ ہو جائے تو اسے براہی پینے کو دیتے ہیں۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ یہ ایک قسم کی شراب ہی ہوتی ہے۔ میں نے کریم سے کہا۔
”یہ تو شراب ہوئی پھر۔“

وہ بولا۔

”براہی اور ہوتی ہے۔ شراب اور ہوتی ہے۔ براہی تو ڈاکٹر خود مریضوں کو دیتے ہیں۔“

دوپہر کے بعد بارش شروع ہو گئی۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ جہاز زیادہ شدت سے ڈولنے لگا۔ براہی کا اثر ضائع ہو چکا تھا۔ شام کے وقت مجھے دوبارہ چکر آنا شروع ہو گئے۔ میں نیچے ڈاکٹر کے کیمین میں گیا۔ براہی کی ایک اور خوراک پی اور طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ تیز ہوائیں چلتی رہیں۔ جہاز بری طرح سے ڈولتا رہا۔ رات کو میں نے براہی کی ایک اور خوراک پی لی۔ جہاز ڈولتا رہا اور میں لوئر ڈیک کے فرش پر بے فکر ہو کر سویا رہا۔ رات میں کسی وقت آنکھ کھلی۔ جہاز بدستور رولنگ کر رہا تھا۔ مگر میری طبیعت ٹھیک تھی۔ میں دوبارہ سو گیا۔ میرے جہاز کے دوست کریم نے مجھے ایک چادر نکلی دے دیا تھا۔ دن کے وقت اٹھا تو رولنگ کم ہو رہی تھی۔ اوپر ڈیک پر آیا تو دیکھا سمندری طوفان گزر چکا تھا۔ سمندر میں وہ بچان نہیں تھا مگر بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ نیچے آکر کیمین پر ناشتہ کیا۔ کافی پی رہا تھا کہ کریم الدین بھی آ گیا۔

”اب طبیعت کیسی ہے؟“

میں نے کہا۔

”ٹھیک ہوں۔ ابھی رنگون کتنی دور ہے؟“

کریم بولا۔

”ابھی کل کا دن اور رات بھی سمندر میں گزرے گی۔ پرسوں دن کے

سے میں نے بادل نخواستہ ناشتہ کیا اور کافی کا ک لے کر لوہے کی ایک پٹی پر بیٹھ گیا۔ کافی پینے سے طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ یہاں ایک لڑکے سے میری صورت شناسائی ہو گئی۔ یہ سورتی میمن مسلمان لڑکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو میرے پاس آ گیا۔

”چکر آرہے ہیں؟“

میں نے اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

”اوپر زیادہ آرہے تھے۔“

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

”جہاز کے ڈاکٹر کے پاس جا کر کوئی دوا پی لیتا۔ چکر ختم ہو جائیں گے۔ میں لگتے آتا جاتا رہتا ہوں پہلے پہل مجھے بھی چکر آیا کرتے تھے اب نہیں آتے۔ اگر آئیں تو جہاز کا ڈاکٹر مجھے ایک خوراک پلا دیتا ہے۔“
اس لڑکے کا نام کریم الدین تھا۔ رنگون میں اس کے باپ کی کپڑے کی دکان تھی۔ میں نے کہا۔

”جہاز کا ڈاکٹر کہاں ملے گا؟“

کریم بولا۔

”میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔“

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ جہاز کا ڈاکٹر جہاز کی دوسری منزل والے کینوں میں سے ایک کیمین میں مل گیا۔ یہاں اس کی جھوٹی سی ڈپنری تھی۔ یہ ڈاکٹر ہندوستانی تھا۔ اس نے مجھے سترچر پر بٹھا دیا اور پیشے کے چھوٹے سے گلاس میں کمرے لال رنگ کی دوائی ڈال کر دی۔

”اس کو پی جاؤ۔ چکر وکرب ختم ہو جائیگا۔“

میں ناک بند کر کے دوائی پی گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے گلے میں سے گرم اور کڑوی شے اتر گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں گرمائش کی ایک لہری دوڑ گئی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میری طبیعت بحال ہو گئی۔ چکر غائب ہو گئے۔ ڈاکٹر بولا۔

”اگر چکر پھر آ گیا تو میرے پاس آکر دوائی پی جانا۔“

میں اور کریم اوپر والے ڈیک پر آ گئے۔ سمندری ہوا چل رہی تھی۔ بڑے تیز اور نرم دار ہوا تھی۔ مجھے کچھ سرور سامحوس ہوا۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

مرتے ہیں۔ شاید اسی لئے دریاؤں کا پانی گدلا ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر گزری تو بائیں جانب کا کنارہ بھی دور سے نظر آنے لگا۔ دریا کے کنارے جہاز کے قریب آرہے تھے۔ مگر بہت آہستہ آہستہ -----

دور سے ایک جگہ زمین میں سے ابھرے ہوئے گول گول چکر دکھائی دیئے۔ کریم بولا۔

”یہ برائیل والوں کے تیل کے کنویں ہیں۔“

سہ پہر کا سورج چمک رہا تھا۔ میں نے دور دور تین چار مینار دیکھے جو زمین سے باہر نکلے ہوئے تھے اور ان کے سنہری کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

”یہ کوئی مندر ہے؟“

وہ بولا۔

”یہ بدھ مذہب کو ماننے والوں کے مندر ہیں۔ ان کو پیگودا کہتے ہیں۔ ایسے پیگودا برما میں بہت دیکھنے کو ملیں گے۔ رنگون میں سب سے بڑا پیگودا ہے۔ اس کا نام سولی پیگودا ہے۔“

میں پیگودا کے چمکتے کلس دیکھ رہا تھا۔ کریم نے کہا۔

”رنگون میں ایک بہت بڑی جامع مسجد بھی ہے۔ اس کا نام سلطان ٹیو جامع مسجد ہے۔ میں وہاں جسے کی نماز پڑھنے جایا کرتا ہوں۔ یہ مسجد رنگون کی مغل سٹریٹ میں ہے۔“

میں نے دل میں سوچ لیا کہ یہ مسجد بھی ضرور دیکھوں گا۔ کریم نے بتایا کہ رنگون میں ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ بری مسلمانوں کی بھی بھاری تعداد آباد ہے۔

”رنگون سے تو اردو کے دو اخبار بھی نکلتے ہیں۔“

یہ سن کر میرے دل میں امید کی کرن سی چمکی۔ مجھے ان اردو اخباروں کے دفتر میں کوئی نہ کوئی کام ضرور مل جائے گا۔ میں اردو کا لڑچڑ بہت پڑھا کرتا تھا اور میری اردو کی لکھائی بھی بڑی اچھی تھی۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ جہاز رنگون کی بندرگاہ میں داخل ہو گیا۔ ہمارا جہاز بندرگاہ میں کھڑا کئی غیر ملکی اور ملکی جہازوں کے قریب سے گزرا۔ ان جہازوں پر اپنے اپنے ملک کے جہنڈے لہرا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سنیر بیٹیاں

دقت رنگون آئے گا۔“

کریم کو معلوم تھا کہ میں رنگون صرف سیر و سیاحت کے لئے جا رہا ہوں اور وہاں میرا کوئی جان پہچان والا نہیں ہے۔ وہ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔

”ہمارے گھر میں تو ایسی کوئی جگہ نہیں ہے ہمارا ایک گودام ہے۔ وہاں اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے لئے چارپائی بچھوا دوں گا۔ جب تک تمہیں کوئی دوسری جگہ نہیں مل جاتی تم وہیں رات کو سو جایا کرتا۔“

میرے لئے یہی بہت تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ گودام رنگون شہر میں ہے یا شہر کے باہر ہے۔ کریم نے کہا۔

”شہر سے تین چار میل ہی باہر ہے۔ وہاں آنے جانے کے لئے تمہیں بس مل جایا کرے گی۔“

وہ دن بھی گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ تیسرے روز صبح کے وقت لوڑ ڈیک سے اٹھ کر اپر ڈیک پر گیا تو سمندر کا کالا سیاہ رنگ سبزی مائل ہو رہا تھا۔ غور سے دیکھا تو مجھے دریا کی گدلی لہریں نظر آئیں۔ کریم مجھے دیکھ کر میرے پاس آگیا۔ مسکرا رہا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کہنے لگا۔

”جہاز دریائے ایراوتی کے ڈیلٹے میں چلا جا رہا ہے۔“

زمین ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔ کوئی تین چار گھنٹے گزرنے کے بعد دور سے بائیں جانب ایک سیاہ دھبہ دکھائی دیا۔ ڈیک پر دوسرے مسافر بھی کھڑے تھے۔ ایک مسافر اسی سیاہ دھبے کی طرف اشارہ کر کے چلایا۔

”دھرتی ماتا۔۔۔۔۔“

دوسرے مسافر بھی دوڑ کر جنگلے کے پاس آ گئے۔ زمین نظر آنی لگی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے اپنا گھر نظر آنے لگا ہے۔ سیاہ دھبہ آہستہ آہستہ ایک لمبی پٹی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس لکیر نے ایک کنارے کی شکل اختیار کر لی۔ میں اور کریم جہاز کے بالکل سامنے کے رخ پر لوہے کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ سمندر کا پانی دریا کے گدے پانی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کریم کہنے لگا۔

”یہ دریائے ایراوتی ہے۔“

میں نے گردن جھکا کر ایراوتی کو دیکھا۔ ایراوتی! تیرے پانیوں میں مفلح ملاحوں کے آنسو ساتے رہے ہیں۔ مشرق کے ہر دریا میں غریب ملاحوں کے آ

”ہمارا بنگہ آنے ہی والا ہے۔“

کبھی ایک سڑیٹ میں داخل ہو گئی۔

یہاں ایک جانب چھوٹی چھوٹی کائے نما کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ دوسری جانب میدان تھا۔ یہ کوٹھیاں زمین سے تین چار فٹ اونچے چھانوں پر بنی تھیں۔ سب کی چھتیں ڈھلواں تھیں۔ ہر کوٹھی کے آگے پیچھے کیلے اور ناریل کے درخت ہی درخت تھے۔ کریم الدین کی کوٹھی کے چھوٹے سے باغیچے میں بھی کیلے اور ناریل کے درخت تھے۔ دروازے پر بلب روشن تھا۔ کریم نے مجھے اپنی والدہ اور والد اور بہنوں سے ملایا۔ سب لوگ شکل ہی سے بڑے شریف، بے زبان اور بے ضرر لگ رہے تھے۔ تقریباً ”سب نے نظروں والی عینکیں لگا رکھی تھیں۔“

وہ رات میں نے کریم کے ہاں گزاری۔ دوسرے دن کریم مجھے کبھی میں اپنے گودام پر لے گیا۔ کہنے لگا۔

”یہاں ایک چھوٹا سا کمرہ میں نے تمہارے لئے صاف کروا دیا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“

گودام کے باہر چوکیدار موجود تھا۔ اس نے گودام کھول دیا۔ اندر ایک بڑا سا ہال کمرہ تھا۔ کمرے میں لکڑی کی پیٹیاں اور ہر قسم کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرہ تنگ تھا۔ اندر بانس کی چارپائی بچھی تھی۔ اس پر چھڑا دانی بھی لگی تھی۔ لوہے کی ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ کریم کے کہنے پر چوکیدار کہیں سے ایک پرانی گرد آلود تپائی اٹھا کر لے آیا۔ چارپائی پر بستر تہ کیا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ تولیہ اور رات کو پہننے والا کرتہ پاجامہ لٹک رہا تھا۔ کریم نے واقعی بڑا انتظام کیا ہوا تھا۔ گودام کے اندر کونے میں ایک چھوٹا سا غسل خانہ بھی تھا جس کا ایک دروازہ باہر کو کھلتا تھا اس کی چھتی لگی ہوئی تھی۔ کریم بولا۔

”یہاں تم شہر سے دور ضرور ہو گے مگر چوکیدار کو کہہ کر تمہیں ضرورت کی ہر چیز مل جایا کرے گی۔“ کھانا دونوں ٹائم ہمارا نوکر تمہیں دے جائے گا۔ چائے چوکیدار تمہیں خود تیار کر کے دے گا۔ یہ بنگالی مسلمان ہے بڑی اچھی چائے بناتا ہے۔ اب میرے ساتھ شہر چلو۔ میں تمہیں اپنی دکان بھی دکھا دیتا ہوں۔ تم جس وقت چاہو مجھے دکان پر آکر مل سکتے ہو۔ میں صبح سے شام تک پاپا کے ساتھ دکان پر ہی ہوتا ہوں۔“

بجائے دریا میں ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ جہاز کی رفتار بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ آخر جہاز رنگوں کی جیٹی میں گودی کے ساتھ لگ گیا۔ (اب گودی کا لفظ میرے قلم سے اپنے آپ نکل گیا ہے تو میں اسے کانوں کا نہیں) یہاں بھی پلیٹ فارم یعنی جیٹی پر بے شمار لوگ اپنے اپنے رشتے داروں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ کریم ڈیک پر کھڑے کھڑے زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔

”ماموں ماموں۔۔۔“

نیچے جہوم میں سے ایک میمن بھی زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ میں اور کریم جہاز سے اتر کر جیٹی پر آ گئے۔ کریم کا ماموں اسے لینے آیا ہوا تھا۔ کریم نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ اس آدمی نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ پھر کریم سے ایک غیر ماموں زبان میں باتیں کرتا آگے بڑھا۔ باہران کی کبھی کھڑی تھی۔ زمین پر قدم رکھنے کے بعد میرے پاؤں ٹھیک طرح سے نہیں پڑ رہے تھے۔ لگتا تھا زمین ڈول رہی ہے۔ جیٹی سے باہر نکل کر ہم کبھی میں بیٹھ گئے اور کبھی کریم الدین کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ شام ہو رہی تھی۔ رنگوں کے بازار کشادہ تھا۔ بمبئی اور کلکتے کے بازاروں کی طرح بلڈنگیں بھی بمبئی کلکتے کی بلڈنگوں ایسی تھیں۔ لوگ مختلف تھے۔ زرد رنگ کی عورتیں سفید کرتڈی کی ٹینیس پہنے ہوئے تھیں۔ ریٹیم کی رنگ برنگی لنگیاں انہوں نے کمر تک باندھ رکھی تھیں۔ مردوں نے بھی قمیض کے اوپر کمر تک لنگیاں باندھی ہوئی تھیں۔ عورتوں کے رنگ زرد تھے۔ مردوں کے رنگ سانولے اور زرد دونوں طرح کے تھے۔ میں نے ایک دو بوڑھے بھکشوؤں کو بھی دیکھا۔ زرد لباسے اوڑھے ہاتھوں میں کمرنڈل تھامے فٹ ہاتھ پر چلے جا رہے تھے۔ مجھے چند رکھی یاد آگئی۔

وہ جبل پور کے پاس کسی دیران شیش پر رات کو اتر گئی تھی۔ خدا جلا کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی۔ میں اسے یاد کر کے اداس ہو گیا۔ ایک موٹر ہارا دیتی ہمارے پیچھے سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ رنگوں کے بازاروں میں بٹیاں روشن ہونے لگی تھیں۔ بازاروں میں پان کے زروے اور سنگار کے تمباکو کی خوشبو محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ خوشبوئیں بڑی رومانٹک لگیں۔ میں ان خوشبوؤں کے ساتھ اس شہر میں خوش ہو کر رہ سکتا تھا۔ کبھی شہر کی بڑی بڑی عمارتوں والے بازاروں سے نکل کر ایک سرسبز پارک کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ فضا تنگ ہو رہی تھی۔ کریم نے میری طرف جھک کر کہا۔

نوجوان بری عورتیں بیٹھی پان لگا رہی تھیں۔ ایک عورت سے میں نے پان خریدا۔ منہ میں ڈال کر ۴ گے بڑھا تو پان کڑوا لگا۔ اس میں لوگ کی تیز خوشبو تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا رنگون میں پان سگریٹ کی دکانوں پر پان کیلے کے پتے میں لپیٹ کر اس میں لوگ چھپا کر رکھے ہوتے ہیں اور انہیں لوگ نکال کر کیلے کا پتا الگ کر کے کھایا جاتا ہے۔ اکثر ادیبز عمر کی بری عورتیں ہاتھوں میں سگار لئے گزرتے دیکھیں۔ برما میں بوڑھی عورتیں سفید رنگ کا سگار پتی ہیں اور یہ سگار کافی بڑا ہوتا ہے۔ میں ایک اور بازار میں آگیا۔ یہاں ایک دکان کے بورڈ پر انگریزی میں فریئر سٹریٹ لکھا ہوا تھا۔ بازار میں بڑی رونق تھی۔ دکانیں چھتے ہوئے فٹ پاتھ کے اندر تھیں۔ ان دکانوں کے قریب سے گزرتے ہوئے کبھی لکڑی کے نئے فرنیچر، کبھی سگار اور کبھی کسی عجیب سے خوشگوار پرفیوم کی خوشبو آتی۔ ایک جگہ میکسم بار لکھا تھا۔ میں نے بار کے شیشوں میں سے دیکھا۔ اندر میز کرسیوں پر سفید نیلی وردیوں والے کچھ غیر ملکی ملاح بیٹھے بادہ نوشی کرتے نظر آئے۔ سامنے گریڈ ہوٹل کی اونچی عمارت تھی جس کے دروازے پر ایک گورکھا چوکیدار کھڑا تھا۔

چھتا ہوا فٹ پاتھ ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ آگے جا کر ایک بڑا چوراہا آگیا۔ یہاں آتے ہی سامنے ایک بہت بڑے اور اونچے پیگودا پر نظر پڑی۔ میرے جہاز کے دوست کریم نے کہا تھا کہ رنگون کے سب سے بڑے پیگودا کا نام سولی پیگودا ہے۔ میں نے ایک بری سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ کونسا پیگودا ہے۔ اس نے پیگودا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سولی پیگودا“ اور آگے چل دیا۔ میرے قدم سولی پیگودا کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے سوچا کہ میں مسلمان ہوں۔ کیا مجھے پیگودا دیکھنے کی اجازت مل جائے گی؟

سولی پیگودا کا بیضوی گنبد اور کلس دن کی روشنی اور ہلکی ہلکی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر سونے کا پترا چڑھا ہوا ہے۔ اس کے اندر بھی جو مہاتما بدھ کا بہت بڑا مجسمہ تھا کہتے ہیں وہ بھی خاص سونے کا تھا۔ میں سڑک کراس کر کے پیگودا کے سامنے آگیا۔ یہ پیگودا زمین سے کافی بلند ایک بہت بڑے نیلے کی شکل کے چوترے پر بنا تھا۔ کافی چوڑی سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔ ہر بیس سیڑھیوں کے بعد چھوٹا سا صحن آ جاتا تھا جس کی دونوں جانب پھول بیچنے والی بری عورتیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے لکڑی اور ٹین کی باٹیوں اور مٹی کے برتنوں میں

کریم مجھے کبھی میں ساتھ بٹھا کر واپس شہر لے آیا۔ رنگون کی مشہور شاہ مارکیٹ میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ اس کے والد صاحب بیٹھے حساب لکھ رہے تھے۔ دکان کے اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہ کریم کا آفس تھا۔ ہم نے وہاں بیٹھ کر چائے پی۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

”کریم بھائی! مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں سے جو اردو اخبار نکلتے ہیں ان کا دفتر کہاں ہے۔“

کریم الدین نے بتایا کہ یہ دفتر سپارکس سٹریٹ میں ہے۔ میں نے ایک رکشا لیا اور سپارکس سٹریٹ کی طرف چل پڑا۔ برما میں رکشا اس زمانے میں ہاتھوں سے چلائے جاتے تھے۔ رکشا چلانے والے عام طور پر جنوبی ہند کے محنت کش ہوتے تھے جنہیں قریگی کہہ کر پکارا جاتا۔ یہ زرد آنکھوں والے کالے رنگ کے سوکھے آدمی ہوتے تھے جنہوں نے بالوں کو پیچھے گت کی طرح باندھا ہوتا تھا۔ یہاں رکشہ کو بچہ کہا جاتا تھا۔ سپارکس سٹریٹ میں داخل ہوتے ہی میں رکشا سے اتر گیا۔ یہ کافی چوڑی سڑک تھی۔ ایک جانب بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ سامنے کی جانب گراؤنڈ تھی۔ میں فٹ پاتھ پر دکانوں کے بورڈ پڑھتا گزرنے لگا۔ ایک جگہ اردو میں روزنامہ ”مجاہد برما“ اور روزنامہ ”شیر رنگون“ کا بورڈ لگا تھا۔ دونوں اخباروں کا ایک ہی دفتر تھا اور ایک ہی انتظامیہ کے تحت شائع ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا، ایک بڑے کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے کام کر رہے تھے۔ شکلیں پنجاب کی لگتی تھیں۔ میں فٹ پاتھ پر دفتر کے سامنے ایک طرف ہو کر کھڑا تھا۔ میرے پاس کھلتے والے لالہ قمر کے دیئے ہوئے ابھی کافی پیسے موجود تھے۔ اس لئے دل نہ چاہا کہ اخبار کے دفتر میں جا کر کسی سے کہوں کہ مجھے نوکری چاہئے۔ نوکری دیئے بھی اچھی نہیں لگتی تھی اور جب پیسے جیب میں ہوں تو جب تک وہ پیسے ختم نہ ہو جائیں کسی جگہ کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں دور ہی سے دفتر کا جائزہ لے کر آگے نکل گیا۔

رنگون شہر میرے لئے ایک خواب کا شہر تھا۔ ہر بازار مجھے پر اسرار لگتا تھا۔ زرد رنگ کی بری لڑکیاں ریشمی لنگیاں پہنے بالوں میں پھول لگائے میرے قریب سے گزرتیں تو مجھے ان دیکھے بارشوں والے جنگلوں سے ان پھولوں کی خوشبوئیں آتیں جو ابھی کھلے نہیں تھے۔ سپارکس سٹریٹ ایک دوسرے بازار میں داخل ہو گئی۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ میں نے پان سگریٹ کی ایسی دکانیں دیکھیں جہاں

ری تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ پھول لے کر چلی گئی تو میں پھول بیچنے والی لڑکی کے پاس آ گیا۔ میں بائیسوں اور پانی سے بھرے ہوئے مٹی کے پیالوں میں رکھے ہوئے پھولوں کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے میرے چہرے سے دیکھ لیا تھا کہ میں برا کا باشندہ نہیں ہوں۔ رنگوں میں دو زبانیں عام بول چال کی زبانیں تھیں۔ ایک انگریزی اور دوسری بہت شکستہ اردو جسے وہ لوگ ہندوستانی کہتے تھے۔ لڑکی نے پوچھا۔

”فلاور؟ کون سا پھول؟“

اس کی آواز اس کے زرد چہرے کی طرح پرسکون تھی۔ میں اسے کیا بتا تا کہ مجھے کونسا پھول چاہئے تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”رجنی گندھا“

پھول بیچنے والی لڑکی نے بائیسوں میں سے رجنی گندھا کے پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ نکالا اور اس کے گرد کیلے کا پتہ لپیٹ کر مجھے دے دیا۔

”فائیو سینٹ پلزز“

رنگوں میں ہندوستان والی انگریزوں کی کرنسی ہی چلتی تھی مگر بھان یعنی چینی آنے دونی چونی کی بجائے سینٹوں میں ہوتا تھا۔ ایک روپے کے سو سینٹ ملتے تھے۔ میں نے اسے پانچ سینٹ دئے اور گلدستہ لے کر بیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ پھول بیچنے والی لڑکی کے ارد گرد ہر قسم کے پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبوئیں تھیں ان میں ایک خوشبو سب سے الگ مجھے محسوس ہوئی تھی شاید یہ خوشبو اس پھول بیچنے والی لڑکی کی خوشبو تھی۔ یہ خوشبو میرے ساتھ ساتھ آرہی تھی۔ میں سولی پیکوڈا کے سب سے بڑے صحن میں آ گیا۔ یہاں جگہ جگہ مہاتما بدھ کے مجستے نصب تھے۔ بودھی لوگ ان کے آگے پھول رکھ کر ماتھانیک رہے تھے۔ جس کے آگے مجھے پھول رکھنے تھے وہ نیچے رہ گئی تھی۔ میں پھول لئے ایک طرف چلنے لگا۔ یہ بہت بڑا پیکوڈا تھا۔ ایک بہت بڑے ہال کمرے کے اندر اونچے استھان پر گوتم بدھ کا مجسمہ مجھے باہر سے نظر آ رہا تھا۔ مہاتما بدھ کو مراقبہ کی حالت میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ مجھے اس رات کا خیال آ گیا جب کپل وستو کا شہزادہ سدھارتھ لوگوں کے دکھوں کا علاج تلاش کرنے کی خاطر اپنے محل کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا تھا۔ اپنے محل کے آرام و آسائش، اپنی بیوی بچے اور تخت و تاج کو چھوڑ رہا تھا۔ اس کا ملازم چتا اس کے پیچھے چل رہا

کنول، ترناری، رجنی گندھا اور رتن جوت کے پھولوں کے بڑے بڑے گچھے سجا رکھے تھے۔ بانس کی ٹوکریوں میں گیندے کے پھولوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ بری عورتیں اور مرد یہاں سے پھول لے کر اوپر مہاتما بدھ کے مجسمہ کے قدموں میں جا کر رکھتیں اور اگر بقیات سلگاتیں۔ بیڑھیوں کے تین دالان تھے۔

میں دوسرے دالان پر آیا تو میں نے پھول بیچنے والی ایک بری لڑکی کو دیکھا۔ وہ اپنے نازک ہاتھوں سے بائیسوں کے پانی میں سے کنول کے کھلے ہوئے اور ادھ کھلے پھول نکال کر ان کا گلدستہ بنا رہی تھی۔ اس کے زرد چہرے پر گفتگو بھی تھی اور اداسی بھی تھی۔ اس نے سفید کریمڈی کی قمیض اور کاسنی رنگ کی لتھی پہن رکھی تھی۔ بالوں میں چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں کا گجرا سجا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری زندگی کی پہلی محبت شبانہ اور چند رکھی سے ہوتی ہوئی پھول بیچنے والی لڑکی کے روپ میں آ کر مندر کی بیڑھیوں میں آ گئی ہے۔ بیڑھیوں کی دونوں جانب ایک خوشنما دیوار بھی ساتھ ساتھ اوپر جاتی تھی۔ میں سامنے والی دیوار کے پاس کھڑا ہو کر اس پھول بیچنے والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

اس لڑکی کو زیادہ دیر دیکھنے سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ میں نے نظریں اوپر کی طرف کر لیں۔ میٹھی طرف سے لوگ اوپر مہاتما بدھ کے مجستے کے درشن کرنے کے بعد نیچے آتے تھے اور پھول بیچنے والی لڑکی کی طرف سے اوپر کو جاتے تھے۔

میرا اب اوپر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے لوگ جس چیز کی تلاش میں اوپر بدھ معبد میں جاتے تھے وہ مجھے معبد کی بیڑھیوں پر ہی مل گئی ہے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھول بیچنے والی لڑکی کو تنکیوں سے دیکھ لیتا۔ اس کے چہرے پر نظریں پڑتے ہی میرا چہرہ گرم ہو جاتا اور آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگتیں۔ میں سورج کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو روشنی مہاتما بدھ نے کپل وستو کے شہزادے کے روپ میں نالندہ کے جنگلوں میں درخت کے نیچے بیٹھ کر دیکھی تھی۔ وہی روشنی مجھے اس کے معبد کی بیڑھیوں پر نظر آ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شہزادہ گوتم روشنی کو دیکھ کر خود بھی روشنی بن گیا تھا مگر جو روشنی مجھے نظر آ رہی تھی وہ میرے جسم کے تاریک بادلوں میں تھوڑی دیر چمک کر غائب ہو جاتی تھی۔

ایک بری عورت اس پھول بیچنے والی لڑکی کے پاس کھڑی اس سے پھول لے

ہے جس کا پانی ان باغوں کے قریب سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس سے پوچھو وہ کونسی رات ہوتی ہے جب چاندنی ان پھولوں پر شبنم کے موتی لٹاتی اترتی ہے۔ انہیں خوشبو اور رنگ عطا کرتی ہے۔

میرا دل مجھے بہت کچھ کہتا رہا۔ بہت کچھ سمجھاتا رہا لیکن میں ایک قدم بھی پھول بیچنے والی لڑکی کی طرف نہ بڑھا اور سر جھکائے خاموشی سے بیڑھیاں اتر گیا۔ دوسرے روز میں پھر اسی وقت پھول بیچنے والی لڑکی کو دیکھنے سولی پیکوڈا گیا۔ آج اس نے اپنے سیاہ بالوں کے جوڑے میں سفید پھول سجا رکھے تھے۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس سے تین چار کنول کے پھول خریدے اور اوپر جا کر ناریل کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ پھول بیچنے والی لڑکی کی خوشبو میرے پاس تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر کنول کے پھول ناریل کے درخت کے پاس رکھے اور اٹھ کر چل پڑا۔ بیڑھیاں اتر کر اس لڑکی کے قریب سے گزرا تو اس نے آنکھیں اٹھا کر ایک نظر مجھے دیکھا اور پھولوں کے گلدستے بنانے میں لگ گئی۔ اس کی نظر روشنی کی شعاع بن کر جیسے میرے دل میں اتر گئی اور اس نے میرے سارے جسم کو روشن کر دیا۔ میں اس روشنی کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتا فریئر سٹریٹ کے ایک بنگالی ریستوران میں سگریٹ سلگا کر پھول بیچنے والی لڑکی کے اداس چہرے کو دیکھنے لگا جو میری آنکھوں کے عین سامنے تھا۔ میں دیر تک ریستوران میں بیٹھا پھول بیچنے والی لڑکی کے تصور میں محو رہا۔

میرے پاس ابھی کافی پیسے تھے۔ ریستوران سے نکل کر رنگوں کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور سگریٹ لگا کر دوبارہ آوارہ گردی شروع کر دی۔ میں رنگوں کی سڑکوں اور بازاروں سے ناواقف تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ جس سڑک پر چل رہا ہوں یہ آگے کس طرف چلی جائے گی۔ اپنے دوست کریم الدین کے بازار کا نام مجھے معلوم تھا۔ جب تھک گیا تو ایک رکشالے کر کریم الدین کی دکان پر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مکرایا۔ اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا کام کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ جب وہ ذرا فارغ ہوا تو میں نے اسے کہا۔

”میں کشتی میں دریائے ایراوتی کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔“

کریم بولا۔

تھا۔ جب شہزادہ وہاں پہنچا جہاں جنگل شروع ہو جاتا تھا تو شہزادہ گھوڑے سے اتر۔ اس نے اپنا گھوڑا ملازم کے حوالے کیا اور کہا۔

”میرے راجہ باپ کو جا کر کہنا کہ اس کا بیٹا پہلے سے زیادہ شہزادہ بن کر واپس آئے گا۔“

اور پھر یہ شہزادہ صوبہ بہار کے خطرناک تاریک جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس کا دل دکھی لوگوں کی محبت سے لبریز تھا۔ یہ وہ محبت ہے جو تھلی کے پروں کے حیرت انگیز رنگوں کے پھول بناتی ہے۔ مور کے پروں کی گل کاریاں کرتی ہے۔ گیہوں کا خوشہ اسی محبت کی طاقت سے زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلتا ہے۔ پرندوں کو یہی محبت اڑنا سکھاتی ہے۔ یہ محبت شہد کے چھتے کو شہد سے بدلتی ہے اور سانپ کے منہ میں زہر رکھتی ہے۔ یہی وہ محبت ہے جو شیر کو کشتی ہے کہ حملہ کرو اور ہرنی کو کشتی ہے کہ جان بچا کر بھاگو۔۔۔ اس محبت کے رازوں کو سمجھنا آسان نہیں۔ شہزادہ سدھارتھ اسی محبت کی خوشیوں، اسی محبت کی اذیتوں اور دکھوں کا راز معلوم کرنے جنگل میں نکل گیا تھا۔ کہتے ہیں شہزادہ سدھارتھ نے اس محبت کا راز پالیا تھا۔ ضرور پالیا ہوگا۔ شہزادے نے اس قیمتی موتی کو حاصل کرنے کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی۔ رجنی گندھا کے پھول میرے ہاتھ میں تھے۔

مجھے پھول بیچنے والی لڑکی کی خوشبو آ رہی تھی۔ رجنی گندھا کے پھولوں کی خوشبو اپنی ہنکھریوں سے جدا ہو کر مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی مگر پھول بیچنے والی لڑکی کی خوشبو نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ میں پیکوڈا کے کشادہ صحن میں ناریل کے ساتھ ساتھ آگے ہوئے درختوں کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے رجنی گندھا کے پھول ان درختوں کے نیچے رکھ دیئے۔ درخت میرے گوتم بدھ ہیں۔ یہ نردوان حاصل کر چکے ہیں اور مجھے نردوان حاصل کرنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ میں واپس ہو کر بیڑھیاں اترنے لگا۔ جب بیڑھیوں کے اس والان میں پہنچا جہاں پھول بیچنے والی بری لڑکی پھولوں سے بھرے ہوئے برتنوں کے پاس بیٹھی تھی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرے قدم رکنے لگے۔ میرے دل نے کہا۔ رک جاؤ یہی تمہاری منزل ہے۔ پھول بیچنے والی کے پاس جاؤ۔ اگر پھول بن کر اس کے پاس نہیں جاسکتے تو پھولوں کی تلاش میں نکلی ہوئی ہو بن کر اس کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ جن شہزادوں کے شاہی مخلوں سے وہ پھول توڑ کر لاتی ہے ان کے باغ کہاں ہیں؟ اس دریا کا کیا نام

”ٹھیک ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔“

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم دکان سے نکلے اور ایک رکشے میں بیٹھ کر دریا کی طرف روانہ ہو گئے۔ دریا وہاں سے کافی دور تھا۔ پہلے ناریل کے درختوں کا ایک گھنا ذخیرہ آیا۔ پھر جھیلیں بالکل ساتھ ساتھ تھیں۔ ان کے کناروں پر کاسنی، گلابی اور سفید کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ واقعی کنول کا پھول پھولوں کا بادشاہ ہے۔ پورے کھلے ہوئے سفید کنول کے پھول کو دیکھ کر قدرت کے جاہ و جلال کا احساس ہوتا ہے۔ جھیلوں کی دوسری طرف دریائے ایراوتی بہہ رہا تھا۔ یہاں ایک جگہ چھوٹا سا گھاٹ بنا ہوا تھا۔ گھاٹ پر سے ہم کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرنے لگے۔ کشتی چھوٹی تھی۔ اسے بری لوگ سپان کتے ہیں۔ بری ملاح کشتی چلا رہا تھا اور کشتی کے پچھلے سرے پر بیٹھا تھا دریا کے دوسرے کنارے کے درخت نظر آ رہے تھے۔ میں نے دریا کے پانی کو دیکھا۔ پانی گدلا تھا۔ میں نے پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے دریائے ایراوتی کے ملاحوں کا اداس گیت یاد آ گیا۔ سورج دوسرے کنارے کے درختوں کے پیچھے اتر رہا تھا۔ دریا پر دھوپ کا رنگ سبز ہو کر دریا کو سنہری کر رہا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ جس میں پانی میں ڈوبے ہوئے سرکنڈوں کی خوشبو تھی۔ مجھے پھول بیچنے والی لڑکی یاد آ رہی تھی۔ کریم الدین کہنے لگا۔

”یہاں دریا زیادہ گہرا نہیں ہے۔ مگر رنگوں کی بیٹی کے پاس اسے بہت گہرا کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا سمندری جہاز بیٹی کے ساتھ آکر لگا تھا۔ دریا کم گہرا ہو تو جہاز بیٹی سے دور کھڑا ہوتا ہے اور مسافر سیٹروں میں بیٹھ کر جہاز تک جاتے ہیں....“

میں پھول بیچنے والی لڑکی کے خیال میں محو تھا۔ کریم الدین نے مجھے کچھ غائب حاضر دماغ دیکھا تو بولا۔

”کیا بات ہے۔ کیا اپنا گہریاد آ رہا ہے؟ تم مجھے کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہو۔“

میں نے کہا۔

”نہیں۔ گہریاد نہیں آ رہا ویسے ہی خاموش تھا۔“

اور میں نے کریم سے باتیں شروع کر دیں۔ ہماری کشتی دریا کے بہاؤ کے ساتھ جا رہی تھی۔ اوپر کی جانب سے ایک بھاری بھر کم سیٹر آتا نظر آیا۔ جب وہ

ہمارے قریب سے گزرا تو سیٹر میں سے ریکارڈنگ کی آواز آنے لگی۔ سیٹر پر فلم رتن کا گانا بج رہا تھا۔

ساون کے بادلو

ان سے یہ جا کو

تقدیر میں یہی تھا

ساجن میرے نہ رو

اس زمانے میں فلم رتن رنگوں میں بہت چل رہی تھی اور ہونٹوں ریسٹورانوں میں بھی اس فلم کے گانوں کی ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ کریم کہنے لگا۔

”یہ سیٹر سیاحوں کو دریا کی سیر کراتا ہے۔ اس میں ایک ریسٹوران بھی ہے۔ یہ ریکارڈنگ اس ریسٹوران میں ہو رہی ہے۔“

پھر اس نے پوچھا۔

”تم نے فلم رتن دیکھی ہے؟“

میں نے کہا۔

”ہاں۔ لاہور میں دیکھی تھی۔“

کریم بولا۔

”یہاں اوڈین سینما میں لگی ہے۔ کسی دن چل کر دیکھیں گے۔“

پھر اس نے مجھ سے اخبار کی نوکری کے بارے میں پوچھا۔

”کیا اخبار کے دفتر میں گئے تھے؟ کوئی کام ملا یا نہیں؟“

میں نے یونہی کہہ دیا۔

”ان لوگوں سے ملا تھا۔ انہوں نے کہا ہے دس پندرہ دنوں کے بعد آتا۔“

کریم نے کہا۔

”آج کل یورپ میں جنگ لگی ہوئی ہے۔ یہاں رنگوں میں بڑی نوکریاں

ہیں۔ کئی نئے کارخانے کھل گئے ہیں۔ انگریز یہاں سے تریپالیں، نیپچے اور دوسرا سامان

تیار کروا کر ولایت لے جا رہے ہیں۔ کسی کارخانے میں تمہیں ضرور کام مل جائے

گا۔“

وہ گیندے اور ترناری کے پھولوں کو کیلے کے پتوں میں لپیٹ رہی تھی۔ اس کی نازک انگلیوں سے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کے اداس خاموش چہرے پر کنول کے پھولوں کی بے زبان گفتگو تھی۔

”تم نے یہ رقص کہاں سے سیکھا ہے

اے ایراوتی کی لہرو!

ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے؟

ایراوتی میں ہمارے آنسو گرتے ہیں بھائیو!”

ہماری کشتی دریا کی لہروں پر بہتی ہوئی جب کافی دور نکل گئی تو کریم نے اپنے گفتگو سے چونک کر کہا۔

”ارے ہم تو منگی پوائنٹ تک آ گئے ہیں۔“

اس نے ملاح سے کہا کہ کشتی واپس لے چلو۔ ملاح نے کشتی کا رخ موڑ دیا۔ کریم کہنے لگا۔

”مجھے خیال ہی نہیں رہا منگی پوائنٹ سے دریا کا چوڑا پاٹ شروع ہو جاتا ہے۔“

وہ انگریزی میں ملاح کے بارے میں کہنے لگا کہ یہ لوگ اکثر تاڑی پی کر کشتی چلاتے ہیں۔ اس نے بھی نہیں سوچا کہ آگے دریا کی لہریں خطرناک ہو جاتی ہیں۔ اس وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ہوا بھی تیز ہو گئی تھی۔ ملاح کو کشتی چلاتے ہوئے کافی زور لگانا پڑ رہا تھا۔ گھاٹ تک پہنچتے پہنچتے ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ شام کی سیاہی بھی پھیل گئی تھی اور گھاٹ کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ ہم جلدی سے کشتی سے اتر کر ایک سانباں کے نیچے آ گئے۔ یہاں بانس کے بڑے بڑے گٹھے پڑے تھے۔ بارش آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔ کریم بولا۔

”غلطی کی جو میں نے اپنی بند بکھی نہیں نکلائی۔ یہاں سے شاید ہی کوئی بند بکھی ملے۔“

گھاٹ پر کوئی رکشا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک بند بکھی آ کر رکی۔ دو آدمی اس میں سے سامان نکال کر سانباں کے نیچے رکھنے لگے۔ کریم الدین برا زبان جانتا تھا۔ اس نے بکھی کے کوچوان کو شرچلنے کے لئے کہا تو اس نے بند بکھی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔ ہم جلدی سے اندر بیٹھ گئے۔ یہ بند بکھی اس

کریم جنگی سازو سامان بنانے والے کارخانوں کی باتیں کر رہا تھا اور میرے ذہن میں دریائے ایراوتی کے ملاحوں کے دردناک گیت گونج رہے تھے۔ میں غروب ہوتے سورج کی سنہری روشنی میں چمکتی دریائے ایراوتی کی لہروں میں پھول بیچنے والی لڑکی کا اداس زرد چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر کریم کہنے لگا۔

”ہمارا مال بھی بہت ولایت جا رہا ہے۔ کہتے ہیں جنگ رنگوں تک آ جائے گی۔ مگر کیسے آ جائے گی؟ جنگ تو جرمنوں اور انگریزوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ یہاں جرمن اتنی دور کیا کرنے آئیں گے بھلا.....“

اسے خدشہ تھا کہ اگر جنگ رنگوں تک پہنچ گئی تو ان کا سارا کاروبار ختم ہو جائے گا۔ کہنے لگا۔

”خدا نہ کرے یہاں بھی جنگ شروع ہو۔ پھر تو بڑی تباہی آئے گی۔ جنگ بڑی خراب چیز ہے۔ جہاز شروں پر بمباری کرتے ہیں۔ فوجیں داخل ہو جاتی ہیں اور ہر طرف تباہی مچ جاتی ہے۔“

میں کریم کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے باہر نکالتا جا رہا تھا۔ میں پھول بیچنے والی اداس لڑکی کے خیال میں تھا۔ مجھے اس کی جنگی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس خوبصورت رومانوی شہر پر دوسری جنگ عظیم کی وہ قیامت ٹوٹنے والی ہے کہ سڑکوں پر انسانی لاشیں بکھری ہوں گی۔ عمارتوں سے شعلے اٹھ رہے ہوں گے۔ بھائی بہنوں سے اور بچے ماؤں سے بچھڑ جائیں گے۔ نہ پھول رہیں گے اور نہ پھول بیچنے والیاں رہیں گی۔ ابھی دریائے ایراوتی کے پانیوں پر ہماری سمپان بڑے سکون سے بہہ رہی تھی۔ ابھی غروب آفتاب کے بعد دریا پر چلنے والی ہواؤں میں پھٹتے بموں کے بارود کی بو شامل نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ہوا شبنم کے موتیوں کی طرح نرم دار اور شفاف تھی۔ کریم الدین کہہ رہا تھا۔

”اگر یہاں جنگ کا کوئی خطرہ ہوتا تو رات کو بلیک آؤٹ ضرور ہوتا۔ مگر شہر رات کو جگمگا رہا ہوتا ہے۔ بابا جان کل کسی سے کہہ رہے تھے کہ ادھر بھی جنگ کا خطرہ لگتا ہے۔ مگر جرمنوں کو اتنی دور آ کر انگریزوں سے لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔“

میں سولی بیگوڈا کی میز میوں میں بیٹھ کر پھول بیچنے والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

رہا تھا۔ اپنی آواز میں جو کچھ بول رہی تھی جو کچھ کہہ رہی تھی وہ میں نہیں سمجھ رہا تھا۔

ہماری بند بگھی چھت پر بارش کے شور میں رنگوں کے بازاروں میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے روشندان والی کھڑکی سے دیکھا۔ رنگوں بارش میں بھیک رہا تھا۔ دکانوں کی روشنیوں میں بارش کے قطرے رنگ برنگے موتیوں کی طرح گرتے نظر آ رہے تھے۔ بارش رنگوں کے رومانیک بازاروں میں موتی لٹا رہی تھی۔ فضا میں رنگوں کی خاص خوشبو۔ پان کے زردے اور سگار اور کوکو کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

رنگوں کی فریئر سٹریٹ میں جہاں 39 نمبر والی گلی مڑتی ہے اس کے کونے پر ماتری بھنڈا نام کا ریسٹوران ہوا کرتا تھا۔ وہاں میں نے زندگی میں پہلی بار گرم کوکو پی تھی۔ اس کا ذائقہ کافی سے زیادہ تلخ اور کڑوا کڑوا تھا۔ مجھے ایسے لگا تھا جیسے میں بانس اور مہاگنی کے سیاہ درختوں کا جوس پی رہا ہوں۔ جب میں کوکو پی کر ریسٹوران سے باہر نکلا تھا تو مجھے اپنے اوپر کبھی بانس کے درخت کا اور کبھی مہاگنی کے درخت کا گمان ہوا تھا۔ آہ! گمان تاریک جنگلوں میں بانس درختوں پر گرتی بارش۔ ان درختوں کی شاخوں سے دوسری شاخوں پر گرتی بارش۔۔۔۔۔ اور زمین سے، جنگل سے، دریاؤں سمندروں اور ہزاروں سال پرانے کھنڈروں اور چٹانوں سے باتیں کرتی بارش۔ ان کو زندگی کے بھید بتاتی، کائنات کے راز بتاتی بارش! یہ راز بارش آسمانوں سے لے کر زمین پر اترتی ہے۔ درخت، جنگل، دریا، سمندر، کھنڈر اور بیستاک چٹانیں بارش کی زبان سمجھتے ہیں۔ وہ یہ راز سنتے ہیں، سمجھتے ہیں اور ان کی خاموشی پہلے سے زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ اور اس گہری خاموشی، گہرے سکوت میں وہ کائنات کی ہر شے کو ایک دوسری سے جڑے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ زمان و مکاں سے باہر اربوں کھربوں سال سے پرے، جہاں نہ کوئی وقت ہے نہ کوئی غیر ہے، ابدی مسرتوں کے باغ دیکھتے ہیں۔ یہ اس ازلی اور ابدی نور کے باغ ہیں کہ روشنی جس نور کا سایہ ہے۔ میں کس قدر بد نصیب ہوں کہ بارش میں بھیک رہا ہوتا ہوں لیکن بارش سے محروم ہوتا ہوں۔ بند گاڑی کریم الدین کی دکان کے باہر آ کر رک گئی۔ ہم بارش میں بھیکتے ہوئے دکان میں داخل ہو گئے۔ کریم نے کہا۔

”یہ بارش تھمنے والی نہیں۔ تم آج رات دکان کے اوپر والے کمرے میں بی سو جانا۔“

قسم کی تھی جیسی لندن میں آج سے سو سال پہلے چلا کرتی تھیں۔ انہیں میں نے پرانی انگریزی فلموں میں دیکھ رکھا تھا۔ چاروں طرف سے یہ کبھی ڈبے کی طرح بند ہوتی تھی۔ اس میں چڑھنے اترنے کی جگہ ہوتی تھی اور روشندان بھی ہوتے تھے۔ کوچوان کبھی کے باہر اونچی سیٹ پر تریپال اوڑھ کر بیٹھتا تھا۔ آگے ایک گھوڑا جتا ہوتا تھا۔ کبھی میں بیٹھنے کے بعد بارش کا شور زیادہ سنائی دینے لگا۔ بارش کی موٹی موٹی بوندیں کبھی کی چھت پر گر کر شور مچا رہی تھیں۔ مجھے یہ شور بڑا اچھا لگا۔ اس لئے کہ بارش کے شور نے باقی تمام واہیات شور و غل کو ختم کر دیا تھا۔

مجھے بارش کے شور میں ہمیشہ ایک میوزک سنائی دیتا تھا اور آج بھی سنائی دیتا ہے۔ بارش جنگل کے درختوں پر گرتی ہے تو چٹوں سے موسیقی کی زبان میں بات کرتی ہے۔ اس وقت میرا جی انگلش کافی کے ساتھ ٹرکس سگریٹ پینے کو چاہتا ہے۔ بارش موسلا دھار ہو رہی ہو تو میں پائپ سلگا لیتا ہوں۔ ہلکی بارش میں سری لنکا کی چائے سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ صحن چمن میں موتیا اور گلاب کے پھولوں پر بارش کے قطرے گر رہے ہوں تو میں سگریٹ، چائے کافی اور پائپ کے ایوانوں سے باہر آ جانا ہوں۔ اس وقت میرے لئے بارش میں اڑتی موتے اور گلاب کی خوشبو ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ سردیوں کی راتوں کی بارش مجھے اعلیٰ بروئے کے خاموش کالج میں آتھان کے پاس لے جاتی ہے۔ ساون کی بارشوں نے مجھے جنوبی ہند کے جنگلوں سے ملایا تھا۔ موسم برسات کی بارشوں میں مجھے قدیم بارہ دریوں اور ویران مغلیہ محلات کی دیواروں پر چڑھی ہوئی جنگلی گلاب کی بیلوں کی یاد آتی ہے۔ آہ! سبزی مائل سفید جنگلی گلاب کے پھولوں پر گرتی بارش!

اس وقت ضرور گلاب کے پھولوں پر الہام کی کیفیت طاری ہو جاتی ہوگی۔ اگر مجھے پھولوں کی زبان آتی۔ اگر میں پھولوں کی خاموش زبان سمجھ سکتا تو اس وقت پھول مجھے ضرور بتاتے کہ وہ کہاں سے چلے تھے۔ انہوں نے کس حالت میں کس شکل میں اپنا سفر شروع کیا تھا اور کیسے مٹی سے پھول بن گئے۔ پھر وہ مجھے ضرور بتاتے کہ تم بھی مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ تم بھی اگر چاہو تو پھول بن سکتے ہو۔ پھر وہ مجھے اڈا خوشبو کی آواز میں بتاتے کہ دنیا کا پہلا پھول کب کھلا تھا اور وہ کونسی رات تھی جب جنت سے پہلے پھول کی خوشبو نکل کر زمین پر اتری تھی۔ مگر میں پھولوں کی زبان نہ ناواقف تھا۔ میں بارش کی زبان سے بھی ناواقف تھا۔ میں بارش کی صرف آواز

”میں اخبار کے دفتر میں نوکری کا پتہ کرنے جاتا ہوں۔“
وہ بولا۔

”تمہیں ایڈریس معلوم ہے ناں؟ وہاں اکیلے پہنچ جاؤ گے؟“
میں نے کہا۔
”رکشا لے لوں گا۔“

آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ مدراسی، بنگالی، برمی عورتیں بالوں میں پھول لگائے گزر رہی تھیں۔ ایک ریستوران کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے کافی کی گرم خوشبو آئی۔ میں نے چوک میں آکر رکشا لیا اور اسے وہاں کی ہندوستانی میں کہا کہ سولی پیگڈا چلو۔ سولی پیگڈا کی سیڑھیوں پر میری بارش، میری بارش کا پھول، میرے پھول کی خوشبو بیٹھی ہوگی۔ میں رات بھر کی بارش کے بعد اس کے کنول ایسے اداس چہرے کو دیکھتا چاہتا تھا۔ میں اس سے پوچھتا چاہتا تھا۔
”ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے؟ تو نے یہ رقص کہاں سے سیکھا تھا؟
ایراوتی تو اتنی اداس کیوں ہے؟“

سولی پیگڈا کے ناریل اور دیودار کے گھنے درخت بارش میں بھیگ کر زیادہ گرمے ہو گئے تھے۔ پیگڈا کی سیڑھیوں کی دونوں جانب ترناری کی سبز بیلوں پر کاسنی پھول ہوا میں مسکرا رہے تھے۔ ناریل کے درختوں کے نیچے کچے ناریل گرمے ہوئے تھے۔ میں پیگڈا کی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ ہر سیڑھی پر میرے دل کی دھڑکن میں تھوڑا سا اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ دُور محبت کی دھڑکن تھی۔ اس سے ہارٹ انیک نہیں ہوتا۔ اس سے دل گرم ہو کر روشن ہو جاتا ہے۔ جس طرح بجلی کے بلب میں زیادہ حدت پہنچے تو وہ روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے آس پاس دوسری پھول پہنچنے والی لڑکیاں اور عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ مگر ان ستاروں میں وہ چاند سب سے نمایاں تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ہماری بات چیت بہت شکستہ اردو میں ہوئی تھی۔ مگر میں یہاں اس کے مکالموں کو آسمان اردو میں ہی لکھوں گا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ ذرا ماسکرائی۔ میں نے گیندے کا ایک ہار اٹھا کر اس سے دام پوچھے۔ اس نے کہا۔
”دس سینٹ۔“

میں نے کہا۔

”کنول کے پھول کے تو پانچ سینٹ تم نے لئے تھے۔ اس کے دس سینٹ

میں رنگون کی بارش میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ سوتے وقت آدی مر جاتا ہے۔ میں بارش میں ساری رات رنگون کی بھیگتی سڑکوں پر پھرتا چاہتا تھا۔ میں اس بارش میں کسی ریستوران میں کافی کی پیالی سامنے رکھ کر ریستوران کے شیشوں میں سے سڑک پر گرتی بارش کو دیکھا چاہتا تھا۔ شہر کی کچی سڑکوں پر گرنے سے بارش زخمی ہو جاتی ہے۔ بارش جنگلوں، دریاؤں سمندروں وادیوں اور درختوں اور پھولوں پر گرنے کے لئے بادلوں سے اترتی ہے۔ میں درخت بن کر، گھنے درختوں والا جنگل بن کر بارش کے ہر قطرے کو اپنی نرم شاخوں، نرم پتوں پر گرانا چاہتا تھا۔ میں سولی پیگڈا کے معبد میں جا کر اس کی سیڑھیوں پر پھول پہنچنے والی اداس برمی لڑکی کو بارش میں بھیگتے دیکھتا چاہتا تھا۔ اس کے سارے پھولوں کو بارش میں بھیگتے دیکھتا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس وقت وہاں نہیں تھی تو میں اس جگہ کو بارش میں بھیگتے دیکھتا چاہتا تھا۔ جہاں اس لڑکی نے پھولوں کے برتن رکھے ہوتے تھے۔ جہاں سے پھول چلے جاتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر تک ان کی خوشبو ضرور باقی رہتی ہے۔ جس طرح سورج غروب ہونے کے بعد آسمان پر کچھ دیر کے لئے اپنی روشنی ضرور چھوڑ جاتا ہے۔

مگر رات کو بارش ہوتی رہی اور میں کریم الدین کی دکان کے اوپر والے ڈربہ نماسرے میں بانس کی چارپائی پر لیٹا بارش سے ملنے کے بارے میں سوچتا ہی رہا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی۔ رات بھر رنگون کے درخت بارش میں شرابور ہوتے رہے۔ بارش میرے ڈربے کی کھڑکی پر آکر رات بھر دسکیں دیتی رہی مگر میں سوچا تھا۔ مر چکا تھا۔

دوسرے روز صبح دیر سے اٹھا۔ دکان کھل گئی تھی۔ کریم دکان پر موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔
”میں تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے بھی ابھی ناشتہ نہیں کیا۔ چا ریستوران میں چل کر ناشتہ کرتے ہیں۔“

بازار رات بھر کی بارش کے بعد بھیگے ہوئے تھے۔ مگر پانی کہیں نہیں کھڑا تھا۔ رنگون کی سڑکیں اس طرح سے بنائی گئی تھیں کہ چاہے جتنی بارش ہو پانی کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ ہم ایک ریستوران میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ بازار میں فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ جو درخت کھڑے تھے بارش میں بھیگنے کے بعد زیادہ سرسبز ہو رہے تھے۔ اس وقت دن کے نونج رہے تھے۔ میں نے کریم سے کہا۔

ایسی آواز تھی جیسے ہوا کا تیز جھونکا ناریل کی شاخوں میں سے گزر گیا ہو۔
 ”سائیں۔ سائیں۔ بڑا اچھا نام ہے۔“

وہ شرمانی۔ اس دوران ساتھ والی عورت اس سے بری زبان میں باتیں کرنے لگی۔ میں پھول لے کر اٹھا اور سیڑھیاں چڑھ کر بودھ معبد کے بڑے صحن میں آگیا۔ معمول کے مطابق میں کونے والے ناریل کے درختوں کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مگر بارش رکی ہوئی تھی۔ میرے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ رنگون میں ایک دن بارش ہوتی ہے تو بادل چار دن تک چھائے رہتے ہیں۔ میں سائیں کا نام دہرانے لگا۔ سائیں۔ یہ نام بڑا مختصر اور اداس تھا۔ اس نام کا رنگ زرد تھا۔ کنول کے زرد پھول کی طرح۔ سائیں کے خوبصورت معصوم چہرے کی طرح۔ میں نے گیندے کے پھول ناریل کے درخت کے پاس رکھ دیئے اور واپس چل پڑا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے سائیں کو دور سے دیکھا۔ سیڑھیاں کافی کشادہ تھیں۔ سائیں نے بھی مجھے دیکھا۔ میں ذرا سا مسکرا دیا۔ سائیں بھی ذرا سا مسکرائی اور پھر منہ دوسری طرف کر کے پھولوں کو ادھر ادھر کرنے لگی۔ ہر روز جانے کی بجائے میں ایک دن چھوڑ کر کبھی دن کے وقت اور کبھی رات کے وقت پھول بیچنے والی سائیں کو دیکھنے سولی بیگودا جاتا۔

ایک روز میں شام ہونے سے ذرا پہلے سائیں کو دیکھنے گیا تو وہ وہاں پر نہیں تھی۔ اس کی پھولوں سے بھری ہوئی بالٹیاں اسی طرح پڑی تھیں۔ جس چوکی پر وہ بیٹھی تھی وہ بھی وہیں پر تھی۔ دوسری پھول بیچنے والی عورتیں پھول بیچ رہی تھیں۔ میں ذرا اوپر جا کر سیڑھیوں کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تین چار بھکشو جن کو برا میں جہنگی کہا جاتا تھا زعفرانی لبادوں میں ملبوس بانس کی چھتریاں تانے ہاتھوں میں مٹی کے پیالے لئے سیڑھیاں چڑھ کر میرے قریب سے گزر گئے۔ مٹی کے پیالوں میں پھول اور زرد کیلے تھے۔ وہ اپنی زبان میں آہستہ آہستہ کوئی بھجن گا رہے تھے۔ آسمان اس روز بھی ابر آلود تھا۔ دن کے وقت تھوڑی سی بارش ہوئی تھی۔

سائیں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میری نظریں بار بار اس طرف اٹھتی جہاں وہ بیٹھتی تھی۔ اتنے میں میں نے دیکھا وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی چھوٹی سی ٹوکری تھی جو لمبے لمبے ڈنٹھلوں والے کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تو میں اس کے پاس گیا۔ میں نے

”کیوں؟“

وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”یہ پھول ہمیں بڑی دور سے جا کر لانے پڑتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”تم یہ پھول کہاں سے لاتی ہو؟“

اس نے کہا۔

”اپنے گاؤں سے۔“

”تمہارا گاؤں کہاں ہے؟“

”کمانیٹ کے پاس۔“

”کمانیٹ کہاں ہے؟“

وہ ہنسنے لگی۔

”تم پہلی دفعہ رنگون آئے ہو؟“

میں نے کہا۔

”ہاں۔“

اس نے گیندے کے پھول کیلے کے پتے میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

”کمانیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ وہاں سے دو کوس پر ہمارا گاؤں ہے۔ کنول کے پھول ہم اپنے تالاب میں اگاتے ہیں۔ گیندے اور ترنابری کے پھول ہمارے دور جا کر لانے پڑتے ہیں۔“

میں نے اسے دس سینٹ دے کر گیندے کے پھول لے لئے۔ وہ بولی۔

”تم بودھی ہو؟“

میں نے کہا۔

”میں مہاتما بدھ سے محبت کرتا ہوں۔“

میں اس سے باتیں کرنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ میں دوسرے پھول

کو دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”سائیں۔“

مجھے یہ نام اس پھول بیچنے والی بری لڑکی کی طرح بڑا اچھا لگا۔ اس نام

ٹوکری والے کنول کے سفید پھولوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
 ”یہ تم کہاں سے لائی ہو سائیں؟“
 وہ کہنے لگی۔

”نیچے ایک جگہ ہم نے پھول رکھے ہوتے ہیں۔ جب یہاں پھول ختم ہو جاتے ہیں تو نیچے سے لے آتی ہوں۔“
 میں نے کنول کا ایک پھول اٹھا لیا۔ بے حد سفید پاکیزہ پھول تھا۔ میں نے اس کے دامن پوچھے۔ سائیں نے کہا۔
 ”پانچ سینٹ کا ایک پھول ہے۔“
 میں نے کہا۔
 ”یہ اتنا مہنگا کیوں ہے؟“

وہ بولی۔
 ”یہ بڑا مقدس پھول ہے۔ کہتے ہیں یہ پھول بھگوان بودھ کو بڑا پسند تھا۔“
 میں نے پانچ سینٹ دے کر پھول لے لیا۔

”سائیں! یہ پھول جب مرجھا جاتے ہیں تو تم ان کا کیا کرتی ہو؟“
 سائیں نے رجنی گندھا پھولوں کی ٹہنیوں کے پتے توڑتے ہوئے کہا۔
 ”ہم اپنے پھول سورج نکلنے سے پہلے ایراوتی کے پانی میں ڈبو کر لاتی ہیں۔ میری ماں کہتی ہے کہ پھول اگر سورج نکلنے سے پہلے دریائے ایراوتی کے پانی میں بھگوئے جائیں تو وہ مرجھاتے نہیں۔“
 میں نے کہا۔

”میں یہ پھول اپنے پاس رکھوں گا۔ کل پھر آؤں گا۔ تم ملو گی ناں؟“
 سائیں نے کچھ شرما کر کچھ سنجیدہ ہو کر میری طرف دیکھا اور کوئی جواب دیا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور بیڑھیاں اترنے لگا مجھے خیال آیا کہیں سائیں کو میں ایسی بات تو نہیں کہہ دی جو مجھے نہیں کہنی چاہئے تھی۔

اس دوران میرے پیسے ختم ہو گئے۔
 میں ملازمت کی تلاش میں رنگوں کے اردو اخبار کے دفتر میں پہنچ گیا۔
 مہجرات کے شاہ جی دونوں اخباروں کو ایڈٹ کرتے تھے۔ بڑے شریف النفس انسان تھے۔ چہرے پر ہر وقت ایک شفقت آمیز مسکراہٹ رہتی تھی۔ انہوں نے مجھے اخبار کے پروف پڑھنے پر ملازم رکھ لیا۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پروف پڑھنے کے بعد میں آزاد ہوتا تھا۔ کبھی رنگوں کی سڑکوں پر پھرتا رہتا۔ کبھی سائیں کو دیکھنے سولی پیکوڈا کی طرف چلا جاتا۔ سائیں اب مجھ سے تھوڑا بے تکلف ہو گئی تھی۔ میں اس سے پھول خرید کر اوپر معبد کے صحن میں ناریل کے درختوں کے قدموں میں رکھ آتا۔

ایک دن میں آوارہ گردی کرتا رنگوں کی ایک مشہور مارکیٹ میں آ گیا۔
 یہاں ہر قسم کی چیزیں بکتی تھیں۔ گرد سری کی دکانیں بھی تھیں۔ کپڑے کی دکانیں بھی تھیں اور سبزی اور پھلوں کی دکانیں بھی تھیں۔ رنگوں میں آسٹریلیا سے انگور اور سیب آیا کرتے تھے۔ سیب ترش ہوتے تھے مگر ان کا رنگ بڑا سرخ ہوتا تھا۔ میں ایک دکان کے پاس کھڑا سرخ سیبوں کو دیکھ رہا تھا کہ میری نظر سائیں پر پڑ گئی۔ وہ پھلوں والی دکان سے ایک دکان چھوڑ کر کپڑے کی دکان سے کپڑا خرید رہی تھی۔ بانس کی جھوٹی ٹوکری اس کے پاس تھی جس میں کچھ بھرے ہوئے لفافے رکھے تھے۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ سائیں میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے کہا۔

”کپڑا خرید رہی ہو سائیں؟“

”ہاں۔“

اس نے آہستہ سے کہا اور دکاندار بری زبان میں کچھ کہا۔ دکاندار نے ”سرا تھان نکال کر دکھایا۔ سائیں کپڑا بھی دیکھتی رہی اور دکاندار سے اپنی زبان میں کچھ کہتی بھی رہی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آج بالوں میں سفید موگرے کی

بڑی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ سائیں بس میں سوار ہو گئی۔ وہ کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بس چلنے لگی تو اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہوا کے لطیف جھونکے نے مجھے زمین سے اوپر اٹھالیا ہے۔ میں دل میں سائیں کی محبت کے احساس کو سینے سرمستی کے عالم میں بازار میں ایک طرف چل پڑا۔

اسی روز شام کو میں سائیں سے ملنے سولی پیگوڈا چلا گیا۔ سائیں مجھے دیکھتے ہی مسکرائی۔ کہنے لگی۔
 ”آج کنول کے پھول ختم ہو گئے ہیں۔“
 میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں میں گیندے کے پھول لے لوں گا۔“
 وہاں یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی کہ جب میں سائیں سے باتیں کر رہا ہوتا تھا تو دوسری پھول بیچنے والی عورتیں ہماری طرف زیادہ توجہ نہیں دیتی تھیں۔ وہ زیادہ زاپے اپنے گاہکوں کے ساتھ مصروف ہوتی تھیں۔ سائیں کیلے کے پتے میں گیندے کے پھول لیٹ رہی تھی۔
 ”دس سینٹ پلینز۔“

سائیں مجھے پھول دیتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ میں نے پھولوں کا پیکٹ پکڑنے کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی تھوڑی دیر کے لئے پکڑ لیا۔ سائیں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں نے جیب سے دس سینٹ نکال کر دیے۔ سائیں نے آہستہ سے سر جھکا کر کہا۔

”تھینک یو۔“

میں اوپر جانے کی بجائے نیچے کی طرف بیڑھیاں اترنے لگا۔ تین چار بیڑھیاں اترنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ سائیں مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہماری آنکھیں ملیں تو سائیں نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

شروع محبت کے یہ وہ انمول لمحات ہوتے ہیں جو تیز ہوا کے جھونکے کی طرح آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن جنہیں انسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔ تین برس گزر جانے کے بعد ویران کالج میں بیٹھا اپنی داستان محبت رقم کرتے ہوئے اُن ان لمحات کو یاد کرتا ہوں تو مجھے کل کی بات لگتی ہے۔ زندگی کی حسین یادوں کے

کلیاں سجائی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کلیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ سائیں کپڑا خریدے بغیر آگے بڑھی تو میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ مارکیٹ میں کچھ دور چلنے کے بعد سائیں نے کہا۔

”آج میں سولی پیگوڈا شام کو جاؤں گی۔“

میں نے فوراً کہا۔

”میں شام کو پھول خریدنے آؤں گا۔“

سائیں نے چلتے چلتے گردن موڑ کر ایک نظر مجھے دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

”تم بودھی نہیں ہو۔ پھر سولی پیگوڈا کیوں آتے ہو؟“

یہ سوال ایک بار پہلے بھی سائیں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے اس وقت اسے کوئی اور جواب دیا تھا۔ اب میں نے کہہ دیا۔

”میں صرف تمہیں دیکھنے آتا ہوں۔“

میں نے یہ بات بے دھڑک کہہ دی تھی۔ سوچنے لگا کیسے سائیں برا نہ مان جائے۔ سائیں میرا جواب سن کر رک گئی۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔

”کیوں؟ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے؟“

میں سائیں کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں کوئی ماہر نفسیات نہیں تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس پھول بیچنے والی لڑکی پر میرے اظہار محبت کا کیا اثر ہوا ہے۔ میں نے کہہ دیا۔

”مجھے تم بڑی اچھی لگتی ہو۔“

اب وہ شرمانی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل پڑی۔ میں نے کہا۔

”اگر تمہیں اچھا نہیں لگتا تو میں نہیں آیا کروں گا۔“

سائیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم مارکیٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ سائیں ایک بس سٹاپ پر رک گئی۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

”سائیں! کیا میں تمہیں دیکھنے نہ آیا کروں؟“

سائیں اس طرف دیکھ رہی تھی جس طرف سے بس آنے والی تھی۔ خاموش رہی۔ اتنے میں بس آگئی۔ مسافر بس میں سوار ہونے لگے۔ سائیں بھی آ

ریڈیو شیش پر بڑی رونق ہوتی۔ ریڈیو شیش کی عمارت میں داخل ہوتے ہی بڑی نازک اندام سنگ مرمر جیسی بری لڑکی کے درشن ہوتے۔ یہ بری لڑکی ڈیوٹی آفسر تھی۔ اردو پروگرام کے انچارج ضلع جھنگ کے ایک پرانے صحافی مسٹر ملک تھے جو رنگون کے اردو اخبار میں بھی نوز ایڈیٹر تھے۔ بڑے زندہ دل شاہ خرچ آدمی تھے۔ شراب کے رسیا تھے۔ اکثر پئے ہوئے ہوتے تھے مگر اپنی ڈیوٹی کے بڑے پکے تھے۔ کام میں ذرا سی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ ریڈیو شیش کے ڈائریکٹر پر کھالی نسل کے کرہین مسٹر میکائے تھے۔ گھرا سانولا رنگ عمر چالیس کے اوپر تھی ہر وقت سگار منہ میں دبائے رکھتے۔ بات کرنے وقت بھی سگار منہ میں ہوتا۔ صرف قہقہہ لگاتے وقت سگار منہ سے نکالتے۔

ریڈیو انجینئر اسی عمر کے ایک زرد رنگ کے ولندیزی نسل کے عیسائی مسٹر ڈی کوشا تھے۔ بڑے نرم دم گفتگو تھے۔ ہم سب سے انگریزی میں بات کرتے۔ لہجہ بڑا دھیمہ ہوتا۔ وہ کبھی کبھی ہندوستانی میں بھی بات کر لیتے تھے۔ دریائے ایراوتی کے پاس ناریل کے ذخیرے میں ان کا اونچی چٹان والا بانس کا بنا ہوا چھوٹا سا بڑا خوبصورت سا گھر تھا۔ ان کی بیوی بھی بڑی کم گو اور دھیمے مزاج کی خاتون تھی۔ ان کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ ایک مدراسی نوکرانی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ رنگون ریڈیو اور اخبار کے دفتر کی آمدنی ملا کر میرے پاس کافی پیسے جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ میں اپنے دوست کریم کے ہاں سے اٹھ کر لیوس سٹریٹ کے ایک فلیٹ میں آ گیا تھا۔ یہ ایک کمرے کا فلیٹ تھا۔ ہاتھ بوم ساتھ تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا کچن تھا۔

اپنے حساب سے میں رنگون میں بڑا سیٹ ہو گیا تھا۔ اس شہر میں میرا جی بھی لگ گیا تھا۔ میرا دوست کریم الدین مجھے دوسری تیسرے دن ملنے کبھی ریڈیو شیش اور کبھی میرے فلیٹ پر آ جاتا تھا۔ ہم کافی بنا کر پیتے۔ خوب باتیں کرتے۔ میں نے سائیں سے اپنی محبت کے بارے میں اس سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے سائیں کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنی محبت کو اپنے دل میں اس طرح چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ اگر کسی سے ذکر کیا تو محبت کے پودے کو ہوا لگ جائے گی۔ اس کی شاخیں مرجھا جائیں گی۔ اور پودا مرجائے گا۔ میں ہفتے میں دو تین بار سائیں سے ملنے سولی بیگودا ضرور جاتا۔ اب وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگو تھی۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے ابھی تک مجھ

یہ وہ تاج محل ہیں جو کبھی دیران نہیں ہوتے۔ کبھی کھنڈر نہیں بننے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ان میں لافانی محبتوں کی نشانی ممتاز محل ضرور ہو۔

رنگون میں وقت گزرتا چلا گیا۔ یورپ میں جنگ تیز ہوتی گئی۔ جنگ کے شعلے بن غازی اور طروق تک پہنچ گئے۔ مجاہد برا اور شیر رنگون اخباروں کے ایڈیٹر شاہ جی نے مجھے رنگون ریڈیو پر بھی جزوقتی کام دلا دیا۔ رنگون ریڈیو سے شام کے وقت اردو میں ایک گھنٹے کا پروگرام نشر ہوتا تھا۔ مجھے اس پروگرام میں پانچ منٹ کی پنجابی زبان میں خبریں پڑھنی ہوتی تھیں۔ میں اردو کے لیٹن کو پنجابی میں ترجمہ کرنا اور پھر بوتھ میں جا کر خبریں پڑھ دیتا۔ یہ کام مجھے بہت اچھا لگا۔ پنجابی میں خبریں اس لئے رنگون ریڈیو سے نشر ہونا شروع ہوئی تھیں کیونکہ جنگ کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا اور بن غازی طروق کے محاذ پر برطانوی ہندوستان کی جو فوجیں جرمنوں کے خلاف لڑ رہی تھیں ان میں پنجابی ریمینٹوں کی تعداد نوے فی صد تھی۔ برٹش انڈین فوج کے ان پنجابی جوانوں کے لئے پنجابی میں گانے بھی نشر ہوتے تھے۔

رنگون ریڈیو کی دو منزلہ عمارت فریئر سٹریٹ میں میکسم بار والی سٹریٹ کے آخر میں جا کر تھی۔ آگے یہ سٹریٹ بند ہو جاتی تھی۔ کہنے کو یہ سٹریٹ تھی مگر یہ ایک چھوٹے بازار کی طرح تھی۔ اس میں دکان وغیرہ کوئی نہیں تھی۔ میں وقت سے بہت پہلے ریڈیو شیش پہنچ جاتا۔ میکسم بار کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر جھانک کر ضرور دیکھتا۔ اس بار یا شراب خانے کے مدراسی میئنجر کا نام مسٹر مہیشی تھا۔ درمیانے قد کا باکس ٹائپ کا آدمی تھا۔ سر کے بال درمیان میں سے غائب تھے الماریوں میں لگی شراب کی بوتلوں کے پاس کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا کاک ٹیل وغیرہ بنا رہا ہوتا تھا۔ ملکی اور غیر ملکی لوگ میزوں کے گرد کرسیوں پر بیٹھے بادہ نوشی میں مصروف ہوتے۔ میں ان لوگوں کو بڑے شوق سے دیکھتا۔ ان میں سے اکثر نشے میں ہوتے تھے اور ادھانچا بول رہے ہوتے تھے۔ ایک گھنٹے کے اردو پروگرام میں ہفتے میں ایک دن بنگلہ گانے اور ایک دن تامل تلیگو گانے بھی نشر ہوتے تھے۔ کیونکہ انڈین برٹش آرمی میں مدراس، بنگال اور کیرالہ وغیرہ صوبوں کے فوجی بھی تھے۔ لیکن لڑنے والی فوج پنجابیوں اور گورکھوں کی ہی تھی۔ بنگالی اور مدراسی پیچھے سپلائی وغیرہ میں ہوتے تھے۔ مدراسی عام طور پر فوج میں لاگری ہوتے تھے جو لشکر میں فوجیوں کے لئے کھانا وغیرہ پکاتے تھے۔

”ہاں ہاں۔ یہی نام ہے اس کا۔ میری ایک خالہ اس ہوٹل میں کپڑے تزی کرنے پر نوکر ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک بار ریڈیو شیشن دیکھنے گئی تھی۔“
میں نے کہا۔

”سائیں! میں شام کو چار بجے کے بعد ریڈیو شیشن پر ہی ہوتا ہوں۔ تم کسی دز ضرور آؤ۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“
سائیں شرما سی گئی۔ کہنے لگی۔

”تم مجھ سے یہاں زیادہ دیر باتیں کرتے ہو تو دوسری عورتوں کو شک پڑ سکتا ہے۔“

میں نے پھول اٹھائے اور کہا۔

”اچھا۔ میں جاتا ہوں۔ پرسوں آؤں گا۔“

میں نے بری انداز میں ہاتھ جوڑ کر اسے سلام کیا۔ اس نے مسکرا کر اسی لرح میرے سلام کا جواب دیا اور میں اپنے دل میں سائیں کی محبت کی گرمی، توانائی و روشنی لئے وہاں سے واپس آگیا۔

تیسرے روز دوپہر کے وقت میں سائیں سے ملنے گیا تو وہ اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ میں اس خیال سے کہ دوسری پھول بیچنے والی عورتوں کو شک نہ پڑ جائے اس طرح بیڑھیاں چڑھ کر بودھ بیگودا کے صحن میں چلا آیا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں ناریل کے درختوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے درختوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سوری! سائیں نہیں تھی اس لئے تمہارے لئے پھول نہیں لاسکا۔“

ناریل کے درخت ہوا میں اپنی لمبی لمبی شاخیں آہستہ آہستہ لہراتے ہوئے مکرائے۔ میری نظر بیگودا کے بڑے ہال کے دروازے کی طرف تھی جہاں لوگ عبادت کرنے کے لئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ فضا میں اگر تپوں کی بوجھل خوشبو بھگی ہوئی تھی۔ ہال کے اندر جہاں مہاتما بدھ کا سونے کا پترے والا یا شاید سارے کا سارا سونے کا بت بڑا مجسمہ نصب تھا، روشنی ہو رہی تھی۔

اچانک میں نے سائیں کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے جھکی جھکی معبد کے ہال کمرے سے الٹے قدموں واپس آ رہی تھی۔ دروازے کے باہر آکر اس نے تین بار جھک کر تعظیم کی اور پھر سیدھی ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اس کے دونوں

سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن اس کی باتوں سے اور جس طرح وہ میرا انتظار کرتی تھی اور مجھ سے مل کر جس طرح خوش ہوتی تھی اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔ یہاں میں ایک بات ضرور بیان کرنا چاہوں گا کہ میں اس زمانے میں گورا چٹا خوبصورت کشمیری لڑکا ہوا کرتا تھا۔

میری اور سائیں کی محبت کا سلسلہ ابھی تک صرف سولی بیگودا کی سیڑھیوں تک ہی محدود تھا۔ ہم کبھی کسی ریسٹوران میں کافی وغیرہ پینے نہیں گئے تھے اور میں نے سائیں کو اپنے فلیٹ پر آنے کی بھی دعوت نہیں دی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں رنگون ریڈیو پر نوکر ہو گیا ہوں اور پنجابی زبان میں شام کے وقت خبریں پڑھتا ہوں تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا تم بری فلمی گانے بھی لگاتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”نہیں سائیں! میں صرف اردو زبان کے پروگرام میں پانچ منٹ کے لئے

خبریں پڑھتا ہوں۔“

کہنے لگی۔

”میں نے رنگون کا ریڈیو شیشن دیکھا ہے۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔

”تم وہاں کیسے گئی تھیں؟“

سائیں نے آنکھ سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک بری بوڑھا آکر پھولوں کو پسند کرنے لگا۔ اس نے کتول کے پھولوں کا گلدستہ اٹھا کر بری زبان میں شاید اس کی قیمت پوچھی۔ سائیں نے بھی بری زبان میں اسے کچھ کہا۔ پھر گلدستہ کیلے کے پتے میں لپیٹ کر اسے دیا۔ سینٹ لے کر چھوٹے سے ڈبے میں ڈالے اور میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”جس سڑیٹ میں ریڈیو شیشن ہے اس کے سامنے ایک بہت بڑا ہوٹل بھی

ہے ناں؟“

میں نے کہا۔

”ہاں ہے گرینڈ ہوٹل۔“

درخت خاموش رہے۔ ان کی بڑی بڑی شاخیں ہوا میں آہستہ آہستہ لہراتی رہیں۔ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ دل میں ایک پچھتاوا سا لگ گیا تھا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سائیں ضرور مجھ سے ناراض ہو گئی ہوں گی۔ میں دوسری طرف سے ہو کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ میں اس پھول بیچنے والی بری لڑکی کی محبت میں سرشار تھا۔ رنگوں کی بارشوں، رنگوں کی بارشوں میں بھگتے درختوں، پارکوں، رنگوں کے ریسٹوران اور بازاروں اور مارکیٹوں میں پھیلی ہوئی چائے، کافی، سگار اور رجنی گندھا کے پھولوں کی خوشبو میں مجھے سائیں کا مسکراتا ہوا معصوم چہرہ نظر آتا۔ رنگوں کی فریئر سٹریٹ میں ایک ریسٹوران ہوا کرتا تھا۔ اس ریسٹوران کا نام ترکی ہوٹل تھا۔ کبھی کبھی میں اپنے دوست کریم الدین کے ساتھ وہاں چائے پینے آ جاتا تھا۔ اس ہوٹل میں ریکارڈنگ بھی ہوتی تھی اور سہگل، کان دیوی اور بکاش کے گانے لگا کرتے تھے۔ نیو تھیٹر کی ان فلموں کے گانے بڑے اداس تھے۔ ایک روز بارش ہو رہی تھی۔ میں اور کریم ترکی ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ فلم سپیرا کا ایک گانا لگا۔

”کون دیس ہے جانا بابو“

”کون دیس ہے جانا“

شام کا وقت تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ عجیب درد انگیز میوزک تھا۔ عجیب رنگوں کی شام کی بارش کی آواز تھی۔ عجیب چائے کی خوشبو تھی۔ پھر وہاں نہ ترکی ہوٹل تھا نہ چائے کی خوشبو تھی۔ نہ بارش کی آواز تھی۔ نہ سائیں تھی، نہ چندر مکھی تھی۔ نہ میری امرتسر کی پہلی محبت تھی۔ دیکھے ہوئے چہرے اجنبی لگتے تھے۔ اجنبی چہرے غائب ہو گئے تھے۔ یہ کوئی خیال بھی نہیں تھا۔ یہ کوئی وہم بھی نہیں تھا۔ ایک کشتی تھی جس پر میں بیٹھا تھا۔ ایک دریا تھا جس میں کشتی بہتی جا رہی تھی۔ پھر دریا کشتی کے نیچے سے نکل گیا اور کشتی سمندر کی موجوں پر ہچکولے کھانے لگی۔ پھر یہ سمندر میری کشتی کو لے کر ایک جنگل میں داخل ہو گیا۔ میں اسی دیس سے آیا تھا۔ مجھے اسی دیس میں جانا تھا۔ --- ”اب میں چلتا ہوں۔ مجھے دکان پر بھی جانا ہے۔“

اپنے دوست کریم کی آواز پر میں نے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ بہت جانا پچھتاوا بہت اجنبی لگا۔ ہم ترکی ہوٹل سے اٹھ کر فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ کریم نے چھتری

ہاتھوں میں گیندے کے پھول تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ پھر مسکراتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر میرے قریب آ گئی۔ میں نے کہا۔

”سائیں! تم نیچے نہیں تھیں۔ میں تمہیں دیکھنے یہاں آ گیا کہ شاید تم یہاں

ہو۔“

وہ میرے ساتھ چلتی ٹاریل کے درختوں والی دیوار کے پاس آ گئی۔ کئی

لگی۔

”میں اس وقت روز بھگوان بدھ کی پوجا کرتی ہوں۔“

”یہ پھول تم اندر سے لائی ہو کیا؟“

”ہاں۔“ سائیں نے پھولوں کو چوم کر کہا۔ ”یہ بڑے مقدس پھول ہیں۔

میں یہ بھگوان بدھ کے قدموں کو چھوا کر لائی ہوں کہتے ہیں جس گھر میں یہ پھول ہوں اس گھر میں کبھی کوئی مصیبت نہیں آتی۔“

میں نے کہا۔

”مگر یہ پھول تو دو تین دنوں میں سوکھ جائیں گے۔“

سائیں بولی۔

”یہ پھول سوکھ بھی جائیں تو ان میں بھگوان بدھ کے مقدس قدموں کا اثر

ضرور رہتا ہے۔“

میں نے سائیں سے پوچھا۔

”کیا میں ان پھولوں کو چوم سکتا ہوں؟“

”ہاں۔“ سائیں نے اپنی ہتھیلی آگے کر دی۔ میں نے جھک کر پھولوں

بجائے سائیں کی ہتھیلیاں چوم لیں۔ سائیں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لئے اور

سے کوئی بات کہنے بغیر تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔ مجھے محسوس

کہ سائیں نے میری اس خوبصورت حرکت کو شاید پسند نہیں کیا۔ کہیں وہ مجھ

ناراض نہ ہو گئی ہو۔

میں نے ٹاریل کے ساتھ ساتھ آگے ہوئے دونوں درختوں سے مخاطب

پوچھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

کھول لی تھی۔ ہم دونوں اس کے نیچے ایک دوسرے سے لگ کر چل رہے تھے۔ بارش بڑی موسلا دھار تھی۔ وہ مجھے یوس سٹریٹ میں میرے فلیٹ کے دروازے پر چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ بارش فلیٹ کے دروازے پر ہی مجھ سے جدا ہو گئی۔ رنگون میں یہ اس قسم کی آخری موسلا دھار بارش تھی۔ اس کے ساتھ ہی جنوب مشرقی ایشیا میں برسات کا موسم ختم ہو گیا۔ اکتوبر نومبر کے مہینوں میں کبھی کبھار بادل آتے اور ہلکی بارش ہو جاتی تھی۔

1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تھی۔ یورپ میں جنگ زوروں پر تھی۔ یہ 1941ء کا سال جا رہا تھا۔ دسمبر 1941ء کا مہینہ شروع ہوا تو رنگون میں ایسی ہوائیں پھیلنے لگیں کہ جاپان بھی اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے والا ہے۔ رنگون سیکرٹریٹ کے ارد گرد خاردار باڑ لگا دی گئی۔ سڑکوں کے کنارے ہوائی حملے سے بچاؤ کے شیڈ بننے لگے۔

دسمبر کی چھ یا سات تاریخ تھی کہ جاپان بھی میدان جنگ میں کود پڑا۔ جاپانی فوجیں طوفان کی طرح آگے بڑھیں اور دیکھتے دیکھتے سنگاپور، ہانگ کانگ، جاوا، سائرا اور فلپائن پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا۔ اب ان کا رخ برما آسام کی طرف تھا۔ رنگون پر خوف و ہراس کی فضا چھا گئی۔ راتوں کو بلیک آؤٹ ہونے لگا۔ بری عام طور پر بڑے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جاپانی آئیں گے تو انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات مل جائے گی۔ رنگون ریڈیو سٹیشن پر رات کے وقت بھی اردو اور پنجابی خبروں کے بلیٹن نشر ہونے لگے۔ اخبار شیر رنگون اور مجاہد برما کے دفتر میں اس قسم کی باتیں ہونے لگیں کہ جاپان کا برما پر بھی قبضہ ہو جائے گا کیونکہ یہاں انگریزوں کا دفاع بے حد کمزور ہے۔ انڈیا کی ساری برطانوی فوجیں طبرق اور افریقہ کے محاذ پر لڑ رہی تھیں۔ جاپان کے اعلان جنگ سے جہاں تک مجھے یاد ہے تیسرے یا چوتھے دن جاپانی بمبار طیارے رنگون پر بمباری کرنے آ گئے۔

دن کا وقت تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں اخبار کے دفتر میں بیٹھا پروف ریڈنگ کر رہا تھا کہ اچانک شہر کے سائرن بج اٹھے۔ ایئر ریڈ سائرن بڑی دیر سے بجائے گئے تھے۔ جس وقت سائرن بجے جاپانی بمبار اس وقت رنگون کے اوپر پہنچ چکے تھے۔ ابھی ہم لوگ ہوائی حملے سے بچاؤ کے بکڑ کی طرف دوڑے ہی تھے کہ یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے۔ دھماکے اتنے زبردست تھے کہ زمین اوپر نیچے ہو گئی۔

اس کے بعد دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زمین ایسے ہلنے لگی جیسے مسلسل زلزلہ آ رہا ہو۔ جاپانی جہاز عمارتوں کے درمیان غوطے لگاتے اور مشین گنوں کی تڑاخ تڑاخ فائرنگ کرتے نکل رہے تھے۔ میں ایئر ریڈ بکر میں دفتر کے ایک کاتب کے ساتھ کانوں میں انگلیاں دبے سر جھکائے بیٹھا، کلمہ طیبہ پڑھ رہا تھا۔ کسی بھی وقت جاپانی طیارے میں سے کوئی بم نکل کر ہمارے بکر کے اوپر گر کر ہمارے پرزے اڑا سکتا تھا۔ جب جاپانی طیارے اپنے سارے بم رنگون پر گرا کر چلے گئے تو آل کلیئر کا سائرن بجا۔ ہم بکر سے باہر نکلے۔ شاہ جی گھبرائے ہوئے دفتر کے دروازے پر آئے اور کہنے لگے۔

”کوئی ریڈیو سٹیشن پر جا کر ملک صاحب کی خبر لائے۔“

ایڈیٹر ملک صاحب اس وقت رنگون ریڈیو پر کوئی پراپیگنڈا تقریر کرنے گئے ہوئے تھے۔ میں ریڈیو سٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ وہاں سے رنگون ریڈیو زیادہ دور نہیں تھا۔ سڑک پر ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ فریئر سٹریٹ پر آیا تو دور آسمان پر گہرے سیاہ دھوئیں کے بادل اٹھتے نظر آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رنگون کی بیٹی پر ایک آئیل ٹینکر کھڑا تھا۔ ایک بم اس پر گرنے کے بعد پھٹا تو اسے آگ لگ گئی۔

فریئر سٹریٹ پر ذرا آگے گیا تو دیکھا کہ ایک بم ترکی ہوٹل کے باہر گرا تھا۔ وہاں بہت بڑا گڑھا پڑ گیا تھا۔ ترکی ہوٹل تباہ ہو گیا تھا اور اس کی پیمٹریاں اور سموے سڑک پر دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ میکسم سٹریٹ کے کونے والی عمارت بھی آدمی ڈھے گئی تھی اور اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے گھبرائے ہوئے بھاگے جا رہے تھے۔ میکسم بارنچ گیا تھا لیکن اس گلی میں ریڈیو سٹیشن کی بلڈنگ کا سامنے والا حصہ تباہ ہو چکا تھا۔ جاپانیوں نے رنگون ریڈیو سٹیشن کو سب سے پہلے ٹارگٹ بنایا تھا۔ میں دوسری طرف سے ہو کر ریڈیو سٹیشن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ڈیوٹی روم کی دیوار گر گئی ہوئی تھی اور فرش پر نازک اندام بری لڑکی کی لاش اوندھی پڑی تھی۔ ایک صاحب گھبرائے ہوئے ایک طرف جاتے نظر آئے تو میں نے ملک صاحب کا پوچھا۔ انہوں نے صرف اتنا کہا۔

”وہ چلا گیا تھا۔“

میں ریڈیو سٹیشن کی تباہ حال عمارت سے نکل کر فریئر سٹریٹ پر آ گیا۔ میرا خیال سائیں کی طرف چلا گیا۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہوگی۔ کہیں جاپانیوں نے بیگنڈا پر بم نہ پھینک دیئے ہوں۔ میں سولی بیگنڈا کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ چوک

عینیں تھیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انگریزی حکومت سیکرٹریٹ سے تمام ضروری قائلین لے کر شملے کی طرف بھاگ رہی ہے۔“

اس زمانے میں جب جاپانیوں نے برما پر قبضہ کر لیا تھا تو انگریزوں نے شملے میں براہ گورنمنٹ کا سیکرٹریٹ بنا لیا تھا۔ ایک کاتب نے شاہ جی سے پوچھا۔

”شاہ جی! ہمارا کیا بنے گا؟ ہم تو اپنے وطن سے ہزاروں میل دور سمندر پار بیٹھے ہیں۔“

شاہ جی نے کہا۔

”میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بری لوگ جاپانیوں کا بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ بریوں نے جاپانیوں کے لئے زبردست جاسوسی کی ہے انہوں نے جاپانیوں کو رنگوں میں انگریزی فوج کے سب خفیہ ٹھکانوں کی اطلاع پنچا دی تھی۔ جاپانی طیاروں کو یہ بھی اطلاع تھی کہ رنگوں کی بندرگاہ پر ایک آئیل فینکر کھڑا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اسے ہی نشانہ بنایا۔“

ملک صاحب نے کہا۔

”شاہ جی! میرا خیال ہے کہ دو ایک دن میں جاپانی رنگوں میں پہنچ جائیں گے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ابھی تو شاید ہمیں ملکتے جانے والا سمندری جہاز مل جائے گا۔ اگر دیر کر دی تو ہم یہاں پھنس جائیں گے۔“

شاہ جی کہنے لگے۔

”ملک صاحب! ایسی بھی بات نہیں ہے۔ میری اطلاع کے مطابق انگریزوں نے ایک ڈویژن فوج برما کی مشرقی سرحد پر جاپانیوں کی یلغار روکنے کے لئے روانہ کر دی ہے اور ایک ڈویژن برٹش انڈیا کی فوج طبرق سے برما کی طرف چل پڑی ہے۔“

شاہ جی کی یہ اطلاعات بالکل غلط تھیں۔ انگریزوں نے اپنی ساری فوجی طاقت اتحادیوں کے ساتھ شمالی افریقہ کے محاذ پر جھونک رکھی تھی۔ برما کے محاذ پر صرف چند ایک یونٹ ہی تھے۔ علاوہ ازیں جاپانی استدر تیز رفتاری کے ساتھ سنگاپور، فلپائن اور جاوا سائرا کو روندتے ہوئے برما کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے کہ انگریزوں نے برما سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ اس کا ثبوت دو دن کے بعد ہی مل گیا۔ دوسرے روز جاپانی طیاروں نے رنگوں کی بندرگاہ اور رنگوں کے ایک کالج پر زبردست بمباری کی۔ اس کالج میں انگریزی فوج کا بہت بڑا اسلحہ کا ڈپو تھا۔ اس کی اطلاع جاپانیوں کو

میں کئی عمارتوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سڑک کے عین درمیان میں ایک بم پھٹا تھا جہاں گڑھا پڑ گیا تھا اور اندر سے پانی نکل آیا تھا۔ ایک ٹرام کار الٹی پڑی تھی۔ ٹرام کے نیچے مجھے کچھ لوگوں کی دبی ہوئی لاشیں دکھائی دیں۔ میں نے پہلی بار ہوائی جہازوں کی بم باری دیکھی تھی۔ کئی لوگ فٹ پاتھ پر مرے پڑے تھے۔ یہ جاپانی طیاروں کی مشین گن فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

میں سولی پیگڈوا کے چوک میں آیا تو دیکھا کہ پیگڈوا اسی طرح تھا۔ اس پر کوئی بم نہیں گرا تھا۔ پیگڈوا کی میڑھیاں خالی پڑی تھیں۔ وہاں نہ پھول تھے نہ پھول بیجے والیاں تھیں۔ میں پیگڈوا کے اوپر والے صحن میں گیا۔ وہاں بری بودھی برآمدے اور اندر کے بڑے ہال کمرے میں بدھ کے مجسموں کے آگے ہاتھ باندھے سر جھکائے بیٹھے مناجات پڑھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں مگر مجھے سائیں کہیں نظر نہ آئی۔ پیگڈوا کی میڑھیاں اترتے ہوئے میں اس جگہ تھوڑی دیر کے لئے رک گیا جہاں بائیں دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی پھول بیچا کرتی تھی۔

خدا جانے وہ بمباری کے وقت کہاں تھی۔ ہوائی حملے کے سائرن کی آواز پر وہ ضرور دوسری عورتوں کے ساتھ پھولوں کی بالٹیاں اٹھا کر وہاں سے بھاگ گئی ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ وہاں قریب ہی کسی جگہ وہ اپنا سامان رکھا کرتی ہے۔ اب مجھے اپنے فلیٹ والی سٹریٹ کا خیال آیا جاپانیوں نے شہر پر بھی بم گزائے تھے۔ کبیر میرا فلیٹ بھی ---- تباہ نہ ہو گیا ہو۔

میں واپس فریئر سٹریٹ سے ہوتا ہوا اپنی سٹریٹ میں آیا۔ یہ گلی اور اس کے فلیٹ سلامت تھے مگر لوگوں میں افزائش سی مچی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ ضروری سامان گازیوں وغیرہ میں لا کر وہاں سے نکل رہے تھے۔ میرا فلیٹ بالکل ٹھیک حالت میں تھا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر پانی پیا اور صوفے پر آکر بیٹھ گیا لیکن دل کو چیر نہیں تھا۔ کبھی ملک صاحب کا خیال آتا، کبھی اخبار کے عملے اور شاہ جی کا خیال آتا میں نے فلیٹ کو تالا لگایا اور دوبارہ اخبار کے دفتر میں آگیا۔ وہاں شاہ جی دفتر کے ع کے درمیان بیٹھے کوئی ضروری میننگ کر رہے تھے ---- ملک صاحب وہاں موجود تھے۔ میں بھی ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ شاہ جی کہہ رہے تھے۔

”برٹش آرمی کا دیوالہ نکل چکا ہے۔ سارے شہر میں تین انٹی ایئر کرافٹ

برمی خبروں نے دی تھی۔ بمباری سے اسلئے کا ڈپو اور رنگون کی بندرگاہ بالکل تباہ مگنی۔ وہاں جتنے جہاز کھڑے تھے سب کو آگ لگ گئی۔

تیسرے روز جاپانی طیارے سورج نکلنے ہی نمودار ہوئے اور انہوں نے بار بار پھر شہر پر اندھا دھند بم گرانے شروع کر دیئے۔ اس بمباری نے رنگون میں ہندوستانیوں کے قدم اکھاڑ دیئے۔ لوگوں نے اپنے بال بچوں کو اور تھوڑا بہت سامان ہاتھ لگا، ساتھ لیا اور رنگون شہر سے نکل کر پودم کی طرف سفر شروع کر دیا۔ یہ کوئی معمولی سفر نہیں تھا۔ آگے چل کر میں آپ کو اس سفر کی صعوبتوں اور ناہ تصور اذیتوں کی تفصیلات بتاؤں گا۔ کیونکہ میں بھی ایک قافلے کے ساتھ براہ خوفناک اور انتہائی دشوار گزار جنگلوں میں چالیس دن تک پیدل سفر کر کے بڑے کا کس بازار پہنچا تھا۔

رنگون میں میرا صرف ایک ہی دوست کریم الدین تھا۔ میں ان کی دکان پر گیا تو دیکھا دکان جل چکی تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ شہر میں ایسی بھگدڑ مچی ہوئی تھی کہ کریم الدین کا پتہ کرنے میں ان کی کوٹھی پر نہیں جاسکتا تھا۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر تھی۔ میں اخبار کے دفتر کی طرف دوڑا کہ وہاں جا کر معلوم کرتا ہوں کہ شاہ جی اور ملک صاحب اور اخبار کا ہندوستانی عملہ وہاں موجود ہے یا نہیں۔ وہاں آیا تو دیکھا کہ برمی لوگ اخبار کے دفتر میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ پیچھے جو پریس لگا تھا اس کو توڑ رہے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جاپانیوں کی یلغار کے بعد معلوم ہوا کہ برمی لوگ ہندوستانیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہندوستانیوں نے انڈیا سے آکر براہ میں ان کے کاروبار پر قبضہ کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ براہ کے لوگ ست اور کاہل تھے اور محنت مشقت سے گریز کرتے تھے۔ جبکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں، خاص طور پر پنجاب اور صوبہ سرحد سے آئے ہوئے لوگ جفاکش اور محنتی تھے اور انہوں نے برس ہا برس کی محنت اور لگن سے رنگون میں کاروبار کو عروج پر پہنچایا تھا۔

بمباری کے بعد برمیوں نے ہندوستانیوں کی دکانوں اور مکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے جاپانیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ کئی برمیوں نے اپنی دکانوں اور مکانوں پر جاپانی جھنڈے بھی لہرا دیئے تھے۔ ان حالات میں ہندوستانیوں کے پاس سوائے وہاں سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانیں بچا کر نکل جانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ شاہ جی اور ملک صاحب بھی وہاں نہیں ہیں اور کریم کا بھی کچھ پتہ نہیں کہ زندہ بھی ہے یا نہیں تو میں نے بھی رنگون سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اپنے فلیٹ پر آیا۔ میرے پاس چند کپڑوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ کپڑے میں ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ کچھ انگریزی کرنسی جو انڈیا میں بھی چلتی تھی میں نے بچا کر رکھی ہوئی تھی۔ سو سو سو روپے تھے۔ دس دس روپے کے

مردی کر چکا ہوں۔ اب برما کے جنگلوں کی بھی سیر ہو جائے گی۔ قافلے کے ساتھ ہوں۔ جہاں یہ کھائیں، پیئیں گے میں بھی کھا پی لیا کروں گا۔ ایک نہ ایک دن تو برما سے نکل کر بنگال پہنچ ہی جاؤں گا۔ مجھے تو آگے چل کر معلوم ہوا کہ میں موت کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اور مجھے جن جنگلوں میں سے پیدل گزرنا پڑے گا وہاں ہر قدم پر موت میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن ابھی مجھ پر ایک اور قیامت ٹوٹنے والی تھی۔ یہ قیامت جاپانی فوجیوں کی شکل میں مجھ پر نازل ہونے والی تھی۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں جاپانی ایک طوفان کی طرح برما کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جس وقت انہوں نے تیسرے دن رنگون پر بمباری کی تو ان کی ایک انفنٹری ڈویژن اپنے توپ خانے کی مدد سے برما کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ رنگون کے ہندوستانی مہاجرین کو اس کی بالکل خبر نہیں تھی۔

ہم لوگ رنگون سے نکل آئے تھے۔ ہمارا قافلہ کوئی چھوٹا سا سو آدمیوں کا ہو گا جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ اتنا ضرور پتہ چل گیا تھا کہ ایک آدمی قافلے کی راہ نمائی کر رہا ہے اور رنگون سے پر دم تک کے جنگلاتی راستے کو اچھی طرح سے جانتا ہے۔ اور ہم لوگ اگر اسی طرح چلتے رہے تو چھ سات دنوں میں پر دم پہنچ جائیں گے۔ ہم رنگون سے پر دم جانے والی شاہراہ سے کافی ہٹ کر کھیتوں، میدانوں اور ندی نالوں پر سے ہوتے ہوئے سفر طے کر رہے تھے۔ کیونکہ شاہراہ پر خطرہ تھا کہ جاپانی طیارے قافلے کو دیکھ کر بمباری نہ کرنی شروع کر دیں۔

وہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ اتنے مہاجرین کے چلنے سے راستہ بننا ضرور جا رہا تھا اور ہمارے پیچھے آنے والے رنگون کے مہاجرین کے لئے آسانی پیدا ہو رہی تھی۔ سفر بڑی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے طے ہو رہا تھا۔ ابھی تک ہمارے اوپر آسمان پر کوئی جاپانی بمبار طیارہ رنگون کی طرف جاتا نظر نہیں آیا تھا۔ ہم ابھی جنگل میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ درختوں کے جھنڈ ضرور نظر آتے تھے۔ کوئی ندی آتی تو وہاں بری مارچ چھوٹی چھوٹی کشتیاں لئے کھڑے ہوتے۔ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ رنگون سے ہندوستانی لوگ انڈیا کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ یہ ملاح کاروبار کرنے والے آئے تھے۔ ایک ایک سواری کا پانچ پانچ روپیہ وصول کرتے اور ندی نالہ پار کرا دیتے۔ ایک بڑی ندی آگئی تو برما ملاحوں نے ایک ایک آدمی اور بچے کا ٹیس ٹیس روپیہ لرایہ وصول کیا۔ قافلے میں شامل بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ ان

کچھ نوٹ تھے۔ باقی چاندی کے گول روپے تھے۔ انہیں ایک زوال میں لپیٹ کر اپنی کمر کے گرد باندھا۔ دس بارہ روپے جیب میں رکھ لئے تھے کہ راستے میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے میری بٹ شرٹ کی جیب میں وائٹ ہارس سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس تھی۔ دو سگریٹ میں بنے پی لئے ہوئے تھے۔ رنگون میں وائٹ ہارس سگریٹ بڑا مشہور تھا اور اس کا شمار اچھے سگریٹوں میں ہوتا تھا۔ میرے پاس ایک درمیانے سائز کا چاقو بھی تھا جسے میں نے کچن میں رکھا ہوا تھا۔ وہ چاقو بھی بند کر کے میں نے پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ ناشتہ میں نے اپنی عادت کے مطابق صبح صبح ہی کر لیا تھا۔

اللہ کا نام لیا اور فلیٹ سے نکل کر سڑک پر آگیا۔

سڑک پر سوائے بری لوگوں کے ہر کوئی بدحواس اور گھبرایا ہوا تھا۔ ہماری سٹریٹ کے کچھ مدراسی بنگالی اور سورتی مین لوگ بھی اپنے اپنے بال بچوں کو لئے افرا تفری کے عالم میں جس طرف دوسرے ہندوستانی جا رہے تھے اس طرف چلے جا رہے تھے۔ ابھی تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ کس طرف جا رہے ہیں اور مجھے رنگون سے نکلنے کے لئے کس طرف جانا ہے۔ جس طرف دوسرے لوگ جا رہے تھے میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔ فریئر سٹریٹ کے چوک میں آئے تو وہاں کچھ اور لوگ مل گئے جن کی عورتیں اور بچے بھی ساتھ تھے۔ مردوں نے چھوٹی چھوٹی گھڑیاں اور تھیلے وغیرہ اٹھا رکھے تھے۔ بچے رو رہے تھے۔ عورتیں پریشان تھیں۔ بری لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا قافلہ بن گیا تھا جو سڑک کے کنارے کنارے فٹ پاتھ کے ساتھ جا رہا تھا۔ سڑک پر گاڑیاں اور وکٹوریہ آ جا رہی تھیں مگر ان میں زیادہ تر بری لوگ سوار تھے اور لوٹا ہوا سامان لئے جا رہے تھے۔ رنگون میں کپڑے اور اجناس کی بڑی بڑی مارکیٹیں تھیں جو زیادہ تر سورتی مین اور مدراس کے مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ کہتے ہیں کہ ان پر جب برمیوں نے حملہ کیا تو وہ تین کپڑوں میں اپنے کنبے کو لے کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ میں نے رنگون کے اس زمانے کے ایک کروڑ پتی سورتی مسلمان تاجر کو کس حالت میں جنگل میں بھوکا پیاسا پڑے دیکھا۔

ابھی تک میں اسے ایک ایڈونچر ہی سمجھ رہا تھا کہ چلو میرا کیا ہے۔ اکیلا مرا ہوں۔ نوجوان ہوں۔ ایڈونچرس آدمی ہوں۔ ہندوستان کے جنگلوں کی بھی آوارا

تھی۔ غلام احمد کے پاس بھی کچھ پیسے تھے۔ ہم نے ایک بری نے بھنے ہوئے چاول خرید کر کھائے اور پانی پی کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ غلام احمد کو رنگون میں رہتے تین چار سال ہو گئے تھے۔ کہنے لگا۔

”خدا کا شکر ہے کہ یہ برما میں مون مون سون کا موسم نہیں ہے۔ اگر مون سون کا موسم ہوتا تو ہمارے لئے پیدل چلنا ناممکن تھا۔ اب تو امید ہے کہ گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح بنگال پہنچ جائیں گے۔“

جیسے جیسے شام کا اندھیرا چھا رہا تھا پھروں کے جھوم حملہ آور ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کا علاج یہ کیا گیا کہ جگہ جگہ آگ کے الاؤ روشن کر دیئے گئے۔ ان کے دھوئیں سے مجھ کو کافی بھاگ گئے۔ غلام احمد اپنی کمائی سنانے لگا کہ وہ کیسے سوتیلی ماں کے مارنے پینے سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ کر نکلتے چلا آیا۔ پھر وہاں گھروں اور ہوٹلوں میں نوکریاں کرتا رہا۔ کسی نے کہا رنگون چلے جاؤ وہاں اچھی نوکری مل جائے گی اور وہ رنگون آ کر ایک ہوٹل میں ملازم ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا اب تم واپس اپنی سوتیلی ماں کے پاس جاؤ گے؟“

وہ بولا۔

”بالکل نہیں۔ میں نکلتے میں ہی کوئی کام تلاش کر لوں گا۔“

میں نے بھی اسے اپنی فرضی کمائی تھوڑا نمک مرچ لگا کر سنا دی کہ میں بھی سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آ کر گھر سے بھاگا ہوں۔ غلام احمد خوش ہو کر بولا۔

”پھر تو ہم دونوں بھائی بھائی ہوئے۔“

رات گزر گئی۔ دوسری دن بیل گاڑیاں پھر چل پڑیں۔ پیدل چلنے والے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مگر اب ان میں وہ بات نہیں رہی تھی۔ سبھی تھک چکے تھے۔ گھربار، زمین جائیداد، مکان و کانیں اور کاروبار چھوڑ کر بھاگے ہوئے بلکہ رنگون سے زبردستی نکالے ہوئے لوگ تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جن کے عزیز بمباری میں ہلاک ہو گئے تھے۔ چروں پر شدید بے بسی اور محرومی اور تھکن کے اثرات تھے۔ انہوں نے آپس میں بات بات پر لڑنا جھگڑنا بھی شروع کر دیا تھا۔

دوسرے دن تیسرے پیر کے وقت قافلے نے ایک بڑے قصبے کے قریب ایک جمیل کے کنارے پڑاؤ ڈال لیا۔ معلوم ہوا کہ ہم نے ابھی تک رنگون سے آگے صرف تیس تیس میل کا فاصلہ ہی طے کیا ہے۔ میں نے غلام احمد سے کہا۔

بری دیہاتوں سے ہرگز تکرار نہ کرنا۔ یہ ہندوستانیوں کے دشمن ہیں۔ میرا ساتھ لدھیانے کے ایک لڑکے کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس برس کی ہوگی۔ وہ رنگون کے کسی ہوٹل میں ملازم تھا۔ ہم دونوں آپس میں پنجابی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

ایسا معاملہ نہیں تھا کہ سارے لوگ ایک رجسٹ کی شکل میں مارچ کرتے چلے جا رہے ہوں۔ مختلف کنہوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بن گئی تھیں۔ جن کے پاس کافی روپے تھے انہوں نے راستے میں بانس کی تیل گاڑیاں خرید لی تھیں جن کے آگے بھینس یا بیل جتا ہوا تھا۔ گاڑی پر انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بٹھا دیا تھا اور خود بیل گاڑی کی گاہدی پر بیٹھ کر بیلوں کو چلا رہے تھے یا باگ ہاتھ میں تھامے بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس طرح ہمارے قافلے میں دس بارہ بیل گاڑیاں ہو گئی تھیں۔ ہر بیل گاڑی کے درمیان فاصلہ تھا جو چلتے ہوئے گھٹنا بڑھتا رہتا تھا۔ ہمارے آگے آگے نکلتے کی ایک بنگالی ٹیلی کی بیل گاڑی جا رہی تھی۔ ہم کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے بیل گاڑی کے پیچھے تھوڑی سی جگہ دیکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ میرے لدھیانے والے ساتھی کا نام غلام احمد تھا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ چلتے رہنے سے ہم پسینے میں نہا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے کسی جگہ رک جاتے۔ قافلہ چلتا رہتا۔ ہم اس کے بعد پھر قافلے میں شامل ہو جاتے۔ دوپہر کے بعد قافلہ ایک جگہ رک گیا۔

آگے سے بیل گاڑیاں رکیں تو پیچھے والوں نے بھی بیل گاڑیاں روک دیں۔ وہیں درختوں کے نیچے روٹیاں وغیرہ پکنے لگیں۔ جو لوگ بچوں کے ساتھ گھروں سے بھاگے تھے وہ جتنا اٹھا سکتے تھے اتنا آنا چاول دال چینی اور نمک وغیرہ ساتھ لیتے آئے تھے۔ قافلہ ایک ایسی جگہ رکا تھا جہاں قریب ہی چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ یہاں لوگوں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام کیا اور دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ دن ڈھلنے لگا۔ شام کے سائے اترنا شروع ہو گئے تو قافلے نے ایک جگہ پڑاؤ ڈال لیا۔ یہاں ارد گرد کے دیہات کے بری لوگ قافلے والوں کے لئے پینے کا پانی اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں نوکریوں اور تھیلوں میں لے کر آ گئے۔ پانی وہ مفت پلاتے مگر دوسری چیزوں کے پیسے وصول کرتے۔ میں اور غلام احمد بھی پیدل چلتے چلتے تھک گئے تھے۔ میرے ایک پاؤں کے جوتے کا ٹکوا ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس پر رسی باندھ لی

”اس طرح تو خدا جانے ہم کب ایذا پہنچیں گے۔“

وہ بولا۔

”کچھ پتہ نہیں یار۔“

اب غلام احمد بھی مایوس مایوس اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں بھی یہ سوچ کر کسی وقت پریشان ہو جاتا کہ ہمارے پاس تو کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ دوسرے قافلے والے تو ہمیں پیسے لے کر بھی کچھ نہیں دیں گے اور ان کے پاس بھی جب آنا وال ختم ہو گئے اور راستے میں کوئی گاؤں قصبہ بھی نہ آیا تو پھر کیا ہوگا؟ ایک آدمی جو قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا اس کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ آگے ایسا ایسا جنگل آرہا ہے کہ جہاں پینے کو نہ پانی ملے گا نہ کھانے کو کوئی جنگلی پھل ہی ملے گا۔ پھر خیال آتا کہ اللہ مالک ہے۔ جہاں یہ سارے لوگ ہیں وہیں ہم بھی ہیں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں نے قافلے میں شریک ایک عمر رسیدہ آدمی سے پوچھا کہ کیا برما کے جنگل شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ابھی ہم رنگون سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ برما کے جنگل دو تین دن کے بعد شروع ہوں گے۔ راستے میں ہمیں کئی ہاتھی ملے جنہیں بری لوگ قطار میں لے جا رہے تھے۔ میں صحت مند نوجوان تھا پھر بھی دو ڈھائی دن سے پیدل چل چل کر تھک گیا تھا۔ اگرچہ میں اور غلام احمد کبھی بیل گاڑی پر بھی بیٹھ جاتے تھے۔ اس کے باوجود طبیعت اس آفت ناگمانی کی طرح نازل ہونے والے سفر سے اکتا گئی تھی۔ چونکہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا اس لئے مجبوری تھی اور چلے جا رہے تھے۔ رنگون سے کا کس بازار تک کی اس تاریخی ہجرت کے گواہ آج بھی پاکستان میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوں گے۔

ہو سکتا ہے انہیں مجھ سے شکایت بھی پیدا ہو کہ انہوں نے اس قیامت کے سفر میں جو مصیبتیں جھیلیں تھیں جو اذیتیں برداشت کی تھیں اور زندگی کے جس انتہائی دردناک دور میں سے انہیں گزرنا پڑا تھا اسے پوری طرح بیان نہیں کر سکا۔ اس تاریخی انخلا میں مشہور صحافی باری علیگ اور ان کی بیگم صاحبہ کے علاوہ باری صاحب کی چھوٹی بچی بھی شامل تھی جن کا حال ہی میں لاہور میں انتقال ہوا ہے۔ باری صاحب رنگون کے اردو روزناموں کے ایڈیٹر ہو کر ابھی رنگون پہنچے ہی تھے کہ رنگون پر یہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ کسی دوسرے قافلے میں شامل ہو کر رنگون سے بنگال پیدل

پہنچے تھے۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ رنگون سے بنگال کی طرف پیدل روانہ ہونے کے تین دن بعد ہی مجھ پر مایوسی اور بد دلی کی کیفیت طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کبھی لگتا کہ ہم کسی نہ کسی طرح بنگال پہنچ جائیں گے اور کبھی محسوس ہوتا کہ یہ قیامت کا سفر ہمیں برما کے جنگلوں ہی میں موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ کسی وقت جاپانیوں کا کوئی فوجی طیارہ آسمان پر سے گزرتا تو میں سوچتا کہ یہ ہم سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ اس میں سوار فوجیوں کو ان دشوار گزار بھیاں جنگلوں میں پیدل نہیں چنا پڑ رہا۔ ہم چڑچڑے ہو گئے تھے۔ بات بات پر میں اور غلام احمد ایک دوسری سے الجھ پڑتے تھے۔ ایک روز میری اس کی لڑائی ہو گئی۔ میں نے اسے زور سے ٹکر ماری۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ قافلے میں شامل دوسرے لوگوں نے ہمیں چھڑوا دیا لیکن ہماری بول چال بند ہو گئی۔ میں نے غلام احمد کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قافلہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ جب قافلے کی آخری ٹولی گزر رہی تھی تو میں اس میں شامل ہو گیا۔ یوں میں قافلے میں سب سے پیچھے اور غلام احمد سے دور ہو کر سفر کرنے لگا۔

بظاہر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ قافلے میں آگے چلنے والوں کی حالت بھی ویسی ہی اترا اور خستہ تھی جیسی پیچھے آنے والوں کی تھی۔ ہمارے پیچھے دوسرے قافلے بھی رنگون سے نکل کر پیدل مارچ کرتے چلے آ رہے تھے مگر ہمارے اور ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ہمارے آگے بھی کچھ قافلے نکل چکے تھے جن کے چھوڑے ہوئے نشان گرے پڑے جیتھڑوں، ٹوٹے ہوئے برتنوں اور بہت آگے جانے کے بعد انسانی لاشوں کی شکل میں ہمیں ملے تھے۔

چوتھے روز ہمارا قافلہ ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے رک گیا۔ قافلے میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں تھی جو مدتوں سے برما میں آباد تھے اور بری زبان روانی سے بولتے اور سمجھتے تھے۔ وہ راستے میں بری دیہاتیوں سے بات چیت کر کے راستے کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے تھے۔ ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ آگے برما کے دشوار گزار جنگلات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور وہاں ہمیں کھانے پینے کو شاید ہی کچھ ملے۔ اس لئے ہمیں پانی کے کنسر اور ٹکے بھر کر بیل گاڑیوں میں رکھ لینے چاہئیں۔ لوگوں نے قریبی دیہات میں جا کر مٹی کے ٹکے خریدے اور انہیں جھیل کے

راجے پر قافلے چلے آ رہے تھے۔ کسی دوسرے قافلے میں شامل ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ کر میں ایک خالی جھونپڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ یہاں چھروں نے حملہ کر دیا۔ ان سے بچنے کے لئے باہر نکل آیا۔ باہر بھی چھروں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جہاں عورتوں نے پتھر جوڑ کر آگ جلائی تھی۔ وہاں آگ بجھ چکی تھی۔ میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر سے درختوں کی ٹہنیاں اور پتے اکٹھے کئے۔ ماچس میرے پاس تھی۔ میں نے آگ روشن کر دی اور اور ذرا پرے ہو کر بیٹھ گیا۔ دھوئیں کی وجہ سے چھروں سے کافی حد تک نجات مل گئی۔ تین چار گھنٹے سوچا تھا۔ نیند بالکل نہیں تھی۔ ارد گرد خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جھیل کے کنارے اونچے اونچے درخت اندھیری رات میں جن بوٹوں کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ جس طرف دن کے وقت دور گاؤں کے جھونپڑے نظر آتے تھے اس طرف کہیں کوئی روشنی جھللائی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس خیال سے دل کو تھوڑا اطمینان تھا کہ ابھی برما کے اصلی جنگل شروع نہیں ہوئے اس لئے جنگلی درندوں سے یہ علاقہ محفوظ ہے۔

اس کے باوجود تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا کہ کہیں کوئی رچھ یا جنگلی درندہ میری طرف تو نہیں بڑھ رہا۔ آگ کا الاؤ آہستہ آہستہ بجھنے لگتا تو میں ادھر ادھر سے سوکھی ٹہنیاں اور پتے لا کر ڈال دیتا مگر میں ساری رات یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بار الاؤ کے شعلے بجھے تو میں وہیں بیٹھا رہا۔ الاؤ کی آگ اور دھوئیں کی وجہ سے چھروں سے ضرور نجات مل گئی تھی۔ الاؤ میں آگ ابھی نہیں بجھی تھی۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے کچھ سوکھے پتے اکٹھے کر کے الاؤ میں ڈالے اور وہیں زمین پر لیٹ گیا کہ اگر نیند آ جائے تو باقی رات کٹ جائے گی۔ بہت دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ چونکہ چھروں نے نہیں تھے اس لئے کچھ وقت کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ پیچھے سے جو قافلہ آ رہا ہے اس نے بھی رات کے وقت کہیں پڑاؤ ڈالا ہو گا اور وہ یہاں دن کے وقت ہی پہنچے گا۔ مجھے ایک بار بھر نیند آ گئی۔

اب دوبارہ آنکھ کھلی تو دھوپ درختوں کی شاخوں میں سے چھن کر میرے اوپر آ رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ آس پاس کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جھیل پر جا کر منہ ہاتھ دھویا پاؤں دھوئے۔ خوتا جو پھٹ گیا اس کی سی کھول کر کپڑے کو دوبارہ اچھی طرح سے لپیٹا۔ سی

پانی سے بھر کر تیل گاڑیوں پر رکھ لیا۔ وہاں سے سوکھے چاول اور پنے وغیرہ جو ہر بھی ملا وہ بھی ساتھ رکھ لیا۔ راستے میں جنگلی کیلے بھی توڑ کر سنبھال کر رکھ لئے۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ تمام چیزیں بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔ اگر ختم نہیں ہوں گی تو قافلے میں شریک جن لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں بچے گا وہ ساری چیزیں لوٹ لیں گے اور لوگ جنگلوں میں بھوک اور پیاس سے ہلک ہلک کر دم توڑنے لگیں گے۔ اور جو پیچھے رہ جائے گا اسے جنگلی درندے ہڑپ کر جائیں گے۔ آگے جا کر بری ڈاکوؤں کی مصیبت بھی نازل ہونے والی تھی جو قافلے پر حملہ کرتے، لوگ جو جمع پونجی چھپا کر ساتھ لے جا رہے تھے انہیں لوٹ سکتے اور کئی مقامات پر تو وہ لوگوں کی عورتیں بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

اس چھوٹی سی جھیل کے کنارے قافلے کے پڑاؤ ڈالنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہاں پینے اور نہانے دھونے کے لئے پانی وافر مقدار میں تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہاں نہ صرف ایک گاؤں قریب ہی تھا بلکہ جھیل کے پاس دو چار جھونپڑے بھی تھے جو خالی پڑے تھے۔ ان جھونپڑوں میں خواتین آرام کرنے کے لئے چلی گئیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ہماری ٹولی میں چالیس کے قریب لوگ تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ عورتوں نے چاول وغیرہ اہال لئے۔ مجھے بھی ایک مسلمان مین فیل نے کھانے میں اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ایک طرف ہو کر دیودار کے درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ مجھے نیند آنے لگی۔ سوچا جب تک لوگ کھانے پینے میں اور عورتیں کپڑے وغیرہ دھونے میں مصروف ہیں میں تھوڑی دیر آرام کر لیتا ہوں۔ چنانچہ میں وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔ لیٹنے ہی مجھے نیند آ گئی۔

جس وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ واقعی رات ہو گئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درخت کے نیچے سے اٹھ کر جھیل کی طرف گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ قافلے والے آگے نکل گئے تھے۔ میں درخت کی اوٹ میں سویا ہوا تھا کسی کی مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ ورنہ شاید مجھے کوئی نہ کوئی ضرور جگا دیتا۔ سوچا دوڑ کر قافلے تک پہنچنے کی کوشش کر لی جائے۔ لیکن وہاں اندھیرا اسقدر گہرا اور خوفناک تھا کہ میری ہمت نہ پڑی۔ آخر کیا فیصلہ کیا کہ اسی جگہ بیٹھ کر پیچھے سے آنے والے قافلے کا انتظار کرتا ہوں۔ اس

مگر اس وقت درختوں کی طرف دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اپنا سر ماں باپ اور بہن مائی یاد آرہے تھے۔ سوچتا کہ کیا میں زندہ سلامت ان لوگوں کے پاس پہنچ سکوں گا؟ رات نہ جانے کتنی گزر چکی تھی کہ ہوائی جہازوں کی گونج سنائی دی۔ میں نے اوپر درختوں کی طرف دیکھا اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ جہاز اوپر سے گزر گئے۔ یہ رنگوں کی طرف جارہے تھے۔ یہ جاپانی جہاز ہی ہو سکتے تھے جو رنگوں پر بمباری کرنے جارہے تھے۔ جہاز گزر گئے تو ایک بار پھر گری خاموشی چھا گئی۔ الاؤ کی آگ بجھنے لگی تھی۔ میں نے جہازوں کی کچھ شاخیں توڑ کر الاؤ میں ڈال دیں، اس سے دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھواں کی وجہ سے پھمڑوں سے نجات مل جاتی تھی۔ میں وہیں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا کسی وقت درختوں طرف سے ایسی آہٹ سی محسوس ہوتی جیسے کوئی میری طرف دبے پاؤں چلا آ رہا ہو۔ اٹھ کر دیکھتا تو کوئی بھی نہ ہوتا پھر لیٹ جاتا۔ پھر کسی وقت مجھے نیند آ گئی۔ ایسی نیند آئی کہ سورج نکل آیا تھا جب آنکھ کھلی۔ یہ دیکھ کر میری پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا کہ رنگوں سے آنے والے کسی قافلے کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے جو چاول کیلے کے پتے میں لپیٹ کر الاؤ کے پاس ہی پتھروں میں چھپا کر رکھے تھے رات کو کسی جانور نے نکال کر کھائے تھے۔ کیلے کے پتے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے جمیل پر جا کر پانی پیا منہ ہاتھ دھویا اور یہ سوچ کر ایک بار پھر قریبی گاؤں کی طرف چل پڑا کہ تھوڑا بہت کھا کر بھوک مٹاؤں۔ پھر سوچوں گا کہ مجھے قافلے کا انتظار کرنا چاہئے یا اکیلے ہی چل پڑنا چاہئے

جب میں گاؤں کے قریب پہنچا تو مجھے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ آواز دور سے آرہی تھی میں سمجھا کہ جاپانی جہاز رنگوں پر بمباری کرنے آرہے ہیں۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز بھی رک گئی تھی۔ گاؤں کی مختصر سی جھونپڑیاں کھلی جگہ پر صاف نظر آرہیں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے بری مرد اور عورتیں جھونپڑیوں سے نکل نکل کر ایک طرف دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں چلتے چلتے ان کے پاس آ گیا جیسے ہی میں ان کے پاس آیا سامنے والے اور دونوں پہلوؤں کے درختوں میں سے فوجی دردیوں والے چھوٹے قد کے آدمی عجیب آوازیں نکالتے دوڑتے ہوئے نکلے اور انہوں نے ایک دو سینکڑے کے اندر ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ یہ جاپانی فوجی تھے۔

باندھی اور ایک جھونپڑے کے باہر بیٹھ کر پیچھے رنگوں کی طرف سے آنے والے کسی قافلے کا انتظار کرنے لگا۔

میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ خیال آیا کہ دیہات قریب ہی ہے۔ کیوں نہ وہاں سے کچھ کھا پی لوں۔ پھر پتہ نہیں قافلے کے ساتھ آگے جا کر کچھ کھانے کو ملے یا نہ ملے۔ پیسے میری جیب میں تھے۔ مجھے اس بات کی بھی تسلی تھی کہ پیچھے سے رنگوں کے ماجرین کا جو قافلہ بھی آیا وہ جھیل کے پاس تھوڑی دیر قیام ضرور کرے گا۔ اتنی دیر میں میں واپس آ کر قافلے میں شامل ہو جاؤں گا۔

یہ سوچ کر میں گاؤں کی طرف چل پڑا۔

گاؤں زیادہ دور نہیں تھا۔ دس بارہ جھونپڑیاں تھیں۔ ایک جگہ جھیل سے پکڑی ہوئی مچھلیاں کھانے کو ڈالی ہوئی تھیں۔ کچھ آدمیوں نے میری طرف دیکھا تو میں ان کے پاس چلا گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں سے ماجرین کے قافلے گزرتے ہیں۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں انہیں بتایا کہ میں قافلے سے پھڑ گیا ہوں اور اگر کچھ کھانے کو مل جائے تو میں اس کے پیسے ادا کر دوں گا۔ ان لوگوں نے مجھے مچھلی اور چاول کھانے کو دیئے ہیں۔ میں نے انہیں پیسے دینے چاہے تو انہوں نے نہ لئے اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ میں واپس جھیل کے پاس آ کر قافلے کا انتظار کرنے لگا۔ میں کافی دیر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر شلنے لگا۔ کوئی قافلہ نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس روٹ پر پیچھے سے کوئی قافلہ نہ آیا ہو۔ مگر میں اکیلا آگے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ آگے جانے والے لوگوں نے جنگل میں ایک راستہ ضرور بنا لیا تھا مگر اسی پر اکیلے سفر کرنے میں مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اسی سوچ بچار میں سورج مغرب کی طرف ٹیلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ شام کا وقت ہو رہا تھا۔ اب تو میں بالکل ہی آگے نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے اسی جھونپڑے میں رات بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گاؤں میں جا کر تھوڑے بہت ابلے ہوئے چاول وغیرہ کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر لے آیا۔ رات کا اندھیرا چھانے لگا تو میں نے پھمڑوں اور جنگل جانوروں سے بچنے کے لئے آگ روشن کر دی۔ الاؤ سے کچھ دور بیٹھ کر تھوڑے سے چاول کھائے اور باقی کیلے کے پتے میں لپیٹ کر رکھ لئے کہ صبح کو کام آئیں گے۔ ایک بار پھر پہاڑ ایسی رات سامنے تھی۔ میں متاثر قدرت سے محبت کرنا

ہوئے ہیں۔ انگریزوں کا ایک فوجی گیریزن میں نے دیکھا ہوا تھا یہ رنگون سے کوئی دو ایک میل دور میکائے میں تھا۔ میں انہیں فوراً اس کے بارے میں بتا دوں گا کہ وہ کس جگہ پر ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ میں صرف اسی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا کہ رنگون سے مجھے دوبارہ پیدل چل کر اس مقام تک آنا پڑے گا۔ گاڑی میں سے مجھے گاؤں کے جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے۔ جاپانی فوجیوں نے ان جھونپڑوں کی تلاشی لی مگر سوائے گاؤں والوں کو دھکے دینے کے انہیں کچھ نہ کہا اور واپس آکر فوجی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ مختصر سا فوجی قافلہ آگے کی طرف چل پڑا۔ میری گاڑی میں بھی چھ سات جاپانی آکر بیٹھ گئے تھے اور میری طرف دیکھ کر آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ان کا جاپانی افسر کسی دوسری گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ جاپانی افسر اردو تھوڑی تھوڑی بول لیتا تھا مگر یہ جاپانی فوجی صرف جاپانی میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک جاپانی نے میری جیبوں کی تلاشی لی۔ میں نے کرنسی نوٹ اپنی کمر سے کھول کر پتلون کی جیب میں رکھ لئے ہوئے تھے اور چاقو بھی جیب میں ہی تھا۔ اس نے میرے نوٹ اور چاقو نکال لئے۔ چاقو کھول کر اس نے ہوا میں لہرایا اور پھر اسکی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ سب جاپانی قہقہے لگانے لگے اس نے چاقو بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور کرنسی نوٹ آپس میں وہیں بانٹ لئے۔ اب میرے پاس سوائے تین کپڑوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ابھی برما کے گنجان جنگل شروع نہیں ہوئے تھے اور یہ رنگون سے شمال کی طرف کوئی چالیس پچاس میل کا علاقہ تھا جہاں درخت، جنگلی جھاڑیاں اور تالاب جھیلیں تو ضرور تھیں مگر یہ جنگل نہیں تھا۔ ٹینک ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ گاڑیاں اس رفتار سے چل رہی تھیں کہ ٹینک پیچھے رہ جائے۔ ٹینک کے اوپر دونوں جاپانی رانٹلیں سیدھی کر کے اب لیٹے ہوئے تھے کہ جنگل سے اگر کوئی فائر آئے تو انہیں نہ لگے اور وہ جوابی فائر کر سکیں۔ گاڑیاں ایک جگہ ٹاریل کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان آئیں تو دو دیہاتی قسم کے بری ایک طرف سے نکل کر سامنے آگئے۔ وہ ہاتھوں سے کچھ اشارے کر رہے تھے۔ اگلی گاڑی میں جاپانی افسر بیٹھا تھا۔ گاڑی رک گئی۔ جاپانی افسر باہر نکل کر برمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ بری دیہاتی ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر رہے تھے۔ وہ جاپانی فوجیوں کی راہ نمائی کر رہے تھے۔ گاڑیاں وہاں سے ایک طرف ہو کر جھاڑیوں پر سے گزرتی ایک چھوٹی سی سڑک

انہوں نے آتے ہی مردوں کو دھکے دے کر گرانا شروع کر دیا۔ ایک فوجی نے میری طرف دیکھا تو میری طرف رانٹل تان کر چچ کر کچھ کہا اسکی آواز پر تین چار فوجی دوڑ کر وہاں آگئے۔ ان میں ان کا ایک فوجی افسر بھی تھا جس کے کندھے پر مختلف نشان لگے تھے

اس جاپانی افسر نے مجھے گھور کر دیکھا اور شکستہ اردو میں پوچھا۔
”تم ہندوستانی۔“

میں کیسے کہتا کہ میں ہندوستانی نہیں ہوں اور بری ہوں مجھے معلوم تھا کہ جاپانی برمیوں کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کرتے۔ شکل سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ میں بری نہیں ہوں بلکہ ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ میں ایک تو اتنے سارے جاپانی فوجیوں کو اچانک یلغار کرتے دیکھ کر حیران پریشان ہو گیا تھا۔ میں کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ جاپانی افسر نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ میں گرتے گرتے سنبھل گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب زندگی کے ایک دو لمحے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر ایک جاپانی فوجی کی طرف دھکا دے کر اپنی زبان میں اسے کچھ آرڈر کیا۔ جاپانی فوجی نے اسی وقت میرے ہاتھ پیچھے کر کے دہی سے باندھ دیئے اور مجھے دھکیلتا ہوا درختوں کی طرف لے گیا۔ درختوں میں آکر میں نے دیکھا کہ وہاں ایک ٹینک اور تین فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مجھے ایک گاڑی میں دھکا دے کر گاڑی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

ٹینک کے اوپر دو جاپانی فوجی رانٹلیں تانے بیٹھے تھے۔ تین چار جاپانی فوجی گاڑیوں کے آس پاس درختوں کی آڑ لے کر بیٹھے تھے۔ جس گاڑی میں مجھے بند کیا گیا تھا اس کی اگلی سیٹ پر بھی دو مسلح جاپانی بیٹھے تھے۔ میں ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں جاپانی فوج کا قیدی بن چکا تھا۔ ابھی تک میں نے جاپانی فوج کے اس ظلم اور درندگی کی کہانیاں اور واقعات اخباروں اور رسالوں میں نہیں پڑھے تھے جو وہ اپنے جنگی قیدیوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ کیونکہ ابھی ایسے روٹنے کھڑے کر دینے والے واقعات اخباروں کی زینت نہیں بنے تھے۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ان لوگوں نے اگرچہ مجھے پکڑ لیا ہے لیکن جب میں جاپانی افسر کو بتاؤں گا کہ میں کوئی فوجی نہیں ہوں بلکہ ایک بے ضرر شہری ہوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھ سے یہی پوچھیں گے کہ رنگون میں انگریزوں نے کہاں کہاں اپنے فوجی گیریزن بنائے

قیدیوں کا کیمپ بنایا ہوا تھا۔ مجھے گاڑی سے اتار کر اس کیمپ میں داخل کر دیا گیا۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ یہاں بانس کے چھ سات چھوٹے چھوٹے جھونپڑے بنے ہوئے تھے، جن کے باہر جنگی قیدی مختلف کام کر رہے تھے۔ یہ سب انڈین تھے۔ کچھ بھٹی پرانی فوجی وردیوں میں تھے اور کچھ سویلین کپڑوں میں تھے۔ مجھے ایک پھاوڑا دے دیا گیا اور میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ ایک جگہ مٹی کے ڈھیروں کو ہموار کرنے میں لگ گیا۔ ہمارے گرد جاپانی سپاہی رانٹلیں اٹھائے پہرہ دے رہے تھے۔ کیمپ کے ارد گرد بھی خاردار تار کا جھنگل لگا تھا۔

مجھ سے دس پندرہ قدموں کے فاصلے پر ایک ہندوستانی فوجی کام کر رہا تھا۔ ہم نے سرسری طور پر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کوئی بات نہ کی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہمیں ڈبل روٹی کے دو دو سوکھے ککڑے اور پتلا شوربہ دیا گیا۔ ہم وہیں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ میرے قریب جو ہندوستانی سپاہی تھا، اس کی مونچھیں تھیں۔ چرے کی ہڈیاں چوڑی تھیں۔ وہ پنجابی لگ رہا تھا۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت تھی۔ جاپانی سپاہی ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے فوجی وردی والے قیدی سے اردو میں پوچھا۔

”کیا آپ کا تعلق پنجاب کی رجسٹ سے ہے؟“

فوجی نے آہستہ سے پنجابی میں جاپانیوں کو گالی دے کر کہا۔ ”کوئی پتہ نہیں۔“

پھر اس نے بتایا کہ وہ برٹش انڈیا آری کی سپلائی کور کا حوالدار میجر ہے اور اسکا نام صوبہ خان ہے اور وہ دینہ ضلع جہلم کا رہنے والا ہے۔ میں نے بھی اسے بتایا کہ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں اور رنگون کے اخبار کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ رنگون پر بمباری کے بعد قافلے کے ساتھ جا رہا تھا کہ راستے میں جاپانیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ صوبہ خان کہنے لگا۔

”بات کرتے ہوئے زیادہ میری طرف منہ نہ کرو۔ منہ نیچا کر کے کھاتے رہو اور آہستہ آہستہ بات کرتے جاؤ۔“

جب میں نے اسے کہا کہ کیا ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے تو حوالدار نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

پر آگئیں۔ بری دیہاتی جاپانیوں کو اس سڑک کے بارے میں اطلاع دے رہے تھے۔ سڑک کچی تھی۔ تینوں فوجی گاڑیاں اور ٹینک اس سڑک پر چل پڑے۔ ان کا رخ رنگون شہر کی طرف تھا۔

دن کا وقت تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک فوجی گاڑیاں چلتی رہیں۔ ایک جگہ بہت بڑی ندی کا پل عبور کیا۔ اس کے بعد رنگون شہر کے باہر کا علاقہ شروع ہو گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ ابھی رنگون یہاں سے کافی دور تھا۔ یہاں ہمیں راستے میں کئی جاپانی فوجی ٹرک ملے۔ ان میں جاپانی فوجی کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر وہ نعرے لگاتے اور ہاتھ ہلاتے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ اس کا ثبوت رنگون شہر پہنچ کر مل گیا۔ سڑکوں پر بری جلوس نکال کر جاپانی فوجیوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ہندوستانیوں کے مکان اور دکانیں لوٹی جا رہی تھیں۔ جگہ جگہ گھروں اور دکانوں کا ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا پڑا تھا۔ سڑک میں جہاں کوئی چوک آتا وہاں دو تین جاپانی فوجی ٹرک کھڑے دکھائی دیتے۔ ایک جگہ سڑک کنارے درختوں کے نیچے میں نے دو جاپانی ٹینک بھی دیکھے۔ ٹینک ہم سے الگ ہو گیا تھا اور تینوں جاپانی گاڑیاں ایک دوسری کے پیچھے کسی فوجی کیمپ کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ یہ رنگون کا شمالی علاقہ تھا جو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

گاڑیاں ایک جگہ سے گزریں جہاں دونوں جانب درختوں میں گھری ہوئی کوٹھیاں اور جنگل تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ سارے جنگل کوٹھیاں خالی ہیں۔ یہاں کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فوجی گاڑیاں ایک چھوٹی سڑک پر آئیں تو میں نے اس سڑک کو پہچان لیا۔ اس کی پہچان اس طرح سے ہوئی کہ سڑک کی ایک جانب مہاتما بدھ کا بہت بڑا مجسمہ لیٹا ہوا تھا۔ یہ اتنا بڑا مجسمہ تھا کہ اس کے پاؤں کے ایک انگوٹھے کے نیچے کسی نے چائے کا کھوکھا بنایا ہوا تھا۔ یہ سیلز بیریکس کا علاقہ تھا۔ یہاں برٹش انڈیا آری کی سپلائی کا ڈپو ہوا کرتا تھا اور میں ریڈیو رنگون کی اردو سروس کے انچارج ملک صاحب کے ساتھ یہاں دو تین مرتبہ آچکا تھا اور جب بھی اس سڑک پر گزرتا تو مہاتما بدھ کے آرام کرتے مجسمے کو بڑی محبت سے دیکھا کرتا تھا۔ اس فوجی سپلائی ڈپو پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اوہر اوہر جاپانی فوجی ٹرک اور جیپیں کھڑی تھیں۔ جاپانی سپاہی چل پھر رہے تھے۔ ڈپو کے پیچھے جاپانیوں نے ایک مختصر سا

جنگی قیدیوں کے ساتھ مشقت پر لگا دیا گیا تھا۔

میں بچپن ہی سے سخت جانوں کا عادی تھا مگر جس قسم کی مشقت مجھے جاپانیوں کی قید میں رہ کر کرنی پڑ رہی تھی اس نے ایک ہفتے میں ہی مجھے نڈھال کر دیا اور میں وہاں سے بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ حوالدار صوبہ خان مجھ سے الگ ہو گیا تھا اور دن کے وقت سڑک پر کام کرتے ہوئے کبھی کبھار اس کی شکل دور ہی سے نظر آتی تھی۔ اب مجھے اکیلے ہی وہاں سے بھاگنا تھا۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیتا شروع کر دیا۔ سب سے بڑی مشکل کانٹے دار تار کی تھی جس کی ڈیڑھ میٹر اونچی دیوار قیدی کیمپ کے چاروں طرف کھینچی ہوئی تھی۔ اس دیوار کے اندر اور باہر دن کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی جاپانی سپاہی رانٹلیں لئے گشت لگاتے رہتے تھے۔ رات کو اونچی چٹانوں پر سرچ لائٹیں روشن دیوار کے آس پاس گردش کرتی رہتی تھیں۔ اس قسم کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں قید ہونے کا یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ خاردار تاروں کی دیوار میں سے نکلنے کی ذرا سی جگہ بھی نہیں تھی۔ قیدی کیمپ کا صرف ایک گیٹ تھا جس کی دونوں جانب مشین گن پوشیں تھیں۔ یہاں ہر وقت فوجی پہرہ لگا رہتا تھا۔ دن کے وقت جب قیدی مشقت کر رہے ہوتے تھے تو جاپانی سپاہی رانٹلیں لئے ان کے سروں پر موجود ہوتے تھے۔ وہاں سے بھاگنے کی کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ مشقت کرتے وقت ہمارے پاؤں میں لوہے کے کڑے ڈال دیئے جاتے تھے۔ اس طرح کوئی قیدی بھاگ نہیں سکتا تھا۔ رات کو کڑے اتروائے جاتے اور جاپانی سپاہی گشت لگاتے رہتے۔ بیرک کا ایک ہی دروازہ تھا جو باہر سے بند کر کے تالا لگا دیا جاتا تھا۔ بیرک کی چھت بانس کی تھی۔ دیواریں لکڑی کی تھیں۔ جن کی اونچی کھڑکیوں میں بھی سلاخیں لگی تھیں۔ رات کے وقت بیرک کے اندر بھی جاپانی سپاہی چل پھر کر پہرہ دیتے تھے۔ رات کو جیسے ہی قیدی لمبی بیرک میں داخل ہوتے بیرک کی روشنیاں گل کر دی جاتیں۔ سب کو آرڈر تھا کہ روشنی کے بجھتے ہی قیدی سو جائیں اور ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کریں۔

اس دوران ایک دردناک واقعہ ہو گیا۔ ایک سویلین قیدی نے دن کے وقت مشقت کے دوران فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے جاپانی سپاہیوں نے تھوڑے فاصلے پر ہی پکڑ لیا۔ اسے پکڑ کر جہاں سڑک بن رہی تھی وہاں ایک جگہ لا کر بٹھا دیا گیا۔ پھر سارے قیدیوں کو جمع کیا گیا۔ ایک جاپانی افسر نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ

”میں دو دن سے سوچ رہا ہوں۔ تم بھی سوچو۔ موقع ملا تو ضرور بھاگ نکلیں گے۔“

مگر دوسرے دن ہی وہاں جتنے دس بارہ جنگی قیدی تھے انہیں ایک ٹرک میں ڈال کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ میں اور حوالدار صوبہ خان بھی اس ٹرک میں تھے۔ ہم سب کے پاؤں میں لوہے کے کڑے ڈال دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رات کے وقت ہمارا ٹرک رنگون سے روانہ ہوا تھا۔ ساری رات ٹرک چلتا رہا۔ دوسرے دن جنگل میں ایک جگہ رکا۔ ہمیں نیچے اتار کر ہمیں تھوڑا بہت کھانے کو دیا گیا۔ یہاں ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

ہمارے آگے پیچھے دو فوجی ٹرک تھے جن پر مسلح جاپانی سپاہی سوار تھے۔ ان کی مشین گنوں کا رخ ہمارے ٹرک کی طرف تھا۔ دوپہر کے بعد جنگل میں ایک ایسی جگہ پہنچ کر فوجی ٹرک رک گئے جہاں درختوں کو کاٹ کر سڑک بنائی جا رہی تھی۔ یہاں پہلے ہی سے سو ڈیڑھ سو کے قریب جنگی قیدی کام کر رہے تھے۔ ہمیں بھی کام لگا دیا گیا۔ ہم سارا دن درختوں کی کٹائی کرتے۔ انہیں ایک طرف لگا کر سڑک کے لئے راستہ ہموار کرتے اور جھاڑیاں صاف کرتے۔ یہاں بانس کی چھت والی ایک لمبی بیرک بنی ہوئی تھی۔ رات کو ہمیں اس میں بھیڑ بکریوں کی طرح دھکیل دیا جاتا۔ رات نکلنے ہی جاپانی سپاہی رانٹلیں تانے اندر آکر ٹھڈے مار کر ہمیں جگاتے اور ہمارا مشقت شروع ہو جاتی۔ سورج غروب ہونے تک مشقت جاری رہتی۔ اس دوران ہمیں تھوڑا سا پانی، تھوڑا سا پتلا شوربہ اور سوکھی ڈبل روٹی کے دو تین ٹکڑے کھا۔ کو دیئے جاتے۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی کیمپ میں چگہ جگہ بڑے بڑے بلب روشن ہو جاتے اور دن کی طرح روشنی ہو جاتی۔ اس جنگی قیدی کیمپ کے گرد بھی کانٹے دار تار کی اونچی دیوار بنی ہوئی تھی جس کے اندر اور باہر کی جانب وقت جاپانی سپاہی گشت لگاتے رہتے تھے۔ جس وقت ہم مشقت کر رہے ہوتے تھے اس وقت بھی جاپانی سپاہی رانٹلیں سنبھالے بڑے چوکس ہو کر ہماری نگرانی کرتے تھے۔

اس کیمپ میں برٹش انڈیا کی فوج کے سپاہی بھی تھے جن میں سکھ بھی اور سویلین بھی تھے۔ یہ سویلین بھی میری طرح جاپانیوں کے قابو آگئے تھے اور

سے یہ سن کر کہ وہ فرار کی سکیم تیار کر سکتا ہے میرے دل میں امید کی کرن دوبارہ روشن ہو گئی تھی۔ حوالدار فوجی تھا اور فوجیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی قید سے کس طرح فرار ہوا جاتا ہے۔ کم از کم میں یہی سمجھ رہا تھا کہ حوالدار کو معلوم ہو گا۔ اس بات کو بھی کئی دن گزر گئے۔ حوالدار سے ملنے کا موقع نہ مل سکا۔ میرے دل میں قیدی کیپ سے فرار ہونے کی جو امید کی کرن روشن ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ بجھ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے قدرت کو یہی منظور ہے۔ میں نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔

دن کے وقت مجھے مشقت کے لئے سڑک کے ایک ایسے حصے پر لگا دیا گیا جہاں سڑک ایک چھوٹے سے ٹیلے کے دامن سے ہو کر مڑ جاتی تھی۔ یہاں ایک گمراہ گڑھا تھا۔ یہ جگہ ذرا نیچے تھی۔ میرا کام اوپر روڑی کے ڈھیر سے ٹوکری میں روڑی بھر کر لانا اور اس گڑھے میں ڈال کر اسے کوٹنا تھا۔ دوسرے قیدی مجھ سے ذرا فاصلے پر کام کر رہے تھے۔ ایک جاپانی سپاہی اوپر روڑی کے بہت بڑے ڈھیر کے قریب چل پھر کر میرے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ ویسے بھی میرے پاؤں میں لوہے کے کڑے پڑے تھے اس لئے جاپانیوں کو معلوم تھا کہ میں بھاگ نہیں سکتا۔ اگر بھاگا بھی تو فوراً پکڑ لیا جاؤں گا۔ میں نے بھی دل سے بھاگنے کا خیال نکال دیا تھا اور خاموشی سے اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ جہاں میں روڑی کوٹنا تھا وہاں نشیب میں ایک پہاڑی نالہ بہتا تھا۔ یہ نالہ چھوٹی سی ندی کی طرح تھا۔ پانی اوپر سے آکر ندی میں گرتا تھا۔ یہاں دن کے وقت کبھی کبھی کسی قریبی دیہات کی بوڑھی بری عورتیں آکر کپڑے وغیرہ دھویا کرتی تھیں۔ یہ عورتیں مجھے صاف نظر آتی تھیں مگر میں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ عورتیں بھی ہماری طرف کم ہی دیکھتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اوپر سڑک پر جنگی قیدی کام کر رہے ہیں۔ وہ کچھ دیر ندی کے کنارے بیٹھ کر کپڑے وغیرہ دھوتیں اور پھر چلی جاتیں۔

مجھے اس مقام پر روڑی کوٹنے دوسرا دن تھا۔ دوپہر کے بعد کا وقت تھا کہ کام کرتے کرتے میں نے ذرا دم لینے کے لئے اور منہ پر آیا ہوا پینٹ پونچھنے کے لئے کمر سیدھی کی تو میری نگاہ نیچے ندی کی طرف چلی گئی۔ وہاں میں نے ایک لڑکی کو کپڑے دھوتے دیکھا تو اس کا چہرہ اور جسم مجھے شامسا لگا۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا

اس قیدی نے کیپ سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔ میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ بد نصیب سویلین قیدی کو دوزانو بٹھا کر اس کے دونوں ہاتھ رسی سے پشت پر باندھ دیئے گئے۔ پھر ایک جاپانی سپاہی لمبی تلوار لے کر پیچھے سے بد نصیب قیدی کے پہلو کی طرف آیا۔ دونوں ہاتھوں سے تلوار کا دستہ پکڑ کر تلوار کو اوپر اٹھایا اور ایک ہی بھر پور وار سے قیدی کی گردن الگ کر ڈالی۔ کئی سویلین قیدیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ میرا تو دہشت کے مارے بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ جاپانی افسر نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں باقی قیدیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یاد رکھو۔ جو قیدی بھاگے گا۔ ہم اسے پکڑ کر اسی طرح اس کی گردن کاٹ دیں گے۔“

اس الناک واقعے کے بعد مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے وہاں سے فرار ہونے کا خیال ترک کر دیا۔ دس بارہ دن گزر گئے۔ سڑک پر اب بھری بچھائی جا رہی تھی۔ ایک روز مشقت کے دوران میں سڑک پر ایسی جگہ پر آگیا جہاں پنجاب رجمنٹ کا حوالدار صوبہ خان مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ہی کام کر رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کا حال پوچھا اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

دوپہر کو کھانا تقسیم ہونے لگا تو میں کھسکتا ہوا حوالدار کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ ہم سر جھکائے کچھ دیر خاموشی سے باسی چاول کھاتے رہے۔ جاپانی سپاہی ذرا دور بیٹھے سگریٹ وغیرہ پی رہے تھے۔ میں نے موقع دیکھ کر حوالدار صوبہ خان سے کہا۔ ”جاپانی بڑے ظالم ہیں۔ اس بے چارے کی گردن کاٹ ڈالی۔“

حوالدار نے میری طرف نظر اٹھائے بغیر آہستہ سے پنجابی میں کہا۔

”وہ سویلین تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ فرار کے لئے سکیم بنانی پڑتی ہے۔“

میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

”کیا سکیم ہو سکتی ہے؟“

حوالدار بولا۔

”پھر کسی وقت بتاؤں گا۔ ابھی خاموش رہو۔ جاپانی ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔“

اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ حوالدار صوبہ خان

تجھے کون سا غم ہے ایراوتی

اگر اس وقت ایراوتی کا کوئی ملاح یہ سوال مجھ سے کرتا تو میں اسے بتاتا کہ ایراوتی اداس کیوں ہے۔ صدیوں سے غمگین کیوں ہے۔ اسے کونسا غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ مگر میں ایراوتی کے دریا سے، ایراوتی دریا کے ملاحوں سے اور ان کے گیتوں سے بہت دور ہو چکا تھا۔ اتنی دور کہ نہ ایراوتی کے ملاحوں کے گیت مجھ تک پہنچ سکتے تھے اور نہ ایراوتی میری آواز سن سکتی تھی۔ ایک دریا تھا۔ ناقابل عبور دریا اور عبور دریائے شور کی سزا تھی۔

دوسرے روز مجھے دوبارہ اسی جگہ مشقت پر لگا دیا گیا۔ وہاں آتے ہی سب سے پہلے میری نظریں نشیب میں بہتے نالے کی طرف اٹھ گئیں۔ سائیں وہاں نہیں تھی وہاں کوئی بھی بری عورت نہیں تھی۔ میں بوجھل دل کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اوپر ابھی روڑی کے ڈھیر لگے تھے۔ گڑھا ابھی نہیں بھرا تھا۔ میں تیسری یا چوتھی بار اوپر سے روڑی کی ٹوکری بھر کر نیچے لا رہا تھا کہ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ نالے پر سائیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کا چہرہ میری طرف تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر کر کے ذرا سا ہلایا۔ میں نے گڑھے میں روڑی کی ٹوکری الٹ دی اور سب سے پہلے اوپر دیکھا کہ جاپانی سپاہی تو ہمیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ مگر حسب معمول اسکی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے سائیں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا جیسے اسے خوش آمدید کہہ رہا ہوں۔

مگر میں نے محسوس کیا کہ سائیں ہاتھ کے اشارے سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اوپر جاپانی سپاہی کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف منہ کئے کسی قیدی کو اونچی آواز میں ڈانٹ رہا تھا۔ میں نے سائیں کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے نیچے بلا رہی تھی۔ وہ ہاتھ کو اوپر سے نیچے لے جاتی اور پھر اس کے قریب ہی جو چھوٹا سا ٹیلہ تھا ہاتھ کو اس کی طرف لے جاتی۔ جیسے کہہ رہی ہو اس ٹیلے کے نیچے آ جاؤ۔ وہ جو کچھ مجھے کہہ رہی تھی میں اس پر اتنی جلدی عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اول تو میرے پاؤں میں لوہے کے کڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں اتنی تیزی سے نیچے اتر کر ٹیلے کے پاس یا اس کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ خطرہ ہر لمحہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا کہ جاپانی سپاہی کی نظر کسی وقت بھی مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ جیسے ہی اس نے مجھے گڑھے سے نکل کر نالے کی طرف جاتے دیکھا وہ اوپر سے

تو میرے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔ میں نے اس طرف سے نظریں ہٹالیں اور روڑی کوٹنے لگا۔ اس لڑکی کو میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی لڑکی ہو سکتی تھی جس کی وہاں سوجدگی کا مجھے وہم و گمان تک نہیں تھا۔ میں نے کام کرتے کرتے اوپر نگاہ ڈالی۔ میری نگرانی کرنے والا جاپانی سپاہی روڑی کے ڈپو کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے جلدی سے گردن موڑ کر نیچے دیکھا۔

اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ ندی کنارے جو لڑکی کپڑے دھو رہی ہے وہ سائیں تھی۔ یعنی وہی لڑکی جو رنگون کے سولی پیکوڈا کی سیڑھیوں پر پھول بیچا کرتی تھی اور جس سے میں محبت کرنے لگا تھا۔ میں سائیں کو دیکھ رہا تھا اور اس کے نقوش زیادہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سائیں ہی تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ وہ بھی میری طرف دیکھے۔ میں نے کام کرتے کرتے ایک روڑا اس کی طرف لڑھکا دیا۔ روڑا سائیں کے قریب ہی ندی میں گرا تو اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر اس طرف دیکھا جہاں سے یہ روڑا نیچے گرا تھا۔ اوپر میں کھڑا تھا اور مسلسل اس کی طرف تک رہا تھا۔ جب ہماری نگاہیں ملیں تو میں نے آہستہ سے ہاتھ نیچے کر کے ہلایا۔ میں نے دیکھا کہ سائیں اپنا جگہ پر ساکت سی ہو گئی تھی۔ کپڑے دھوتے دھوتے اس کے ہاتھ وہیں رک گئے تھے۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری اس دگرگوں حالت میں بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے اوپر نگاہ ڈالی۔ جاپانی سپاہی بدستور پشت میری طرف کئے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر سائیں کو ایسا اشارہ کیا کہ وہ میرے قریب بالکل نہ آئے۔ ہمارا فاصلہ تیس چالیس گز کا ہو گا۔ سائیں نشیب میں تھی۔ وہ میرا اشارہ پاتے ہی جلدی سے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کپڑے دھونے لگے لیکن وہ مسلسل میری طرف چہرہ کئے دیکھ رہی تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں سائیں جذبات میں آکر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ جس سے جاپانی سپاہی کی توجہ اس طرف ہو جائے اور سائیں پر کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے۔ میں نے ٹوکری اٹھائی اور روڑی لینے اوپر چلا گیا۔ جب میں ٹوکری میں روڑی بھر کر اسے سر پر اٹھائے نیچے اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ سائیں وہاں نہیں تھی۔ وہ چلی گئی تھی۔ میرا دل اداس ہو گیا۔ سائیں کو دیکھ کر میرے بدن میں خوشی کی جو لہر دوڑ گئی تھی وہ بھی غائب ہو گئی۔ مجھے ایراوتی کے ملاحوں کا گیت یاد آنے لگا۔

ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے

بعد مجھے وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پھر میں سائیں کو اور سائیں مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یا اللہ سائیں وہاں آجائے۔ کیونکہ اس کے اشارے کے بغیر میں وہاں سے نیچے نہیں جاسکتا تھا۔ میں ٹوکری میں تھوڑی روڑی بھر کر گڑھے میں لے جاتا تھا کہ اسے بھرنے میں کافی دیر لگے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے سائیں نظر آ گئی۔ وہ ایک ٹوکری میں کپڑے رکھے آئی اور نالے کے پاس پتھروں پر آکر بیٹھ گئی۔ اس نے آتے ہی مجھے دیکھا۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ اس نے ہاتھ سے کوئی اشارہ نہ کیا۔ شاید اوپر سے جاپانی سپاہی اس کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اوپر نگاہ نہ اٹھائی اور روڑی کوٹنے میں لگا رہا۔ پھر خالی ٹوکری لے کر اوپر گیا۔ ٹوکری میں روڑی بھری اور جب آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا تو سائیں ہاتھ کے اشارے سے مجھے نیچے بلا رہی تھی۔ میں نے روڑی گڑھے میں الٹ دی اور اسے برابر کرنے لگا۔ ایک نگاہ سائیں پر ڈالی۔ وہ کپڑے نچوڑ کر ٹوکری میں رکھ رہی تھی۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس نے ٹوکری بغل میں دبائی اور نالے کی دوسری طرف جھاڑیوں کی طرف چل دی۔ میری امیدوں پر ایک بار پھر اس پر نے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں آواز دے کر سائیں سے کہوں۔

”سائیں! میں ابھی آ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں خدا کے لئے ابھی نہ جانا۔“ میں اسے مشقت کرتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سائیں جھاڑیوں کی اوٹ میں جا کر چھپ کر بیٹھ گئی تھی اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کیا تو اس نے دو تین بار زور زور سے ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ یہ میری زندگی کی فیصلہ کن گھڑی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ نہیں سوچتا تھا۔ کچھ غور نہیں کرتا تھا۔ صرف فیصلہ کرنا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس پر عمل کر دیتا تھا۔ یہ فیصلہ کا عمل تھا یا عمل کا فیصلہ تھا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ مجھے کھولتے ہوئے لاوے والے آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کے اوپر سے چھلانگ لگا کر گزرتا تھا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی ذرا سی بھولی مجھے موت کی نیند سلا سکتی تھی۔

مجھ پر گولی چلا دے گا۔

میرے دماغ میں ایک ہل چل ضرور مچ گئی تھی۔ میرے سامنے فرار کا راستہ کھلا تھا۔ فرار کا دروازہ دو قدم کے فاصلے پر تھا مگر یہ دو قدموں کا فاصلہ مجھے موت کے پیٹ میں سے گزر کر طے کرنا تھا۔ میں لوہے کے دموسے سے روڑی کوٹ کر برابر کر رہا تھا اور تنکھیوں سے سائیں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ کپڑے دھوتے دھوتے میری طرف تھوڑی دیر کے لئے دیکھ لیتی تھی۔ اس کے چند لمحوں کے بعد میں نے نیچے دیکھا تو سائیں وہاں نہیں تھی۔ میری آنکھوں کے آگے جیسے ایکدم اندھیرے کا پردہ گر پڑا۔ اوپر سے جاپانی سپاہی نے مجھے شاید اپنی زبان میں گالی دے کر کچھ کہا۔ میں جلدی جلدی کام کرنے لگا۔ سارا دن گزر گیا۔ مگر سائیں دوبارہ دکھائی نہ دی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں نے اپنی زندگی کا ایک سنری موقع کھو دیا ہے۔ اب میں کبھی وہاں سے نجات حاصل نہ کر سکوں گا۔ سورج غروب ہو جانے پر ہماری ایک جگہ گنتی ہوئی اور ہمیں معمول کے مطابق بیرک میں بند کر دیا گیا۔

ساری رات میں سخت الجھن کا شکار رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا کہ میں نے سائیں کے اشارے پر عمل کیوں نہ کیا۔ مجھے نیچے اتر جانا چاہئے تھا۔ سائیں کو معلوم تھا کہ میں جاپانیوں کی قید میں ہوں اور اس نے میرے فرار کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ڈھونڈ نکالا ہو گا۔ وہ جاپانی سپاہی کی موجودگی سے بے خبر نہیں تھی۔ جاپانی سپاہی تو اسے مجھ سے زیادہ اوپر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں جاپانی سپاہی کی آنکھ بچا کر نیچے بھاگ آؤں۔ اگرچہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے پاؤں میں بیڑی پڑی ہوئی ہے۔ میں نے سونے سے پہلے فیصلہ کر لیا کہ اگر کل مجھے سائیں وہاں مل گئی تو میں اس کا اشارہ پاتے ہی نیچے اتر جاؤں گا۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ مرنا تو یہاں بھی ہے۔ مگر سسک سسک کر مرنے سے فرار کی کوشش کرتے ہوئے مر جانا زیادہ اچھا تھا۔ اس طرح کم از کم یہ امید تو تھی کہ میں فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔

میری قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اگلے روز بھی مجھے اسی جگہ کام پر لگا دیا گیا۔ اس روز اس مقام پر کوئی دوسرا جاپانی سپاہی نگرانی پر تھا۔ میں نے وہاں آتے ہی سب سے پہلے نیچے دیکھا۔ سائیں نالے پر نہیں تھی۔ میں گمراہ سانس بھر کر خاموشی سے اپنے کام پر لگ گیا۔ گڑھا کافی بھر چکا تھا اور یقینی بات تھی کہ دوپہر کے

تک لڑھکتا چلا گیا۔ اب سائیں کو معلوم ہوا کہ میرے پاؤں میں لوبہ کی بیڑیاں یا کڑے پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھا لیا اور میرا ہاتھ اپنے کاندھے پر رکھ کر مجھے چلانے لگی تو میں نے کہا۔

”میں چل سکتا ہوں سائیں۔ یہاں سے نکلنے کی کرو۔“

سائیں نے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اور کپڑے والی ٹوکری ہاتھ میں لٹکائے جہاں ٹیلے کی ڈھلان زمین کے ساتھ مل جاتی تھی وہاں آکر رک گئی۔ میں بھی قدم قدم چل کر اس کے پاس آ گیا۔

عین اس وقت پیچھے کی جانب سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں سیٹیوں کی آواز بھی تھیں۔ پھر اوپر تلے تین چار فائروں کے دھماکے ہوئے۔ جاپانیوں کو میرے فرار کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے سائیں کی طرف گھبراہٹ میں دیکھا۔

”انہیں پتہ چل گیا ہے۔“

سائیں بھی ساری آوازیں سن رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”آ جاؤ۔ آ جاؤ۔“

ٹیلے کے نشیب میں زمین سے چند فٹ اوپر جھاڑیوں کی ایک دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اس کے نیچے لے گئی۔ جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ ہمیں ہاتھوں کی مدد سے ٹہنیوں کو ادھر ادھر ہٹا کر راستہ بنانا پڑ رہا تھا۔ سائیں مجھے ان جھاڑیوں کے پیچھے چھپانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی سادگی پر رونا آ گیا۔ جاپانی بڑی آسانی سے ہم دونوں کو یہاں پکڑ سکتے تھے۔ میرے ساتھ سائیں بھی موت کے گھاٹ اترنے والی تھی۔ میں نے سائیں سے کہا۔

”سائیں، پلیز! تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو۔“

سائیں نے کوئی جواب نہ دیا اور جھاڑیوں کے پیچھے ہٹا بیٹھی۔ جھاڑیاں ختم ہوئیں تو سامنے ایک غار کا دہانہ نمودار ہو گیا۔ یہ اوپر نیچے پڑے ہوئے تین چار بڑے بڑے پتھروں کی سلوں کے درمیان بنا ہوا ٹکونا سوراخ تھا۔ سائیں نے کپڑوں کی ٹوکری سوراخ کے اندر غار میں پھینک دی اور خود بھی رینگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے رینگ کر غار میں گھس گیا۔ ہمارے اندر جاتے ہی جھاڑیاں دابیں اپنی جگہ پر آ گئیں اور غار کے منہ کے آگے ایک دیوار سی بن گئی۔

میں غار میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جیسے ہی سائیں نے جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ہاتھ ہلا کر مجھے بلایا۔ میں نے اوپر سڑک کی طرف دیکھا۔ جاپانی سپاہی دوسری طرف منہ کئے پتھروں پر بیٹھا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے ہاتھ میں تھاما ہوا ہانس وہیں چھوڑا اور نشیب میں اترنے کی بجائے اپنے آپ کو نشیب کی جھاڑیوں میں لڑھکا دیا۔ میں اونچی گھاس اور جھاڑیوں پر گیند کی طرح لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ نالے پر رکتے ہی میں وہیں ساکت ہو کر پڑا رہا۔ پھر اونچی گھاس میں سے اوپر دیکھا۔ جاپانی سپاہی اسی طرح میری طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا۔ میں نے سائیں کی طرف دیکھا۔ وہ جھاڑی کی اوٹ میں سے اٹھ کر کچھ اور پیچھے چلی گئی تھی اور زور زور سے ہاتھ ہلا کر مجھے بلا رہی تھی۔ میں بجلی کی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا مگر بجلی کی تیزی کے ساتھ چل نہ سکا۔ پاؤں کی بیڑیاں مجھے تیز چلنے نہیں دے رہی تھیں۔ ان کی وجہ سے پہلے ہی میرے ننھے زخمی ہو کر سوخ گئے تھے۔ بس جتنی تیز چل سکتا تھا چل کر میں ندی میں اتر گیا۔ پھر پانی میں سے گزرتا دوسرے کنارے پر پہنچا۔ پھر دوسرے کنارے سے نکل کر سائیں کی طرف بڑھا اور جیسے ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں سائیں کے پاس پہنچا میں گر پڑا۔

سائیں نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں اپنی خاص ہندوستانی زبان میں کہا کہ جلدی اٹھو۔ اس طرف آ جاؤ۔ اس طرف آ جاؤ۔ میں فوراً ”سنبل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سائیں تیز تیز چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اونچی اونچی جھاڑیوں کی طرف جا رہی تھی۔ میں بھی اپنے بوجھل قدم اٹھاتا اس کے پیچھے پیچھے گھسنا جا رہا تھا۔ سائیں میرے آگے آگے جھاڑیوں اور اونچی گھاس کو ہٹاتی جلدی جلدی چل رہی تھی اور ہاتھ سے مجھے نیچے آنے کا اشارہ بھی کر دیتی تھی۔ یہاں کوئی گڈ بند نہی نہیں تھی۔ اونچی اونچی گھاس تھی اور جنگلی جھاڑ جھکاڑاگا ہوا تھا۔ اوپر درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ جھاڑیاں ختم ہو گئیں۔ سامنے ایک ٹیلے کی ڈھلان تھی۔ سائیں وہاں سے نیچے اتر گئی۔ میں نیچے اترتے ہوئے گر پڑا اور نیچے

وہاں اندھیرا تھا۔ سائیں نے کہا۔
”میں موم بتی اور ماچس ساتھ لائی ہوں مگر یہاں موم بتی نہیں جلائی چاہئے
میرا ہاتھ پکڑ کر چلے آؤ۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور غار میں چلنے لگی۔ غار کی فضا میں رطوبت اور
جس تھا۔ جاپانی سپاہیوں کی آوازیں اب دور سے آتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے
بعد کوئی غار بھی نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے جاپانی میری تلاش میں نکل پڑے تھے۔ ایک
جگہ سائیں غار کے ساتھ گھوم گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے وہاں آ چکی ہے اور اس
نے مجھے جاپانیوں کی قید میں دیکھنے کے بعد اس غار میں میرے چھپنے کا بندوبست کر رکھا
تھا۔ غار کا موڑ مڑتے ہی سائیں رک گئی۔ اس نے موم بتی روشن کر دی۔ یہ ایک
قدرتی غار تھا جو پہاڑیوں کے اندر بنا ہوا تھا۔ غار میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر
بکھرتے ہوئے تھے۔

میں نے سائیں سے کہا۔
”سائیں! جاپانی اس غار میں بھی آ سکتے ہیں۔“
وہ کہنے لگی۔

”جہاں میں تمہیں لے جا رہی ہوں وہاں وہ نہیں آئیں گے۔“
جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ سائیں مجھ سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتی
تھی جس کو اس زمانے میں ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ مجھے چونکہ اب اس کی ٹوٹی پھوٹی
اردو پھوڑی طرح سے یاد نہیں رہی اس لئے میں اس کے مکالموں کو سادہ اردو زبان
میں لکھ رہا ہوں۔

اس غار کے اندر ایک اور چھوٹا سا غار تھا جو بند ہو جاتا تھا اور بالکل ایک
گھمایا حجرے کی طرح تھا۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ غار کی دیوار کے ذرائع
اتر کر آتا تھا۔ نیچے اترنے کے لئے پتھر کی ایک سل کو پیچھے ہٹانا پڑتا تھا۔ سائیں نے
موم بتی ایک طرف لگا دی۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر سل کو ایک طرف ہٹایا۔
نیچے ایک شکاف تھا جس کے پہلو میں بند حجرہ تھا۔ ہم حجرے میں آ گئے۔

سائیں نے یہاں پہلے سے ہی زمین پر ناریل کی چھال سے بنائی گئی صف بچا
رکھی تھی۔ ایک مٹی کے ٹکے میں پانی بھر کر رکھا ہوا تھا۔ حجرہ اگرچہ چاروں طرف
سے بند تھا اور پتھر کی سل شکاف کے منہ پر رکھنے سے وہ اور زیادہ بند ہو گیا تھا مگر

اندر تازہ ہوا کا احساس ہو رہا تھا۔ میں صف پر بیٹھ گیا۔ سائیں نے موم بتی ایک پتھر
پر لگا دی اور میرے پاس بیٹھ کر میرے پیروں کی بیڑیاں اور سوئے ٹخنوں کو
دیکھنے لگی۔

”میں یہاں لگانے کے لئے مرہم لاؤں گی۔ ہم زخموں پر لگانے کے لئے ایک
جڑی بوٹی کوٹ کر اس کی مرہم بناتے ہیں۔ اس سے زخم بڑی جلدی اچھا ہو جاتا
ہے۔“

اس نے مجھے منکے میں سے پانی نکال کر پلایا۔ کہنے لگی۔
”میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ تم ہو۔ کیا تم نے بھی مجھے پہچان لیا
تھا؟“

میں نے کہا۔
”ہاں سائیں۔ میں نے بھی تمہیں پہچان لیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے یقین
نہیں آ رہا تھا کہ میں سائیں کو دیکھ رہا ہوں۔“
وہ بولی۔

”مجھے بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ اوپر
جنگل میں جاپانیوں نے قیدیوں کے لئے کیپ بنایا ہے اور سڑک پر قیدی لوگ کام
کرتے ہیں۔ مگر مجھے تم یہاں مل جاؤ گے یہ مجھے خیال تک نہیں تھا۔“
پھر ہم رنگوں پر جاپانی طیاروں کی بمباری کی باتیں کرنے لگے۔ جب میں نے
اسے بتایا کہ پہلی بمباری کے فوراً بعد میں اسے دیکھنے سولی پیکوڈا گیا تھا تو وہ کہنے
لگی۔

”ہمارے ایک ماما نے ہمیں ایک دن پہلے کہہ دیا تھا کہ کل جاپانی جہاز رنگوں
پر بمباری کرنے آئیں گے۔ ہم ایک دن پہلے رنگوں سے نکل گئے تھے۔“
میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا تمہارا گاؤں یہاں سے قریب ہی ہے؟“
اس نے کہا۔

”نہیں۔ یہ ہمارا گاؤں نہیں ہے۔ جاپانیوں کے آ جانے کے بعد میرے ماما
مجھے اور ہم سب کو گاؤں سے نکال کر یہاں لے آئے تھے۔ یہاں میرے ماما کا
ناریل کا باغ ہے۔ ہم لوگ دریا پر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ دریا ہمارے گاؤں کے پاس

ہی رہتا ہے۔“

باہر سے آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سائیں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ پہ جاپانی فوجی تھے جو مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ جاپانیوں کو اس جنگل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ جس غار میں میں چھپا ہوا تھا اس کا منہ جھاڑیوں کی آڑ کی وجہ سے ویسے بھی باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ جاپانی فوجی آگے نکل گئے۔ جب ان کی آوازیں دور چلی گئیں تو میں نے سائیں سے کہا۔

”میں یہاں زیادہ دیر تک نہیں چھپ سکتا۔ گاؤں کے کسی آدمی نے جاپانیوں کو بتا دیا کہ یہاں ایک غار بھی ہے تو میں پکڑا جاؤں گا۔“

سائیں سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے گاؤں کے دو ایک آدمی جاپانی سپاہیوں کے پاس اکٹرا جاتے رہتے ہیں۔ لیکن تم فکر نہ کرو اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گی۔“

میں نے کہا۔

”سائیں! میں چاہتا ہوں کہ رنگوں سے بنگال کی طرف جانے والے کسی قافلے میں شامل ہو جاؤں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں۔“

سائیں نے کہا۔

”ماما نے بتایا تھا کہ دریا پار ایسے قافلے سفر کر رہے ہیں۔ میں تمہیں دریا پار کرا دوں گی مگر ابھی تم اسی جگہ چھپے رہو۔ میں جاتی ہوں۔ تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے کر جلدی آ جاؤں گی۔ یہاں سے باہر مت نکلتا۔“

سائیں چلی گئی۔ میں غار کے حجرے میں بیٹھا رہا۔ یہ حجرہ کسی بڑی قبر کی طرح لگ رہا تھا۔ مگر اس کی وجہ سے میرے جان بچی ہوئی تھی۔ اندر کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ دن ہے یا رات۔ موسم بتی جل رہی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں سے بیڑیوں کے کڑے نکالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کافی دیر بعد سائیں آئی۔ وہ میرے لئے ابلے ہوئے چاول اور مچھلی لائی تھی۔ اس نے ٹوکری میں سے ناریل کے تیل کی شیشی نکالی اور کہا۔

”پاؤں آگے کرو۔ میں لوہے کے کڑوں میں سے تمہارے پاؤں نکالنے کی

کوشش کرتی ہوں۔“

وہ میرے ٹخنوں اور پاؤں پر تیل کی مالش کرنے لگی۔ پھر اس نے بیڑی اتارنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے کہا۔

”میں کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے ٹخنوں پر تھوڑا سا اور تیل لگایا اور کافی جدوجہد کے بعد میرا پاؤں دھبے کے کڑے میں سے باہر نکل آیا۔ اس طرح میں نے دوسرے پاؤں کو بھی بیڑی کے کڑے سے نکال لیا۔ میں نے سائیں سے کہا۔

”سائیں میرے جوتے پھٹ گئے ہیں۔ کیا یہاں کہیں سے جوتے مل جائیں گے۔“

سائیں کہنے لگی۔

”ہم لوگ بہت کم جوتے پہنتے ہیں۔ ماما ایک بار شہر سے ربڑ کے جوتے لایا تھا میں وہ لاکر تمہیں دکھاؤں گی۔“

میں نے سائیں سے کہا۔

”کیا تم اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں بتاؤ گی؟ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ خبر جاپانیوں تک نہ پہنچ جائے۔“

سائیں نے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے ماما بھی جاپانیوں کے ساتھ ہیں اور وہ ان کے لئے قیدی کیمپ میں مچھلیاں لے کر جایا کرتے ہیں۔“

میں نے جلدی سے کہا۔

”پھر خدا کے لئے کسی کے آگے میرا ذکر نہ کرنا۔“

وہ بولی۔

”میں یو قوف نہیں ہوں۔“

اور وہ مسکرانے لگی۔ موسم بتی کی پاکیزہ روشنی میں اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ اس کا چہرہ زرد کنول کے پھول کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے ٹوڑے میں سفید پھول لگائے ہوئے تھے اور کرتی کے اوپر نسواری رنگ کا لنگا باندھا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

”اگر تم ضرور اپنے ملک جانا چاہتے ہو تو میں تمہارے دریا پار کرنے کا سارا

بند حجرے میں گزاری۔ سائیں مجھے باہر نکلنے سے منع کر گئی تھی۔ لیکن میں حجرے میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ میں نے پتھر کی سل کو ہٹایا اور غار میں آکر اندھیرے میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا غار کے دہانے پر آ گیا۔ یہاں جھاڑیوں کی دیوار پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ابھی دن نہیں نکلا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہٹا کر تھوڑا سا باہر سر نکال کر دیکھا۔ جنگل میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ تازہ ہوا میں آنے سے مجھے ایک نئی توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو میں جلدی سے جھاڑیوں کی دیوار میں سے پیچھے ہٹ کر غار میں آ گیا اور وہاں سے چل کر واپس اپنے حجرے میں آکر بیٹھ گیا۔ سائیں مجھے چھ سات موم بتیاں دے گئی تھی۔ پتھر پر موم بتیوں کے جلنے سے موم جمع ہو گئی تھی۔ میرے کان باہر کی آواز پر لگے تھے۔ کوئی غار کے قریب سے ہو کر گزر گیا تھا خدا جانے یہ کوئی دیہاتی تھا یا کوئی جنگلی جانور تھا۔

دوسرے دن سائیں نے آکر مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ میرے دریا پار کرنے کا انتظام ہو گیا ہے۔

”میں آدھی رات کے بعد تمہارے پاس آؤں گی اور تمہیں اپنے ساتھ دریا پار لے جاؤں گی۔ وہاں میری سہیلی موجود ہوگی چھوٹی کشتی بھی ہوگی۔“

سائیں کچھ دیر میرے پاس بیٹھی رہی۔ وہ میرے لئے جنگلی کیلے اور کھجور لائی تھی۔ جب وہ چلی گئی تو میں سوچنے لگا کہ اگر فرار ہونے کے بعد سائیں مجھے نہ ملتی تو میں ان جنگلوں میں خدا معلوم اس وقت کہاں بھٹک رہا ہوتا۔ سائیں اپنے وعدے کے مطابق آ گئی۔ اس نے بتایا کہ رات آدھی گزر چکی ہے۔ وہ میرے لئے ریز کے پرانے جوتے بھی لائی تھی۔ میں نے انہیں پن لیا۔ بس کچھ پورے تھے پورے نہیں بھی تھے لیکن میرے پاؤں جنگل کے سفر کے لئے کسی حد تک محفوظ ہو گئے تھے۔ کہنے لگی۔

”میرے ساتھ آ جاؤ۔“

غار سے باہر نکل کر میں نے لمبا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ مجھے خفیہ راستے سے اس علاقے سے نکال کر لے گئی۔ ہم جنگل سے باہر آ گئے تھے۔ یہاں آلوں بھرا آسمان بہت وسیع نظر آ رہا تھا۔ ہم ایک کچے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ ٹائیں آگے آگے چل رہی تھی۔ ہم ایک گھاٹی میں اتر گئے۔ یہاں کافی دور تک چلنے

بندوبست کرا دوں گی۔ میری ایک سہیلی کا باپ مجھیرا ہے۔ ان کی تین چار کشتیاں ہیں۔ تم ایک کشتی میں بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں دریا پار کر سکتے ہو۔“

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ کیا واقعی تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ میں سائیں سے کبھی جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن میں اس کے پاس رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ جاپانی میرا سر قلم کرنے کے واسطے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اگر انہیں علم ہو گیا کہ اس لڑکی نے مجھے پناہ دی تھی تو وہ سائیں کا بھی سر قلم کر دیتے۔ میں نے سائیں سے کہا۔

”اگر ایسا کوئی انتظام ہو جائے تو بڑا اچھا ہو گا۔“

سائیں نے کہا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا میری سہیلی ضرور میری مدد کرے گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ ابھی تک ہمارے گاؤں میں کوئی جاپانی فوجی نہیں آیا۔ لیکن میرے ماما کو جاپانیوں نے بلا بھیجا تھا۔ جاپانیوں نے ماما کو ضرور بتا دیا ہو گا کہ ایک قیدی کیمپ سے فرار ہو گیا ہے۔ گاؤں کے آس پاس نظر آئے تو اسے پکڑ لیتا۔ میں رات کو سارا پتہ کر کے آؤں گی۔“

سائیں چلی گئی۔ کافی دیر گزر گئی۔ باہر ضرور شام ہو گئی تھی۔ اس کے بعد باہر سے کسی جاپانی سپاہی کی آواز نہیں آئی تھی۔ کوئی آدمی ادھر سے گزرا بھی نہیں تھا۔ اس دوران میں تھوڑی دیر وہیں فرش پر پڑے پڑے سو بھی گیا۔ سائیں آئی اس نے بتایا کہ باہر رات ہو گئی ہے۔ وہ جنگل کے کسی محفوظ راستے سے ہو کر وہاں تک آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ دو جاپانی فوجی ماما کے ساتھ گاؤں میں آئے تھے انہوں نے سب کو جمع کر کے کہا کہ قیدی بھاگ گیا ہے۔ اگر کسی نے اسے اپنے گھر میں چھپایا تو اس کے سارے گھر والوں کے سر کاٹ دیئے جائیں گے۔ میں خاموش رہا۔

سائیں کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”میرے دریا پار کرنے کا کوئی انتظام ہوا ہے سائیں؟“

سائیں میرے لئے کھانا لائی تھی۔ کہنے لگی۔

”میں صبح اپنی سہیلی کے ہاں جاؤں گی۔ اس کا گاؤں دریا کے کنارے

زیادہ دور نہیں ہے۔ میں کل آکر تمہیں بتاؤں گی۔“

سائیں کے جانے کے بعد میں نے وہ رات بڑی بے چینی کی حالت میں

رسی کے کھلتے ہی کشتی دریا کی لہروں پر چل پڑی۔ میں چپو چلانے لگا۔ میری آنکھوں سائیں کو دیکھ رہی تھیں۔ رات کے دھندلے اندھیرے میں وہ مجھ سے دور ہو رہی تھی۔ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کشتی دریا میں آگے نکل گئی تھی۔ میں نے چپو چلاتے ہوئے کشتی کا رخ دوسرے کنارے کی طرف کر دیا۔

کے بعد باہر نکلے تو سامنے دریا کا چوڑا پاٹ ستاروں کی روشنی میں دکھائی دیا۔ دریا کے کنارے ایک جانب اونچے اونچے سرکنڈوں کی بہت سی جھاڑیاں تھیں۔ جب اس کے قریب آئے تو ستاروں کی دھندلی روشنی میں ایک دہلی سی عورت نکل کر سامنے آ گئی۔

یہ سائیں کی سہیلی تھی۔ سائیں نے اس سے بری زبان میں کوئی بات کی۔ لڑکی ہمیں سرکنڈوں کے پیچھے لے گئی۔ یہاں دریا میں ایک جھوٹی کشتی جس کو وہاں کے لوگ سمپان کہتے تھے گھڑی تھی۔ سائیں میرے قریب آ گئی۔ کہنے لگی۔
”میں نے بھنے ہوئے چاول کشتی میں رکھ دیئے ہیں۔ دریا پار تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو گھاٹ ہیں۔ وہاں اونچے اونچے بانس لگے ہوئے ہیں۔ اندھیرے میں تمہیں وہ بانس نظر آ جائیں گے۔ دوسرے گھاٹ سے تم دائیں جانب چل پڑنا۔ آگے پھروں کا ایک چھوٹا چوہترہ آ جائے گا۔ چوہترے پر بھگوان بدھ کا مجسمہ ہو گا۔ تم رات وہاں بسر کرنا۔ دن نکلنے پر مجھ سے پیچھے کی جانب چل پڑنا۔ تھوڑی دور چلا گے تو ایک گاؤں آ جائے گا۔ ماما نے بتایا تھا کہ رنگون سے آنے والے لوگ قاتلوں کی شکل میں ادھر سے گزرتے ہیں۔“

میں سائیں کو تک رہا تھا۔ یہ جدائی کی گھڑی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس معصوم کنول کے پھول ایسی لڑکی سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں اور اب شا زندگی میں کبھی یہ چہرہ آنے سامنے دیکھنا نصیب نہیں ہو گا۔ ستاروں کی روشنی! سائیں کا زرد چہرہ کنول کے زرد پھول کی طرح اداس تھا۔ اس کی آنکھوں! غمگین ہوئے ستاروں کی چمک تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”سائیں! میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

سائیں نے چہرہ نیچے کر لیا۔ پھر آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔

”اب دیر نہ کرو۔ جاپانی سپاہی تمہاری تلاش میں ہیں۔ مجھے بھی جلدی

پہنچنا ہے۔ سب کو سوتا چھوڑ کر نکل آئی ہوں۔“

میں نے سائیں کا نیم گرم چھوٹا سا ہاتھ چوم لیا اور سمیان میں بیٹھ گیا

چپو تھام لئے۔ سائیں کی سہیلی نے کشتی کی رسی کھول دی۔ سائیں نے کہا۔

”سمپان کو دوسرے کنارے کسی جگہ باندھ دینا۔“

اگرچہ جاپانی سپاہیوں کا خطرہ ملا نہیں تھا کیونکہ سارے براہ پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا مگر اس جنگل میں کسی جاپانی سپاہی کا میری تلاش میں۔ آنے کا امکان بہت کم تھا۔ کچھ جاتے، کچھ سوتے ہوئے رات کٹ گئی۔ درختوں میں دن کا اجالا پھیل گیا۔ پرندوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ چبوترے کی پشت کی جانب درختوں میں ایک گھنڈی جا رہی تھی۔ یہ گھنڈی اس بات کی علامت تھی کہ آگے ضرور کوئی گاؤں ہے۔ لوگ دریا کے گھاٹ پر سے آتے ہوئے یہاں سے گاؤں کی طرف جاتے ہوں گے۔ راستے میں ایک جانب مجھے ایک گاؤں کے جھونپڑے نظر آئے۔ میں ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ گھنڈی میں سے ایک شاخ نکل کر گاؤں کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ اتنا گھٹا جنگل نہیں تھا۔ درختوں کے جھنڈ بھی آ جاتے تھے اور گھاس کے میدان بھی آ جاتے تھے۔ دن کے وقت بھی وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس بات کا خطرہ ضرور لگا ہوا تھا کہ کہیں جاپانی فوجی نہ اچانک سامنے آ جائیں۔ چلتے چلتے آخر میں ایک سڑک پر نکل آیا۔ یہاں مجھے سڑک کی دونوں جانب بکھرے ہوئے کانڈ اور پرانے کپڑوں کے چھتڑے نظر پڑے۔ ایک جگہ پتھروں کو جوڑ کر آگ جلائی گئی تھی جو اب بجھ چکی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ رنگوں سے آنے والے قافلے اسی سڑک پر سے گزرتے ہیں۔

میں تھک گیا تھا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا کہ اتنی دیر میں شاید پیچھے سے کوئی قافلہ آ جائے اور میں اس میں شامل ہو جاؤں۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی تو اٹھ کر ادھر ادھر پانی تلاش کرنے لگا۔ اس جگہ کوئی ندی تالاب یا جھیل وغیرہ نہیں تھی۔ واپس آ کر پھر اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے جب مجھے کافی وقت گزر گیا تو میں نے سوچا کہ مجھے آگے چل پڑنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کسی قافلے نے آگے پڑاؤ ڈال رکھا ہو۔ یہ سوچ کر میں اٹھا ہی تھا کہ سڑک پر پیچھے کی جانب کچھ آوازیں سی سنائی دیں۔ یہ تیل گاڑیوں کے پیسوں کی آواز تھی۔ میں وہیں رک گیا اور پیچھے دیکھنے لگا۔ سڑک کچھ دور پیچھے جا کر ایک طرف مڑ جاتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ایک تیل گاڑی نمودار ہوئی۔ آگے ایک تیل جتا ہوا تھا۔ گاڑی پر سامان بھی لدا تھا اور کچھ عورتیں اور بچے بھی بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے ایک اور تیل گاڑی تھی۔ ہر ایک اور تیل گاڑی تھی۔ یہ ماجرین کا قافلہ تھا۔ مرد گاڑیوں کے ساتھ ساتھ بٹل بھی چل رہے تھے۔ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں تیل گاڑیوں پر بیٹھی تھیں۔

دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح چپو چلاتے ہوئے کشتی کو دوسرے کنارے تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کافی آگے نکل آیا ہوں۔

دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد میں نے کشتی کو کھینچ کر جھاڑیوں میں چھپا دیا اور ایک جگہ سے تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر کنارے کے اوپر آ گیا۔ یہاں دریا کا کنارہ اونچا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے پر دونوں جانب اندھیرا تھا۔ مجھے اس گھاٹ کی تلاش تھی جہاں سے مجھے دائیں جانب جنگل میں اترنا تھا۔ دریا میں گاڑے ہوئے بانس بھی کہیں نظر نہ آئے۔ میں کنارے کنارے پیچھے کی جانب چلنے لگا۔ کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد اندھیرے میں مجھے اونچے اونچے بانس دریا میں سے باہر نکلے ہوئے نظر آ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھاٹ بنا ہوا تھا اور پانی میں بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں یہاں سے دائیں جانب ہو کر درختوں میں اتر گیا۔ مجھے اس چبوترے تک پہنچنا تھا جہاں مہاتما بدھ کا مجسمہ نصب تھا۔ سپان میں سے میں نے بھنے ہوئے چاولوں کی جھوٹی سی تھیلی اٹھالی تھی۔ یہاں درختوں کے کافی جھنڈ تھے۔ میں رک رک کر راستہ دیکھ دیکھ کر چل رہا تھا۔ اندھیرے میں آنکھیں کھول کر دیکھ رہا تھا۔ آخر میری نظر ایک ٹبے پر پڑی۔ اونچے اونچے درختوں کے درمیان یہ ایک چبوترہ تھا۔ قریب آیا تو دیکھا کہ چبوترے کے درمیان میں گوتم بدھ کا مجسمہ نصب تھا۔ مہاتما بدھ الٹی پالٹی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک لمبے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے شہزادہ گوتم تھوڑی دیر پہلے اپنے محل کی عشرت گاہ سے نکل کر یہاں مراقبے میں آ کر بیٹھ گیا ہے اور انسانوں کے دکھ درد کی اصل وجہ معلوم کرنے کے لئے گہری سوچ میں گم ہے۔

مجھے یہاں باقی رات بسر کرنی تھی۔ میں مجسمے کے پیچھے اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ جاپانیوں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

قافلہ جوں کی چال چل رہا تھا۔ دو تین سو آدمیں کا قافلہ تھا۔ میں بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا اور ایک بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہ سارے لوگ ہندوستانی یعنی انڈیا کے رہنے والے تھے۔ بے حد خستہ حال تھے۔ ایک دوسرے سے بیزار نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی گاڑی میں کوئی بچہ رونے لگتا تو کسی مرد کے اسے جھڑکنے کی آواز سنائی دیتی۔ ایک بوڑھا وھیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا جسے ایک نوجوان آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہاں کسی کے پاس پانی ہوگا۔ اس نے پیچھے ایک بیل گاڑی کی طرف بیزاری کے ساتھ اشارہ کیا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

پچھلی بیل گاڑی پر ایک فیملی سفر کر رہی تھی۔ ساڑھی والی عورتیں بھی تھیں اور شلوار قمیض والی عورتیں بھی تھیں۔ ایک بزرگ عورت کے پاس مٹی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ بیل گاڑیاں ہچکولے کھاتی ہوئی بت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ میں نے اس عورت سے پانی مانگا تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔

”صرف ایک پیالی پانی ملے گا۔“

میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“

اس نے منکے میں ڈونگا ڈال کر پانی نکالا اور ایک چینی کی پیالی میں ڈال کر مجھے اس طرح دیا جیسے کوئی تیرک ہو۔ میں نے پانی پی کر شکریہ ادا کیا۔ وہ بزرگ عورت شکل سے شمالی ہند کی رہنے والی لگ رہی تھی۔ رنگ گورا تھا اور جسم بھاری تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر سفید دوپٹہ تھا۔ ماتھے پر کالے کپڑے کی پٹی باندھی ہوئی تھی۔ میں پانی پی کر بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس عورت نے پوچھا۔

”تم رنگوں میں کہاں رہتے تھے؟“

میں نے کہا۔

”جی میں لیوس سٹریٹ میں رہتا تھا جو فریئر سٹریٹ کے ساتھ ہی ہے۔“

عورت نے دوسرا سوال کیا۔

”کیا تم پنجاب کے رہنے والے ہو؟“

میں نے کہا۔

”جی ہاں۔ میں امرتسر کا ہوں۔“

”ہم بھی لدھیانے کے ہیں۔ سارا کچھ وہیں رہ گیا ہے۔ پندرہ برسوں میں جو

کچھ کمایا تھا وہیں چھوڑ آئے ہیں۔“

بزرگ عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کے پہلو میں دو نوجوان لڑکیاں بھی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ان کے چروں پر رنج و غم کے تاثرات تھے۔ ان میں سے ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ دوسری کی عمر اٹھارہ انیس برس کی ہوگی۔ بڑی لڑکی نے بزرگ عورت سے کہا۔

”اماں! اب حوصلہ کرو۔ سب کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔“

جو بوڑھا بیل گاڑی کے آگے بیٹھا بیلوں کو چلا رہا تھا وہ بولا۔

”خدا کا شکر کرو عزت آبرو ابھی تک محفوظ ہے۔ جاپانی تو نہ جانے کتنی

عورتوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔“

معلوم ہوا کہ رنگوں سے نکلنے کے بعد کسی جاپانی پلٹن کے کچھ سپاہی فائرنگ کرتے قافلے میں گھس آئے تھے اور کئی ایک نوجوان عورتوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

رات کے وقت اس قافلے نے ایک تالاب کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ وہاں

قریبی گاؤں کے بری لوگ بھنے ہوئے چاول اور پننے لے کر آ گئے۔ یہ چیزیں انہوں نے بوریوں میں ڈال رکھی تھیں اور بغیر کوئی پیسہ لئے انہیں مساجرین میں تقسیم کرنے لگے۔ یہ بڑے دردمند دل رکھنے والے لوگ تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ آگے بڑے خطرناک جنگل شروع ہو رہے ہیں۔ آپ لوگ راتوں کو آگ روشن کر کے سوئیں اور مرد پہرہ دیتے رہیں۔ ادھر شیر بہت ہیں۔

لوگوں نے وہاں بھی رات کو آگ کے الاؤ روشن کر دیئے اور نوجوان مرد

رات کو باری باری پہرہ دیتے رہے۔ کچھ لوگوں کے پاس شکاری بندوقیں اور کارتوس بھی تھے۔ وہ بندوقوں کو بھر کر رکھتے تھے۔ دوسرے دن قافلہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دوپہر کے وقت گھنا جنگل شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ہاتھیوں کی ایک ڈار دیکھی جو سڑک پار کر رہی تھی۔ قافلہ وہیں رک گیا۔ دس بارہ ہاتھی تھے۔ ان کے بچے بھی ساتھ تھے۔ جب ہاتھی گزر گئے تو قافلہ آگے روانہ ہوا۔ جیسے جیسے قافلہ آگے بڑھ رہا تھا کچا راستہ گھڑنڈی کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یہ گھڑنڈی بھی آگے جو قافلے نکل

جی ہائی کمانڈ نے کولمبو میں ایک ریڈیو سٹیشن قائم کیا تھا جہاں سے ان فوجیوں کے لئے 'بنگلہ'، 'تامل'، 'تیلگو'، 'پنجابی'، 'پشتو' گانوں کے ریکارڈ بجائے جاتے تھے اور دوسرے پروگرام بھی نشر ہوتے تھے۔ اس ریڈیو سٹیشن کا نام ریڈیو سی ایک سیلون تھا۔ سی ایک SEAC سے مراد ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ تھا۔ یہ فوجی ریڈیو سٹیشن تھا اور یہاں سے غریزی اور اردو سروس کے پروگرام ہوتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن کے دو سیکشن تھے۔ ایک اردو سیکشن تھا اور دوسرا امریکی سیکشن تھا۔ یہی وہ ریڈیو سٹیشن ہے جو قیام کستان کے بعد ریڈیو سیلون کے کمرشل ادارے میں ضم کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو سیلون برصغیر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی بڑے شوق سے سنا جاتا تھا۔ اس کے کمرشل اثاؤنرسوں میں سنیل دت بھی شامل تھا جس نے بعد میں بطور اداکار شہرت حاصل کی۔ بہر حال اس ریڈیو سٹیشن کی مزید تفصیلات میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

امرتسر سے ہم ایک ٹرین میں بیٹھ کر دلی پہنچے۔ دلی سے ایک ایسی ٹرین بدلی لی جو ہندوستان کی جنوبی تھکون کے آخری سٹیشن دھن کوڑی تک جاتی تھی۔ یہ بڑا باسفر تھا۔ بڑا لمبا روٹ تھا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ راستے میں کون کون سے شہر آئے تھے۔ مجھے اس روٹ کے سارے بڑے بڑے شہر آج بھی یاد ہیں۔ دلی سے اڑی آباد آیا۔ پھر مراد آباد، بریلی، شاہ جمان پور، سیتا پور پھر لکھنؤ آیا۔ بڑا خوبصورت اور خالص مشرقی طرز کا سٹیشن تھا۔ لکھنؤ سے آگے کانپور کا سٹیشن آیا۔ کانپور سے ٹرین جھانسی اور بھوپال سے ہوتی ہوئی ہوشنگ آباد پہنچی۔ یہاں سے اس کا رخ وسطی ہندوستان کی طرف ہو گیا تھا۔ آگے بڑا شہر ناگ پور آیا۔ پھر وارڈھا سٹیشن آیا۔ پھر ایک سٹیشن عادل آباد آیا جہاں میں نے خاکی وردی اور لال ترکی ٹوپوں والے پولیس کے سپاہی دیکھے۔ بھائی جان نے بتایا کہ ہم ریاست حیدر آباد دکن میں داخل ہو گئے ہیں۔ پھر حیدر آباد کا سٹیشن آگیا۔ یہاں ٹرین کافی دیر تک رکی رہی۔ اس کے بعد ایک سٹیشن محبوب نگر آیا۔ پھر کرنول آیا۔ اس کے بعد ایسے سٹیشن آئے گئے جن کے نام تامل، تیلگو زبان میں تھے۔ ان میں سے مجھے چند ایک سٹیشنوں کے نام ہی یاد رہ گئے ہیں۔ بڑے مشکل مشکل نام تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا جب گاڑی دراس کے سٹیشن میں داخل ہوئی۔ ہمیں ٹرین میں سفر کرتے تین دن اور دو راتیں گزر گئی تھیں۔ بھائی جان نے بتایا کہ ابھی ایک رات اور ایک دن کا سفر باقی ہے۔ مگر میں اسی لیے سفر سے زیادہ بور نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ راستے میں کئی دریا، جنگل اور

گئے تھے ان کے چلنے کی وجہ سے بن گئی تھی۔ حقیقت میں ہم کچھ جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ یہ سفر بڑا اذیت ناک تھا۔ ان دنوں کو یاد کر کے میں آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ جو لوگ قافلے میں سفر کر رہے تھے وہ کیسے زندہ سلامت بنگال پہنچ سکے تھے۔ میری اپنی یہ حالت تھی کہ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ پاؤں سوج گئے تھے۔ جسم لاغر ہو گیا تھا۔ چالیس دن کے سفر کے بعد جب کا کس بازار پہنچے تو وہاں انگریزی حکومت کی جانب سے کیمپ لگے تھے۔ ہمیں میڈیکل ایڈ دی گئی، کھانا کھلایا گیا۔ انجکشن لگائے گئے۔ بڑے بڑے ٹرکوں میں بٹھا کر کلکتہ پہنچایا گیا۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد میں امرتسر جانے کی بجائے سیدھا اپنے انکل خواجہ صاحب کے گھر چلا گیا۔

ان لوگوں نے مجھے دیکھا تو پہلی نظر میں بالکل نہ پہچانا۔ چچی رونے لگی۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ میرے گھر والے سخت پریشان رہے تھے۔ ہر ہفتے ان کا خط آتا تھا کہ میری کوئی خبر ہے یا نہیں۔ انہوں نے اسی وقت امرتسر تار دے دیا کہ لڑکا خیریت سے کلکتہ پہنچ گیا ہے۔ میں تین دن خواجہ صاحب کے پاس ٹھہرا اور امرتسر روانہ ہو گیا۔ گھر والوں نے مجھے دیکھا تو سوائے والد صاحب اور بھائیوں کے سبھی مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ والد صاحب نے ان سب کو ڈانٹ دیا۔

”اس آوارہ گرد کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ تم لوگ کیوں روتے ہو۔“

کچھ روز گھر پر میری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اس کے بعد سب مجھ سے بے نیاز ہو گئے۔ میں نے نائیس جماعت میں داخلہ لے لیا۔ امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے تو جنگ ختم ہو گئی۔ بھائی جان کو فوج میں اعزازی کمشن مل گیا اور وہ ریڈیو سیلون کی اردو سروس کے انچارج کے طور پر منتخب ہو کر کولمبو جانے لگے تو انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا کہ یہ رنگون ریڈیو پر کام کر چکا ہے وہاں میرے ساتھ کام کرے گا۔ میں دسویں جماعت پاس کر چکا تھا۔ میں بڑا خوش ہوا کہ ایک بار پھر مجھے سیاحت کا موقع مل رہا تھا۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ کولمبو کی طرف روانہ ہو گیا۔

جاپان پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہاں امریکی اور برٹش آرمی کی ریمینٹیں مقیم تھیں۔ برٹش آرمی کی ریمینٹوں میں پنجاب، بنگال، سرحد اور مدراس وغیرہ سبھی صوبوں کے فوجی جہاں تھے۔ ان لوگوں کی تفریح اور معلومات کے واسطے امریکہ کی

ایک لمحے کے لئے بجلی چمک گئی ہو۔ لڑکی اپنی فیملی کے ساتھ بانس کی چھوٹی سی ٹوکری ہاتھ میں لٹکائے بیڑھیوں والے اس پل کی طرف جا رہی تھی جس طرف سارے مسافر جا رہے تھے اور جو ریلوے لائن کے اوپر سے ہو کر دوسرے پلیٹ فارم کو جاتا تھا۔ میں اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ لڑکی پل کی بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اوپر جا کر اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ مگر اب وہ مجھ سے دور تھی۔ معلوم نہیں وہ میری طرف دیکھ کر مٹ گئی تھی یا نہیں مٹ گئی تھی۔ دوسرے پلیٹ فارم پر سٹیشن کا گیٹ تھا۔ میری نگاہیں برابر اس لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ گیٹ پر ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے کر گیٹ کی طرف بڑھی تو یقین کریں کہ اس نے ایک بار پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ مجھے بھی اس وقت یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد وہ مسافروں کے جھوم میں گم ہو گئی اور اس کا چہرہ اس کا جسم اس کے جوڑے کے مرجھائے ہوئے سفید پھول میری نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے۔ اس وقت میرے دل نے کہا۔

”ٹرین سے اتر آؤ۔ اس لڑکی کے پیچھے پیچھے چل پڑو۔ تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو اس کے بعد تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔ دماغ کو بند کر دو۔ میرے کہنے پر عمل کرو۔ بس چھلانگ لگا دو۔ زندگی کی اصلی خوشبو مسکراتے ہوئے تمہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے گزر گئی ہے۔ سوچتے رہو گے تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ سوچنے سے غور کرنے سے خوشبوؤں کا سراغ نہیں ملا کرتا۔ تمہارے سامنے ایک ان دیکھو جنگل کا دروازہ اچانک کھل گیا ہے۔ ٹرین سے اتر کر اس لڑکی کے پیچھے اس کے مرجھائے ہوئے سفید پھولوں کی خوشبو کے پیچھے چل پڑو۔ اس جنگل میں اگر تمہیں دکھ بھی ملیں گے تو وہ تمہاری اپنی مرضی کے دکھ ہوں گے۔ دوسروں کی مرضی سے خوش رہنے میں بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اپنی مرضی سے اپنی مرضی کے دکھوں میں بھی ایک خوشی ہوتی ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر ڈبے سے نکل آؤ۔ اس کے بعد ساری زندگی تمہیں تریچنپلی کے پلیٹ فارم پر یہ خوشبو کبھی نہیں ملے گی۔“

لیکن میں دل کی آواز بھی سنتا رہا اور اپنے دماغ سے بھی سوچتا رہا۔ دل نے مجھے ایک خوشبوؤں سے مہکتا ہوا جنگل دکھایا تھا۔ دماغ نے مجھے انڈیشوں اور طرح طرح کے خطروں کی ایسی خوفناک تصویریں دکھائیں کہ میں ڈبے میں ہی کھڑکی کے پاس بیٹھا اس گیٹ کو دیکھتا رہا جہاں میری زندگی کے سیاہ بادلوں میں ایک بجلی ایک

پھاڑ آئے تھے۔ راستے میں بارشیں بھی ہوئی تھیں اور ہماری گاڑی جنگل کی بارشوں سے بھی گزری تھی۔ مدراس سے آگے جن سٹیشنوں کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں ان میں تریچنپلی اور مجورا یا مدورائی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ نام بھی اس لئے یاد رہ گئے کہ ان میں ایک میوزک تھا۔ تریچنپلی کا سٹیشن مجھے اس لئے بھی یاد رہ گیا ہے کہ اس سٹیشن پر میں نے ایک ایسی گھرے سانولے رنگ کی لڑکی کو دیکھا تھا جس نے میری طرف بھی مسکرا کر دیکھا تھا۔ ایسا ہوا نہیں کرتا۔ مشرقی لڑکیاں غیر مردوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا نہیں کرتیں۔ مگر یہ لڑکی عجیب تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر ایسے مسکراتی تھی جیسے مجھے پہلے سے جانتی ہو۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ کے جواب میں بالکل نہ مسکرا سکا تھا۔ بس حیرت زدہ سا ہو گیا تھا۔ میں آپ کو سارا سکرین پلے سنا رہا ہوں۔

تریچنپلی کا سٹیشن بہت بڑا تھا۔ جس پلیٹ فارم پر ہماری گاڑی کھڑی ہوئی وہاں سے کئی پلیٹ فارم نظر آتے تھے۔ میں ہمیشہ ٹرین میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سفر کرتا تھا۔ اس طرح مجھے باہر کے جنگل دریا اور پھاڑ دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس وقت بھی میں ڈبے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر پلیٹ فارم پر مسافروں کو ٹرین سے اترتے چڑھتے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے اگلے ڈبے سے ایک مدراسی فیملی نیچے اتری۔ ایک بوڑھی عورت تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا اور ایک لڑکی جس نے ہلکے کاسنی رنگ کی سرخ بارڈر والی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کے جوڑے میں سفید پھول لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں بانس کی چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ ٹرین سے اترنے کے بعد جیسا کہ ہوا کرتا ہے اس نے یونی پیچھے ڈبوں کی طرف دیکھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا یا اس کے بالوں میں لگے ہوئے سفید پھولوں کو دیکھ رہا تھا جو گھبرا تھا اور جس کے پھول ذرا ذرا مرجھائے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گئی ہے۔ اس کے فوراً بعد وہ سامان وغیرہ ایک طرف لگانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ مجھے اچھا لگی تھی۔ یہ اچھا لگنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے ٹرین میں سفر کرتے ہوئے آپ کو کھینوں میں کوئی پھولوں والا درخت نظر آجائے۔ آپ اسے تھوڑی دیر کے لئے دیکھیں اور پھر ٹرین آگے نکل جائے۔ اتنی دیر میں وہ لڑکی اپنی فیملی کے ساتھ پلیٹ فارم پر آگے چل پڑی۔ چند قدم چلنے کے بعد لڑکی نے چلتے چلتے ایک لمحے کے لئے گردن پیچھے موڑ کر میری طرف دیکھا اور ذرا اتنا مسکرائی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دور بادلوں میں

دنوں یہ میدان بہت ویران ویران تھا۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ سمندر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر ٹین کی چھت والا ایک کیمپ بنا ہوا تھا۔ وہاں کالے رنگ کی پہلی اور شرقی آنکھوں والی نرسوں اور ڈاکٹروں نے ہمارا سرسری سا میڈیکل چیک اپ کیا۔ ہمیں انجشن لگائے اور سب مسافروں کو گولیاں کھانے کو دیں اور پھر سب کو ایک ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ دے دیا۔ یہ ایک طرح کا پروانہ راہداری تھا۔ ہم یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دکھا کر سری لنکا کے ملک میں داخل ہو سکتے تھے جس کا نام اس زمانے میں سیلون ہوا کرتا تھا۔ وہاں بھی ہندوستان کی طرح انگریزوں کی حکومت تھی۔ جو کرنسی نوٹ ہندوستان میں چلتے تھے وہی سیلون میں بھی چلتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سیلون میں روپے کا بھان آنے دونوں اور چونیوں کی بجائے سینوں میں ملتا تھا۔ یعنی 25 سینٹ کی ایک چونی ہوتی تھی۔ سو سینٹ کا وہی جارج پنجم اور ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والا روپیہ ملتا تھا۔ ہندوستان سے سری لنکا یعنی سیلون جانے کے لئے صرف اسی ایک طبی سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی تھی۔ کسی ویزا پاسپورٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم واپس آ کر ٹرین میں سوار ہو گئے اور ٹرین منڈاپم کیمپ سے وحش کوڑی کی طرف چل پڑی۔

سارا راستہ دونوں جانب ریت ہی ریت تھی۔ کہیں کہیں کوئی کھیت آ جاتا تھا۔ ناریل کے درختوں کے جھنڈ بھی آ جاتے تھے۔ وحش کوڑی ہندوستان کی جنوبی کنون میں ذرا اوپر کر کے ساحل سمندر پر واقع ہے۔ یہاں ہندوستان کا کنونی ساحل اینڈیکس کی طرح سمندر میں کچھ دور تک چلا گیا ہے۔ اس کے آگے بحر ہند اور خلیج بنگال کے دونوں سمندر آ کر مل جاتے ہیں اور یہاں موجیں بہت ہیجان خیز ہوتی ہیں۔ کنونی ساحل سے سمندر میں دور تک گیا ہوا ساحل پتھریلا ہے۔ یہاں ٹرین بڑی بڑی چٹانوں کے اوپر سے گزرتی ہے۔ یہاں سمندر کے اوپر ایک پل بھی بنا ہوا ہے۔ یہ پل انجینئرنگ کے کمال کا نمونہ ہے۔ جب ٹرین اس پل پر سے گزر رہی تھی تو میں کوڑی میں سے مسلسل نیچے دیکھتا رہا۔ دونوں جانب سے سمندر کی جھاگ اڑاتی موجیں ان چٹانی پتھروں سے دیوانہ وار ٹکرا رہی تھیں جن پر ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی۔ کوئی کوئی سمندری موج ٹرین کے پیلوں سے بھی ٹکرا جاتی تھی۔ یہاں دائیں جانب سمندر میں اونچے اونچے ستون بھی دکھائی دیے۔ یہ ستون ساحل سے شروع ہو کر سمندر میں کچھ دور تک چلے گئے تھے۔ بھائی جان نے بتایا یہ ایڈمیز برج ہے۔ اور

لمحے کے لئے چمک کر بیشہ کے لئے غائب ہو گئی تھی۔ میں گیٹ کی طرف دیکھتا رہا اور انجن نے سٹی دی۔ گارڈ نے سٹی بجائی اور ٹرین ترچناپلی کے پلیٹ فارم سے چل پڑی۔ آج اسی بات کو نہ جانے کتنے برس گزر گئے ہیں۔ مگر ترچناپلی اسٹیشن کے پلیٹ فارم کا وہ حسین منظر اپنی تمام خوشبوؤں اور رنگوں کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس منظر کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اس لڑکی کے جوڑے کے مرجھائے ہوئے سفید پھولوں کی اداس خوشبو آتی ہے۔ اس خوشبو کی اداسی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ کسی وقت خیال آتا ہے کہ میں نے بڑی عقل مندی کی کہ ٹرین سے سے اتر کر اس لڑکی کے پیچھے نہیں گیا۔ اگر حماقت سے کام لے کر ٹرین سے اتر کر اس لڑکی کے پیچھے چل پڑتا تو خواجوا نہ جانے کن مصیبتوں میں پھنس جاتا۔ پھر خیال آتا ہے کہ زندگی اگر دوسروں کی مرضی کی خوشیوں اور خواجوا کی مصیبتوں میں ہی گزرنی تھی تو اس وقت حماقت کر ہی لیتا تو اچھا تھا۔

ترچناپلی کے آگے مدورائی کا شہر آیا۔ یہ بھی کافی بڑا اسٹیشن تھا۔ ٹرین بڑے بڑے کارخانوں کے قریب سے گزری تھی۔ مدورائی کے آگے ٹرین جنوبی ہند کی کنون کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ اب دونوں طرف کا سمندر قریب ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں کوئی جنگل وغیرہ نہیں تھا۔ زمین ریتیلی تھی۔ جیسے ساحل سمندر پر ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ناریلوں اور تارڑی کے درختوں کے جھنڈ نظر آ جاتے تھے۔ کوئی بڑا قصبہ وغیرہ گزرتا تو تھوڑا سبزہ نظر آ جاتا موسم بھی گرم ہو گیا تھا۔

ٹرین منڈاپم کے ایک ویران سے اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ کولمبو جانے والے مسافر ٹرین سے اتر آئے۔ بھائی جان نے بتایا یہاں ایک کیمپ ہے۔ وہاں ہمیں ٹیکے لگائے جائیں گے اور میڈیکل چیک اپ ہو گا۔ اب یاد آیا اس اسٹیشن کا نام منڈاپم کیمپ تھا۔ کچھ برس گزرے سری لنکا میں تامل ناٹیکرز چھاپہ ماروں کی تحریک سرگرمیاں کافی تیز ہو گئی تھیں جس کے جواب میں سری لنکا کی فوج نے جوالب کارروائی کر کے لنکا کے شمالی علاقے جافنا وغیرہ میں باغی تاملوں کی گرفتاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس زمانے میں سری لنکا سے بے شمار تامل لوگ بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے۔ ہندوستان کی حکومت نے ان کے واسطے ایک مہاجر کیمپ بنا دیا تھا۔ یہ کیمپ منڈاپم کیمپ نامی اسٹیشن کے قریب ہی بنایا گیا تھا۔ ایک مدت بعد میں نے اخباروں میں منڈاپم کیمپ کا نام پڑھا تو مجھے وہ ویران اسٹیشن اور ریتلا میدان یاد آ گیا۔ ان

کے کھوکھے کی جانب سے رتن فلم کے گانوں کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ دھن کوڑی کے شیش کی روشنیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جہاز کی دونوں سیڑھیاں ہٹا دی گئیں۔ جہاز کے انجن شارٹ ہو گئے تھے۔ ان کی تھر تھراہٹ ڈیک کے کڑی کے فرش پر صاف محسوس ہو رہی تھی۔ پھر جہاز نے تین چار مرتبہ دسل دیا اور آہستہ آہستہ ساحل سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کے ساحل کی روشنیاں دور ہونے لگیں۔ میں بھائی جان کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ان کے ہاتھ میں بڑا کاک تھا اور پیچھے ہٹتی ہوئی ساحل کی روشنیاں دیکھ رہے تھے کہنے لگے۔

”جب ہندوستان کی روشنیاں غائب ہو جائیں گی تو دوسری طرف سے لنکا سیلون کے ساحل کی روشنیاں نظر آنا شروع ہو جائیں گی۔ بس ہندوستان اور لنکا سیلون کے درمیان سمندر کا اتنا ہی فاصلہ ہے۔“

میں ہندوستان کے ساحل کی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ یہ روشنیاں دور ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو میں ڈیک کی دوسری طرف آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد لنکا کے ساحل کی روشنیاں ابھرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہ روشنیاں قریب ہو رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا ہو گیا تھا۔ نیچے سمندر کی طرف دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔ میں جنگل سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا۔ رنگوں جاتے ہوئے جہاز میں بڑی زبردست رونگ ہوتی تھی مگر یہاں جہاز تھوڑا تھوڑا آگے پیچھے اور دائیں بائیں ڈولتے ہوئے اپنی منزل کی طرف سمندر میں رواں تھا۔ آخر ہمارا جہاز لنکا کے ساحل کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ یہ اس زمانے میں چھوٹی سی بندرگاہ تھی۔ اس کا نام ٹالی مینار تھا۔ اب یہ علاقے تامل باغیوں کی تخریبی سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔ اس زمانے میں ایسی کوئی بک نہیں تھی۔ بڑا پرسکون زمانہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم نے تھوڑی بل چل چائی تھی لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد حالات پھر معمول پر آ گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ عظیم آنے والی پریشانیوں اور ہلاکت خیزیوں اور خونیں انقلاب کے بیچ بول گئی تھی۔

ٹالی مینار کی بندرگاہ کی چھوٹی سی گودی کی ایک جانب سبز رنگ کی ٹرین کھڑی تھی۔ ہمیں اور دوسرے مسافروں کو اس ٹرین میں سوار ہو کر کولمبو جانا تھا۔ ہمارے ٹکٹ اور میڈیکل سرٹیفکیٹ جہاز کھڑا ہونے کے ساتھ ہی چیک کر لئے گئے تھے۔ لنکا کی کسم کا عملہ سرسری چیکنگ کے لئے جہاز پر آ گیا تھا یہ ڈیوٹی انہوں نے جہاز میں

اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پل راون سے بھی پہلے زمانے کا ہے۔ سمندری چٹانوں کے پل پر سے گزرنے کے بعد ٹرین دھن کوڑی کے درختوں اور سبزے میں گھرے ہوئے چھوٹے سے شیش پر جا کھڑی ہوئی۔ ہم ٹرین سے اتر کر شیش کے جنگل سے باہر نکلے تو سامنے سمندر ہی سمندر تھا۔ دائیں طرف بھی سمندر سامنے بھی سمندر اور بائیں طرف بھی سمندر تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور بڑی تیزی سے شام ہو رہی تھی۔ سمندر میں ایک جگہ بحری جہاز لنگر انداز تھا۔ اس میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ایک طرف جھوپڑی میں چائے کی دکان تھی جہاں سے ریکارڈنگ کی آواز آرہی تھی۔ اس زمانے میں میوزک ڈائریکٹر نوشاد صاحب کی فلم ”رتن“ کا بڑا چرچا تھا۔ فلم رتن کے گانے ”ساون کے بادلو۔ ان سے یہ جا کو“ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ 1945ء یا 1946ء کا زمانہ تھا۔

میں بھائی جان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ فوجی وردی میں تھے اور ان کے اردلی نے مختصر سامان اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے سمندر میں کھڑے جہاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہم اس جہاز میں سوار ہو کر سیلون پہنچ جائیں گے۔“

بھائی جان کریون اے کے سگریٹ پیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ یہی اگلی کوالٹی کا سگریٹ پی رہے تھے۔ میں گولڈ فلیک پیا کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہوئی۔ سگریٹ میں نے چھٹی ساتویں جماعت سے ہی پینے شروع کر دیئے تھے۔ بھائی جان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مجھے کریون اے کے اعلیٰ تمباکو خوشبو بڑی رومانٹک لگ رہی تھی۔ جہاز گودی کے بالکل ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ دونوں جانب سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ مسافر سامان وغیرہ کے ساتھ جہاز پر سوار رہے تھے۔ ہم بھی سوار ہو گئے۔ بھائی جان کا سیکنڈ کلاس کا کیمین تھا۔ ہم ڈیک پر گئے۔ یہاں بانس کی سبز رنگ کی بہت سی آرام کرسیاں بچھی تھیں۔ پہلے سے مسافر بیٹھے سگریٹ اور بیروز وغیرہ پی رہے تھے۔ بھائی جان بھی ایک آرام کرسی پر بیٹھے گئے۔ میں ڈیک کے جنگل کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔ اب تک سمندر ہی سمندر تھا جو شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دھندلا ہو رہا تھا۔ گودی کی طرف آ گیا۔ ادھر ساحل پر کہیں کہیں بجلی کے بلب جل رہے تھے۔

بھی ادا کر دی تھی۔ کولبو کو جانے والی گاڑی کی ایک جانب انجن سے لے کر پچھلے ڈبے تک لمبا کوریڈور بنا ہوا تھا۔ بھائی جان نے بتایا کہ یہ ساری رات اور اگلے آدھے دن کا سفر ہے۔ گاڑی اگلے دن دوپہر کے وقت کولبو پہنچے گی۔ میں بہت خوش تھا۔ کیونکہ بھائی جان نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ ٹرین سیلون کے انتہائی متحجان جنگلوں اور پہاڑی سلسلے میں سے گزرے گی۔ ٹرین ٹالی مینار سے چلی تو بارش شروع ہو گئی۔ یہ کارڈور کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر بارش کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ سیلون کی بارش تھی۔ سری لنکا کی بارش تھی۔ اس بارش میں قدرتی جنگلوں کی خوشبوئیں تھیں۔ یہ خوشبوئیں پہاڑیوں، گھاٹیوں اور جنگلوں سے دور دور سے میرے پاس آرہی تھیں۔ مجھ سے ملنے آرہی تھیں۔ بارش کی پھوار میرے چہرے پر پڑتی تو میں آنکھیں بند کر لیتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں خوشبوؤں کے سمندر میں اتر رہا ہوں۔

ساری رات ٹرین لنکا کے جنگلوں میں سے گزرتی رہی۔ دریا بھی آئے۔ میدان بھی آئے۔ کبھی درخت شور مچاتے ٹرین کے قریب سے ہو کر پیچھے کو نکل جاتے۔ کبھی کسی پل کی گزرگاہٹ سنائی دینے لگتی۔ میں اندھیرے میں آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتا۔ یاد نہیں کہ اس رات میں سویا بھی تھا یا نہیں۔ صبح کے وقت ٹرین ایک چھوٹے سے سٹیشن پر رکی۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ پلیٹ فارم بھیگا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کے اوپر کوئی چھت نہیں تھی۔ سامنے جنگل کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے درخت تھے جن کی شاخیں سرخ پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ایک سیلونی لڑکی اناس بیچ رہی تھی۔ وہ ہر ڈبے کی کھڑکی کے پاس جاتی۔ وہ میری کھڑکی کے پاس بھی آئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی بانس کی ٹوکری تھی۔ ٹوکری میں کیلے کے سبز پتوں پر سنہری رنگ کے اناس کے قتلے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔

”پائین اپیل سرا! ویری سویٹ سرا! فائیو سینٹ سرا!“

اس لڑکی کا بارش کی پھوار میں بھیگتا چہرہ اور اس کا یہ جملہ آج بھی مجھے پلے دن کی طرح یاد ہے۔ ٹرین چل پڑی اور اناس بیچنے والی معصوم لڑکی آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہونے لگی۔ میں اسے ٹرین کی کھڑکی میں سے دیکھتا رہا اور اناس کی خوشبو مجھ سے دور ہوتی گئی اور پھر ایک اور بارش کی پھوار میں بھیگتا معصوم لمحہ اپنی یاد میرے

پاس چھوڑ کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

زندگی کی ٹرین چلتی چلی جا رہی ہے۔ کوئی سٹیشن آتا ہے۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہے۔ اجنبی چہرے کچھ دیر کے لئے سامنے آتے ہیں۔ کچھ پھول کچھ رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ٹرین چل پڑتی ہے اور یہ سب کچھ پھر کبھی دکھائی نہ دینے کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ٹرین دوسرے دن دوپہر کے بعد کولبو پہنچی۔

اور غیر فلمی اردو پنجابی کے گانے نشر کئے جاتے تھے۔ ریڈیو سی ایک سیلون خالص فوجی ریڈیو سٹیشن تھا اور امریکی انتظامیہ کے ماتحت تھا۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اس کے دو سٹیشن تھے۔ ایک اردو سٹیشن تھا اور ایک امریکی سٹیشن تھا۔ امریکی سٹیشن سے اتحادی فوجوں کے برطانوی، اطالوی، آسٹریلوی اور امریکی فوجیوں کے لئے گانے وغیرہ کے پروگرام نشر ہوتے تھے۔ انگریزی میوزیکل پروگرام کا انچارج ایک امریکی موسیقار دکن پل تھا۔ نوجوان لڑکا تھا۔ انگریزی گانے نشر کرتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ ڈانس بھی کرتا رہتا تھا۔ چونکہ یہ فوجی ریڈیو سٹیشن تھا اس وجہ سے ہماری ایک فوجی کنٹینر بھی تھی جس کو ثانی کہتے تھے۔ یہ N.A.F.I. کا مخفف تھا۔ یہاں سے ہر پندرہ دن کے بعد ہمیں راشن میں دنیا بھر کی چیزیں بے حد سستے نرخوں پر مل جاتی تھیں۔ بھائی جان برمن اور انگلش پیئر کے ڈبوں کے بھرے ہوئے کریٹ اٹھوا کر لے آتے تھے۔ انہیں صرف بیڑ کا شوق تھا۔ مجھے اعلیٰ سگرٹوں کا شوق تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ فوجی کنٹینر سے مجھے گولڈ فلیک کا تازہ بتازہ ٹن مل جاتا تھا جو ایئر ٹائیٹ ہوتا تھا اور جس کو کھول کر سب سے پہلی جو خوشبو آتی تھی وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اب ہمیں سگرٹوں میں گھاس بھر کر پلائی جا رہی ہے۔ ان ہی دنوں ثانی کی کنٹینر پر ایک نیا سگریٹ آیا جس کا نام سینئر سروس تھا۔ بیس سگرٹوں کی سفید رنگ کی چوڑی ڈبی تھی۔ اوپر نیلے رنگوں میں بادبانی جہاز کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ بائی گاڈ! کیا سگریٹ تھا۔ ریڈیو سیلون ایک دو منزلہ کوٹھی میں بنایا گیا تھا۔ یہ کوٹھی کولبو کارپوریشن کی گراؤنڈ کے سامنے سرخ پھولوں والے درختوں کی سڑک پر واقع تھی۔ یہاں سے ڈیڑھ گز دور تھی۔ ریڈیو سٹیشن کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں ملٹری ٹرانسپورٹ انچارج مسٹر کانگری بیٹھتا تھا۔ جس کو ہم لوگ مسٹر کانگریڈ کہا کرتے تھے۔ امریکی اور اردو سروس کے شاف کے آنے جانے کے واسطے ٹرانسپورٹ کا وہی انتظام کرتا تھا۔ کوٹھی ساری لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ میزیاں چڑھ کر برآمدہ تھا جہاں ڈیوٹی آفیسر بیٹھتی تھی جو ایک ادھیڑ عمر کی مدراسی عورت تھی۔ ہماری اردو سروس دوسری منزل پر تھی۔ ریڈیو کے سٹوڈیوز پہلی منزل پر تھے۔ اردو شاف میں صوبیدار میجر گلستان خان، لیفٹیننٹ صدیقی، حوالدار پیارا سنگھ اور ایک ہندو حوالدار تھا جس کا میں نام اس وقت بھول گیا ہوں۔ اردو سروس کی ٹرانسپورٹ صبح نو بجے شروع ہوتی تھی اور گیارہ بجے تک جاری رہتی تھی۔ اس

کولبو نام کا لٹکا میں کوئی ریلوے سٹیشن نہیں ہے۔ کولبو شہر کے بہمنی کی طرح دو ریلوے سٹیشن ہیں۔ ایک کا نام مرادانہ ہے دوسرے کا نام فورٹ ہے۔ ہماری ٹرین کولبو کے مرادانہ سٹیشن پر رکی تھی۔ بہت وسیع و عریض سٹیشن تھا۔ ریڈیو سی ایک سیلون کے دو آدمی گاڑی لے کر بھائی جان کو لینے آئے ہوئے تھے۔ ہم ریڈیو کی سٹیشن دیگن میں بیٹھ کر مشہور شاعر ن م راشد کے فلیٹ پر آگئے۔ ن م راشد ان دنوں ریڈیو سی ایک سیلون کی اردو سروس کے انچارج تھے۔ وہ اپنی مدت پوری کر کے واپس دلی جا رہے تھے۔ ان کی جگہ بھائی جان نے بطور انچارج اپنی ڈیوٹی سنبھالی تھی۔ راشد صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”سناؤ پہلوان! کیسہ حال اے؟“

یہ جملہ راشد صاحب نے مجھے اس وقت بھی کہا تھا جب ہم بھائی جان کے ساتھ رنگون جاتے ہوئے ان کی دلی میں علی پور روڈ والی کوٹھی میں ٹھہرے تھے۔ میری عمر چھوٹی تھی مگر صحت بڑی اچھی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میرے والد صاحب پہلوان تھے اور مجھے پہلوان بنانے اور میری کشتی کیکر سنگھ کے بیٹے سے کرانے کے لئے مجھے خوب کھلایا پلایا کرتے تھے۔

راشد صاحب نے ہمارے لئے کولبو کے علاقے بوریلہ جنکشن کی ایک کوٹھی کے آدھے پورشن کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ دو دن بعد راشد صاحب دلی واپس چلے گئے اور بھائی جان نے ریڈیو سی ایک سیلون کی اردو سروس کا چارج سنبھال لیا۔ ان دنوں میں ادیب وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کچھ لکھتا تھا تو محبت بھرے خط یا کبھی ڈائری لکھ لیا کرتا تھا مگر انگریزی اور اردو ادب سے بہت لگاؤ تھا اور کرسن چندر، بیدی، منو اور اختر حسین رائے پوری کے افسانے بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ بھائی جان نے مجھے پندرہ منٹ کا ایک پروگرام دے دیا۔ اس پروگرام کا نام گیت مالا تھا۔ اس میں جاپان اور فلپائن وغیرہ میں مقیم برٹش آرمی کی انڈین پلٹنوں کے لئے فلمی

لینی تھی۔ اس کے بیٹے بھی بڑے ہوشیار تھے۔ صاف مکر جاتے اور سمجھتے۔ مہی! تم نے رات ہمیں کچھ بھی نہیں دیا۔۔۔۔۔ اور مسز جوز ان کے کان مروڑنے لگتی۔

”نکالو میرے سارے پیسے۔“

جس کچی سڑک پر یہ کوٹھی تھی وہ آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ اس میں دو رویہ ناریل کے اونچی اونچی چھتریوں والے درخت تھے اور آنے والے چار پانچ ہی پرانی طرز کی کوٹھیاں تھیں۔ سامنے والی کوٹھی میں مسز جوز کے رشتے دار رہتے تھے۔ یہ نہیں وہ کیا کاروبار کرتے تھے زرد چروں والے پتے وبلے مرد اور عورتیں تھیں۔ ان میں ایک مرد کی ایک آنکھ پتھر کی تھی وہ ایک پتلی سی لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر شام کے وقت کوٹھی کے آگے ٹھلا کرتا تھا۔

گریموں کا موسم آتے ہی کولبو میں موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلی رات کو زبردست بارش ہوئی۔ میں جس کمرے میں سوتا تھا اس کی کھڑکیاں لان کی طرف کھلتی تھیں۔ رات کو بارش کی آواز کے ساتھ دھپ دھپ کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ میں بارش کی وجہ سے جاگ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آوازیں کس چیز کی ہیں۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو لان میں جگہ جگہ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ ناریل بکھرے ہوئے تھے۔ رات کو تیز ہوا اور بارش میں درختوں پر سے ناریل نوٹ کر گرتے رہے تھے۔ کولبو کی ساری سڑکیں بے حد کچی تھیں اور اس طرح بنائی گئی تھیں کہ چاہے جتنی بارش ہو پانی ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھہرتا تھا۔

گال روڈ، کولبو کی مال روڈ تھی۔ یہ بہت کشادہ سڑک تھی اور بڑی لمبی تھی۔ اس کی ایک جانب جدید عمارتیں اور سنور زون وغیرہ تھے اور دوسری طرف سمندر کا ساحل سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ سمندر اور سڑک کے درمیان کانٹا نما کوٹھیاں تھیں۔ ہر تین چار کوٹھیوں کے بعد ایک چھوٹی سی سڑک نکل کر دور سمندر تک چلی گئی تھی۔ کافی آگے جا کر کولبو کا تقریبی ساحل سمندر یعنی بیچ تھا۔ یہ ساحل سمندر بے حد خوبصورت تھا اور خم کھاتا ہوا چلا گیا تھا۔ سمندر کی لہریں دور دور سے آ کر ساحل کی ریت کو چوم کر واپس چلی جاتیں۔ غیر ملکی عورتیں بیدنگ ہوٹ اپنے میاں مردوں اور بچوں کے ساتھ تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساحل سے کافی پہلے ہٹ کا ناریل کے درختوں کا ذخیرہ شروع ہو جاتا تھا۔ ان درختوں کے نیچے کولبو کے زورور لوگ اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ ناریل کی رسیاں کر گھوں پر بنا کرتے

دوران فوجی بھائیوں کے لئے فلمی غیر فلمی گیت بھی نشر ہوتے تھے۔ پراپیگنڈا تقریر بھی ہوتی تھیں خبریں بھی ہوتی تھیں اور پنجابی کے گانے بھی سنائے جاتے تھے۔ ہر ریڈیو کی فوجی گاڑی صبح ساڑھے آٹھ بجے آکر لے جاتی تھی۔ گیارہ بجے کے بعد واپس آ جاتا تھا اور پھر کولبو شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے نکل جاتا۔

جس کوٹھی کے آدھے پورشن میں ہم رہتے تھے وہ ایک ولندیزی ڈاکٹر پینین مسز جوز کی ملکیت تھی۔ مسز جوز سیلون کی چائے کمپنی میں مینجر تھے۔ یہ کم گو شر میلے اور بیوی سے دب کر رہنے والے آدمی تھے۔ ان کی بیوی مسز جوز منہ زور دلیر اور باتونی عورت تھی۔ دل کی بڑی نرم تھی مگر زبان کی سخت تم انگریزی، سنہالی اور ڈچ تینوں زبانیں فر فری لیتی تھی۔ ویسے وہ ہر ایک سے اس علاقہ کی شکستہ اردو یا ہندوستانی میں بات کرتی تھی۔ لبا فراک پہنے دن بھر ننگے پاؤں کو کے کمروں میں چلتی پھرتی رہتی۔ سگریٹ ہر وقت اس کی انگلیوں میں سگ رہا ہوتا اور ہونٹوں کے اوپر پیوند بھی آیا ہوتا تھا۔ بھاری بدن کی تھی اور مجھ سے منہ بات کرتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسے ٹھٹھی کنٹین میں سے پورٹ وائر دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے میرے ہاتھ میں سینئر سروس سگریٹ کا پیکٹ دیکھ خوشی سے اچھل پڑی۔

”مسٹر حامید! یہ سگریٹ تم نے کہاں سے خریدے ہیں۔ یہ تو میرا فیور برانڈ ہوا کرتا تھا۔“

جب میں نے اسے بتایا کہ یہ سگریٹ ہماری کنٹین میں آئے ہوئے ہیں تو میری خوشامدیں کرنے لگی۔ مجھے وہ عورت اچھی لگتی تھی۔ میں نے دوسرے اسے سگریٹ کے چار پیکٹ لا کر دیئے اور کہا۔

”مسز جوز! یہ میری طرف سے پریزنٹ ہے۔“

اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اس کے تین بیٹے تھے جن کی عمریں دس گے سال کے اندر اندر تھیں۔ ایک کا نام ڈیوڈ تھا۔ ایک کا نام ایلن تھا۔ تیسرے لڑکا نام یاد نہیں رہا۔ وہ کوٹھی کے صحن میں ناریل کے درختوں پر بندروں کی طرح؟ کر ناریل توڑا کرتے تھے۔ شام کے وقت مسز جوز پورٹ وائر کے دو گلاس پینے بعد بڑے خوشگوار موڈ میں آ جاتی اور اپنے بچوں کو بنوے سے پیسے نکال نکال دیتی۔ دوسرے دن جب نشہ اتر جاتا تھا تو اپنے بیٹوں سے ایک ایک پیسہ واپس

تھے۔ یہاں کولہو کی مشہور کلب ماہٹ لیونا کلب تھی۔ اس دو منزلہ کلب کے پئے ایک جانب سمندر کی جانب ماؤنٹ لیونیائی ہاؤس بھی تھا۔ یہاں میں اور لیفٹیننٹ صدیقی صاحب کبھی کبھی پینے آیا کرتے تھے۔ یہاں سیلون کی اعلیٰ کوالٹی کی چائے ملتی تھی۔ ماؤنٹ لیونیائی ہاؤس میں بڑی خاموشی ہوتی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے پیچھے دور تک کولہو کا گہرا سبز سمندر نظر آتا تھا۔ سفید درویوں والے سنہالی بھرے بڑی خاموشی سے چائے کا سامان میز پر رکھ کر چلے جاتے تھے۔ لیفٹیننٹ صدیقی صاحب کو چائے پینے سے زیادہ چائے بنانے کا شوق تھا۔ انتہائی نفاست پسند جوان تھے۔ میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ انگریزی اور اردو ادب کے مطالعے نے ان کے مزاج میں پرسکون گہرائی اور متانت پیدا کر دی تھی۔ کبھی فالتو بات نہیں کرتے تھے۔ پائپ پیتے تھے اور آہستہ آہستہ پائپ پیتے ہوئے ان کے چہرے پر ذہانت ابھر آتی تھی۔ شراب وغیرہ بالکل نہیں پیتے تھے۔ جوانی کی عمر میں ہی نہایت شائستہ اور کم گو انسان تھے۔ مجھے ان کی طبیعت بہت اچھی لگتی تھی اور میری ان سے خوب دوستی ہو گئی تھی۔ قیام پاکستان کے چھ سات سال بعد ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ دوبارہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میری دعا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنے اہل و عیال کے ساتھ خیریت سے ہوں۔ حسن اتفاق سے ریڈیو سیلون کے دنوں کی یادگار ایک تصویر یعنی فوڈ میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہ تصویر ریڈیو سیلون کے سٹوڈیو میں اتاری گئی تھی۔ اس میں اردو سروس کا سارا عملہ موجود ہے۔ میں بھی ہوں اور صدیقی صاحب اور بھائی جان بھی اپنی فوجی وردیوں میں موجود ہیں۔ صدیقی صاحب ٹرن نیبل پر بیٹھے ریکارڈ لگاتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ تصویر میں نے اپنی میز کے شیشے کے نیچے لگا رکھی ہے۔ اس پر آتے جاتے جب بھی نظر پڑتی ہے تو کولہو میں گزارے ہوئے ان خوبصورت دنوں کے ساتھ صدیقی صاحب بھی بہت یاد آتے ہیں۔

ہم بوریلہ جکشن میں رہتے تھے۔ یہاں قریب ہی ایک بودھ خانقاہ تھی۔ میں یہاں سے گزرتا تو خانقاہ میں سے عورتوں اور مردوں کے سنہالی زبان میں یا قدیم بودھ زبان میں اشلوک پڑھنے کی آوازیں اور لوہان اور اگریتوں کی خوشبوئیں آتیں۔ آگے چوک تھا۔ یہاں سے ایک ٹرام کار ٹپل روڈ پر سے ہوتی ہوئی آئے لائٹ ہاؤس والے علاقے کی طرف نکل جاتی تھی۔ میں یونہی سیر کرنے کے لیے ٹرام کار پر بیٹھ کر اگلے چوک تک جاتا اور وہاں سے دوسری ٹرام میں واپس آ جاتا تھا۔

ایک روز موسم ابر آلود تھا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ خوشگوار ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں چوک میں آکر ٹپل روڈ کو جانے والی ٹرام کار میں سوار ہو گیا۔ ٹپل روڈ پر کافی ٹریفک رہتا تھا اس لیے یہاں ٹرام کار آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ زیادہ کشادہ سڑک بھی نہیں تھی۔ آس پاس کے مکانوں کے صحن اور برآمدے صاف نظر آتے تھے۔ ٹرام کار آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ میں مکانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک مکان کے صحن میں مجھے فیروزی ساڑھی والی ایک لڑکی استوائی پھولوں کے پودوں کے پاس کھڑی دکھائی دی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ لڑکی کے لمبے بال اس کے شانوں پر کھلے تھے۔ لڑکی بھی ٹرام کار کو گزرتے دیکھنے لگی۔ جب میری اور اس کی نظریں چار ہوئیں تو لڑکی نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے وہ مجھے جانتی ہو۔

میں یہی سمجھا کہ ٹرام کار میں اس کا ضرور کوئی جاننے والا رشتہ دار وغیرہ بیٹھا ہو گا۔ اس نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک لڑکی جو مجھے بالکل نہیں جانتی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلائے۔ میں نے دائیں طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ میری دائیں جانب کی ساری سٹینیں خالی تھیں۔ تو کیا اس لڑکی نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا، مگر یہ کیسے ممکن ہے؟

میں اگلے سٹاپ پر جا کر ٹرام سے اتر گیا۔ پیچھے سے دوسری ٹرام کار آ رہی تھی۔ میں اس میں بیٹھ کر واپس چل پڑا۔ اب میں خاص طور پر اس مکان کو دیکھنے کی خاطر دائیں طرف والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جب ٹرام کار اس مکان کے سامنے سے گزری تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکی اسی طرح صحن میں کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال آبشار کی طرح اس کے شانوں پر گرے ہوئے تھے۔ ٹرام کار سامنے سے گزرتی ہوئی مجھے دیکھ کر وہ لڑکی مسکرائی اور اسی طرح ہاتھ ہلایا جیسے مجھے الوداعی سلام کر رہی تھی۔ چونکہ وہاں ٹرام کار کی سپیڈ زیادہ نہیں تھی اس لیے میں نے لڑکی کے چہرے کو بھی اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ گہرا سانولا رنگ تھا۔ ناک ذرا اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ جو ہاتھ اوپر اٹھا کر وہ ہلا رہی تھی اس میں سونے کی ایک سنہری چوڑی تھی۔ ٹرام کار سے اس لڑکی کے مکان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ مجھے صاف طور پر نظر آئی تھی۔ اب میرے جذبات میں ایک خوشگوار سی ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ چوک میں آ کر میں نے ٹرام بدلی اور ایک بار پھر ٹپل روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔

را سا سر باہر نکالے مجھے آتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال آگے کو لٹک رہے تھے۔ قریب گیا تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں محبت کے معاملے میں شروع سے ہی اور ہتھ چھٹ تھا۔ آگاہی کچھ نہیں سوچتا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ لڑکی کے باپ ماں یا بھائی نے دروازہ کھول دیا تو میں کہوں گا۔ ایک جنون سا مجھ پر طاری تھا۔ میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ محبت کا ہر نایاب اسی قسم کی حماقتوں اور جنون خیزیوں سے ہاتھ آتا ہے۔ یہاں جو لوگ اسے کام لیتے ہیں ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا اور وہ ساری زندگی اندھروں میں نہ رہتے ہیں۔ دوسری بار دستک دینے پر اسی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ بال لے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی طرف سے مجھے ایسی خوشبو آئی جیسے بہار کی ت کے پچھلے پہر ہوا گلاب اور موتیے کے پھولوں کی جھاڑیوں میں سے گزر کر ان طرف آ رہی ہو۔ اس لڑکی کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے کے چہرے کے افق پر آخری تاریخوں کا سرخ چاند طلوع ہو رہا ہو۔

وہ مسکرا کر دروازے سے پیچھے ہٹ گئی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر لے گیا۔ اس بے دھڑک بلاوے پر میں ذرا ٹھٹھک گیا۔ دماغ نے کہا۔ اندر مت جانا۔ لے جاؤ گے۔ میں نے اپنے دماغ سے کہا تم بچ میں نہ آؤ اور بے دھڑک مکان داخل ہو گیا۔

جب ٹرام اس کے مکان کے سامنے سے گزری تو میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس لڑکی کے مکان کے صحن کو دیکھ رہا تھا مگر صحن خالی تھا۔ لڑکی وہاں پر نہیں تھی۔ یقین کریں میں نے ٹرام کار میں ٹپل روڈ کے کئی چکر لگائے لیکن اس لڑکی کی شکل دوبارہ نظر نہ آئی۔ صحن ایسے خالی پڑا تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہ رہا ہو۔ یہ لڑکی میرے اندر ایک الجھل سی چمک کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اتنی دیر میں بارش شروع ہو گئی اور میں کوٹھی واپس آ گیا۔

رات کو دیر تک اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا کہ اس لڑکی نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ کیوں ہلایا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر کیوں مسکرائی تھی؟ ایسا رومانی حادثہ پہلے میرے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرا اور اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا کہ اس مجھے دیکھا نہ ہو اور یونہی ٹرام کار کو جاتے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا ہو۔ ٹرام کار اس کے مکان کی دیوار کے بالکل قریب سے ہو کر گزرتی تھی۔ درمیان میں صرف فٹ پاتھ ہی تھا۔ اس نے باقاعدہ مجھے دیکھا تھا اور میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ مجھے اس کے جوڑے میں لگے ہوئے سفید پھول صاف نظر آئے تھے کہ وہ مرجھائے ہوئے ہیں۔ صرف ایک بار ہی نہیں دوسری بار بھی لڑکی میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی اور اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہا تھا۔

قدرتی بات ہے کہ میں دوسرے روز بھی ٹھیک اسی وقت ٹرام کار میں بیٹھ کر اس پر اسرار لڑکی کے مکان کے قریب سے گزرا۔ اس وقت وہ لڑکی صحن میں نہیں تھی۔ صحن بالکل خالی پڑا تھا ایسے جیسے اس مکان میں کوئی نہ رہتا ہو۔ گھر کا کوئی دوسرا فرد بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں ٹرام میں بیٹھا لائیٹ ہاؤس والے چوک تک گیا۔ وہاں سے دوسری ٹرام پکڑ کے ٹپل روڈ سے واپس گزرا تو لڑکی کو صحن کے فٹ پاتھ والے دروازے کے قریب کھڑے دیکھا۔ وہ دروازے کا ایک پت کھولے باہر دیکھ رہی تھی۔ ٹرام کو آتے دیکھ کر اس نے چہرہ ٹرام کی طرف اٹھایا۔ میں ٹرام کی اسی سائڈ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اب میرا اور لڑکی کا فاصلہ کم ہو گیا تھا۔ جیسے ہی ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں، لڑکی نے مسکرا کر ہاتھ سے ایسا اشارہ کیا جیسے مجھے بلا رہی ہو۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت ٹرام سے چھلانگ لگا دوں۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روکا۔ ٹرام اگلے سٹاپ پر کھڑی ہوئی تو میں جلدی سے نیچے اتر کر فٹ پاتھ پر لڑکی کے مکان کی طرف چلے لگا۔ لڑکی ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ

والا تھا کہ لڑکی نے کہا۔

”تم میرے بارے میں جو سوچ رہے ہو میں ایسی عورت نہیں ہوں۔“
میں حیران ہو کر اس کا منہ ٹکنے لگا۔ اس نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟“

وہ مجھے مسلسل دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”جب سے تم مجھ سے جدا ہوئے ہو میں اکیلی ہوں۔“

عجیب پر اسرار سا جملہ تھا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔ میں نے کہا۔

”میں تم سے کب جدا ہوا تھا۔ ہم تو آج زندگی میں پہلی بار مل رہے ہیں۔“

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اٹھ کر کارنس کے پاس گئی۔
راون کے مجسمے کے آگے جو لوہان اور اگر بتیاں سلگ رہی تھیں ان کے اوپر دونوں ہاتھ رکھے پھر ان ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرا اور پلٹ کر مجھے ٹکنے لگی۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی تھی۔ اس نے کہا۔
”تم مسلمان ہو ناں؟“

”ہاں میں مسلمان ہوں اور تم راون کی پوجا کرتی ہو؟“

”راون ہمارے دلش کا ہیرو تھا۔ اس سے پہلے جب میں سرنگا پنم میں پیدا ہوئی تھی تو پنپتی کی پجارت تھی۔ اس وقت تم بھی میرے ساتھ ہوا کرتے تھے۔“

مجھے اس عورت پر اب ایک اور شک پڑا۔ ضرور کوئی ذہنی طور معذور عورت تھی۔ ورنہ کوئی صحیح الدماغ عورت ایک غیر مرد کو اس بے باکی سے اپنے خالی گھر میں بلا سکتی جس طرح اس نے اشارہ بازی سے مجھے اپنے گھر میں بلایا تھا۔
میں نے سوچا کہ یہ عورت تو پاگل ہے مگر اس کے گھر والے پاگل نہیں ہوں گے۔ اگر وہ اوپر سے آگئے تو میری خیر نہیں ہے۔ میں جس دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے اس کے گھر میں کھس آیا تھا اب وہ دلیری مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔“

مکان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی چیز جس پر میری نظر پڑی وہ چھوٹے سے صحن کی دیوار کے ساتھ کیلے کے درخت تھے۔ ان کے آگے سفید اور نیلے رنگوں کے استوائی پھولوں والی کیاری تھی۔ لکڑی کے چوکور ستونوں والا دروازہ خالی تھا۔ دروازہ اونچا تھا۔ اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ میں وہاں جا کر رک گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی میرے پیچھے بڑے سکون سے قدم اٹھاتی آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا۔ وہ میرے قریب سے گزر کر آمدے میں آئی اور سامنے والے کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھول کر مجھے اشارے سے بلایا۔ اس وقت میں کچھ گھبرایا لیکن نوجوانی کے جذبات جوش میں تھے۔ میں کسی سنگین خطرے کی پروا کئے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے لوہان اور اگر بتیوں کی ملی جلی خوشبو نے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ کمرے کی فضا میں اندھیرا اندھیرا تھا۔ لڑکی اندر آگئی اس نے دروازہ بند کر لیا اور بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرے میں دیوار سے لگا ہوا دم سا بجلی کا بلب روشن ہو گیا۔

یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی ڈھلوان چھت کے اندرونی شہتیر پر تھی۔ فرش پرانی درزی سے ڈھکا ہوا تھا۔ بانس کا سبز رنگ کا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ کارنس پر دس سروں والے راون کا بت رکھا ہوا تھا جس کے آگے کانسی کی تھالی میں سفید اور نیلے پھولوں کے درمیان لوہان اور اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ کمرے کی فضا ان کی خوشبو سے بو جھل ہو رہی تھی۔

میں بانس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ گردن ایک طرف بڑی ادا سے جھکائے پر اسرار مجسمہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے گمرے سیاہ بال شانوں پر جھکے ہوئے تھے۔ میں کچھ شک میں پڑ گیا تھا کہ اس لڑکی کو جیسا میں نے سمجھا تھا یہ ویسی نہیں ہے۔ اس کا تعلق دوسری قسم کی عورتوں سے ہے۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا اور اٹھنے ہی

جیسے ہی میں دروازے کی طرف بڑھا وہ عورت یا لڑکی دوڑ کر میرے سامنے آگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”میں تمہیں آکاش کے تمام دیوتاؤں کا واسطہ دیتی ہوں۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں دو ہزار برس سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کیا تمہیں مجھ پر ذرا ترس نہیں آتا؟ کیا تم اس محبت کو بھول گئے ہو جو تمہیں مجھ سے تھی۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔“

اور اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی دروازے کی طرف بھاگا اور کمرے سے نکل کر دروازے سے ہوتا ہوا صحن والے دروازے سے نکل کر بازار میں آگیا۔

بازار میں آتے ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا اور جلدی جلدی بوریلا جنگلشن کے چوک کی طرف چلنے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ عورت میرے پیچھے پیچھے نہ آ رہی ہو۔ میں نے چوک میں آ کر جہاں ٹپل روڈ ختم ہوتی تھی مڑ کر دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ وہ عورت مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

میں نے اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کیا۔ ریڈیو سیلون کے لیفٹیننٹ صدیقی سے بھی نہ کیا جو کئی معاملوں میں میرا ہم راز تھا۔ بات ہی ایسی تھی کہ اگر میں کسی کو بتاتا تو وہ یہ کہہ کر ضرور میری سرزنش کرتا کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا تھا کہ ایک عورت نے تمہیں اشارہ کیا اور تم سوچے سمجھے بغیر اس کے گھر میں گھس گئے۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں ٹپل روڈ کی طرف بالکل نہ گیا۔ ایک روز میرا اور لیفٹیننٹ صدیقی کا پروگرام بن گیا کہ فلم ”رتن“ کا مینی شو دیکھا جائے۔ کولہو کے ڈسٹم سینما ہاؤس میں فلم ”رتن“ کا شاید 75 واں ہفتہ چل رہا تھا۔ اس کے گانے بہت مشہور ہوئے تھے اور ہم ریڈیو سیلون کے ڈیسک جاکے پروگرام میں بھی نشر کیا کرتے تھے۔ ریڈیو سیلون سے اپنی اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ہم نے ریڈیو کی کنٹین میں ہی کھانا کھایا اور وہاں سے سینما ہاؤس کی طرف چل پڑے۔

کولہو میں برسات کا موسم پورے جون پر تھا۔ دن میں ایک بار ضرور بارش ہو جاتی تھی اور بڑی موسلا دھار۔ بلکہ اندھا دھند بارش ہوتی تھی۔ اس روز بھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فلم دیکھ کر ہم سینما ہاؤس سے نکلے تو شام ہو چکی

تھی اور کولہو کی سڑکوں پر کہیں کہیں بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ شاید میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ صدیقی کولہو کے فوجی گیریزن کی بارک میں رہتا تھا۔ اس کی فیملی میرٹھ میں تھی۔ بڑے ادب آداب اور رکھ رکھاؤ والا اٹلکپیل ٹائپ نوجوان تھا۔ سنہری رنگ کے سگریٹ ہولڈر میں سگریٹ لگا کر پیتا تھا۔ کبھی کبھی پائپ بھی منہ میں لگا لیتا تھا۔ بہت کم اور بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کی ہنسی کی آواز بالکل نہیں آتی تھی۔ اردو اور انگریزی ادب سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ برٹش آرمی میں دی سی او تھا اور عمر میں مجھ سے بڑا تھا مگر مجھے بڑے ادب کے ساتھ صاحب کہہ کر بلاتا تھا۔ چہرے پر اور خاص طور پر اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ فلم دیکھ کر نکلے تو کہنے لگا۔

”چلیں گیریزن میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ اتنی جلدی گھر جا کر آپ کیا کریں گے۔“

میں نے کہا۔

”رات ہو گئی اور بارش آگئی تو رکشا ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔“

صدیقی نے کہا۔

”ارے صاحب! ایسی پریشانی کی کوئی بات ہے۔ اگر بارش آگئی تو گیریزن کی کوئی نہ کوئی شیشن دیگن آپ کو بوریلا جنگلشن چھوڑ آئے گی۔“

میں نے کہا۔

”پھر ٹھیک ہے، چلیں۔“

ہم نے ٹیکسی پکڑی اور کولہو کے فوجی گیریزن کی طرف چل دیے۔ یہ گیریزن شہر سے کچھ فاصلے پر سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں ایک جھیل کے پاس ہی واقع تھا۔ اس کے ارد گرد کوئی پندرہ فٹ اونچی خاردار تاروں والی دوہری دیوار کھڑی تھی اور اندر فوجی بارکیں تھیں جہاں کولہو میں مقیم برٹش آرمی کی انڈین یونٹ کے فوجی رہتے تھے۔ ان میں پنجاب ریمینٹوں کے فوجی زیادہ تھے۔ میں اس سے پہلے بھی بھائی جان کے ساتھ دو تین مرتبہ آچکا تھا۔ یہاں کا فوجی ماحول مجھے بڑا پسند تھا۔ خوب رونق رہتی تھی۔ لیفٹیننٹ صدیقی جس بارک میں سوتا تھا وہ زیادہ لمبی بارک نہیں تھی۔ آٹھ سائے پندرہ تین چار پائیاں بچھی تھیں۔ درمیان میں گزرنے کے لیے کافی جگہ تھی۔ اسی بارک میں وائسرائے کشن آفسرز کے علاوہ صوبیدار میجر

سڑکوں پر سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں رکشے میں چلا جاؤں گا۔“

صدیقی کو خدا حافظ کہہ کر میں کولہو کے فوجی گیرزن سے نکل کر شہر کی طرف جاتی بھیگی ہوئی سڑک پر چلے گا۔

وہاں کوئی ٹیکسی رکشا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا چوک میں کوئی ٹیکسی یا رکشا مل جائے گا۔ بارش والی راتوں میں مجھے اس علاقے کا تجربہ نہیں تھا۔ چوک میں آیا تو

بارش ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ میں نے بش شرٹ، پتلون اور چپل پہنی ہوئی تھی۔

بارش ابھی بوندا باندی کی شکل میں ہو رہی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر چلا گیا۔ سڑک کی

بتیاں روشن تھیں۔ بھیگی سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے گاڑیاں گزر رہی تھیں مگر کوئی رکشا یا ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔

بوندا باندی رک گئی۔

میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ یہ اس زمانے کا گولڈ فلیک کا سگریٹ تھا۔ بارش

میں اس سگریٹ کا کش لگا کر آنکھیں بند کرتا تھا تو جنوب مشرقی سمندروں کے پراسرار

جزیروں میں غیلے اور سرخ پھول سجائے رقص کرتی دیو دایاں نظر آتیں۔ آنکھیں

کھولتا تو سامنے ہزاروں سال پرانے گھنے درختوں والے جنگلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا نظر

آنے لگتا۔ جہاں دن کے وقت بھی تاریکی چھائی رہتی اور چاندنی کی پریاں ان جنگلوں

کے قریب سے دبے پاؤں سہی ہوئی گزر جاتیں۔ میں نے گولڈ فلیک کے سگریٹ کا

ہکا سائش لیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ بارش میں بھیگی ہوئی رات میں

جھیل کے کناروں پر جو استوائی کنول کے پھول کھلے ہوتے ہیں ان کو دیکھا جائے۔

میری اس زمانے کی رومانوی مہموں میں میری نیچر کے حسن کی متلاشی بے چین روح

کی آوارگیوں کے علاوہ بلند اخلاق چائے استوائی گھنے جنگلوں کی بارشوں، دیودار کے

درختوں کی خوشبوؤں والی کافی اور اس زمانے کے اعلیٰ خاندانی گولڈ فلیک، کریون

اے، کیونڈر اور ٹرکس سگریٹوں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان استوائی بارشوں، اس کافی

کے تلخ ذائقے اور سگریٹوں کی لذتوں کا تصور کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ میں کہاں

سے چلا تھا۔ مجھے کہاں کہاں جانا چاہئے تھا اور میں کہاں آ گیا ہوں۔

اس وقت بوندا باندی پھر سے شروع ہو گئی تھی جب میں کولہو کی کنول کے

پھولوں والی جھیلوں کی طرف چل پڑا تھا۔ یہاں میں دن کے وقت ایک دو بار آچکا تھا

کے ریف کے فوجی بھی رہائش پذیر تھے۔

جس وقت ہم گیرزن میں پہنچے بلکی بلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور گیرزن

کی بارکوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ ہم سیدھا فوجی کینٹین میں آ گئے۔ یہاں ہم

نے ڈبے کے پیچھے لیکوڈ دودھ والی فوجی چائے پی جس کا ذائقہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔

اس کے بعد ہم بارک میں آکر بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگا کر باتیں رکنے لگے۔ صدیقی

کو اپنا شہر میرٹھ یاد آ گیا۔ میرٹھ کی چھاؤنی کا علاقہ جہاں ہم کے بڑے بڑے گنجان

درخت تھے۔ مجھے بھی بہت پسند تھا اور صدیقی کا تو یہ آبائی شہر تھا۔ کہنے لگا۔

”میرٹھ کی برسات مجھے بہت یاد آتی ہے۔ ہم سکول سے بھاگ کر بارش میں

بھیگتے، آم کے باغوں میں آم توڑنے جاتے تھے۔ چھاؤنی کی سڑک پر نیم کے درختوں

کے نیچے نمکولیاں اٹھا اٹھا کر کھایا کرتے تھے۔ لٹکا میں نیم کے درخت نہیں ہوتے۔

میں نے تو نہیں دیکھے۔ تم بنگال کی بارشوں کو بہت پسند کرتے ہو۔ کبھی موقع ملے تو

ساون میں میرٹھ ضرور جانا۔“

صدیقی کی چارپائی بارک کی کھڑکی کے پاس تھی۔ صدیقی چارپائی پر بیٹھا تھا۔

میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ کھڑکی میں سے سری لٹکا کی بارشوں کی مرطوب

ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ سامنے والی بارکوں کے آگے کچھ فوجی گاڑیاں کھڑی بارش میں

بھیک رہی تھیں۔ بارکوں کے باہر کھیموں پر لگے بجلی کے بلبوں کی روشنی میں بارش

گرتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ بلکی بارش تھی اور اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔

مجھے بودھ معبدوں میں استوائی پھولوں اور اگر بتیوں کی خوشبوؤں میں عبادت کرتی

لڑکیوں کا خیال آنے لگا جن کے سر جھکے ہوئے ہوتے ہیں اور سیاہ بالوں میں گہری

پراسرار خوشبو والے پھول سجے ہوتے ہیں۔

ہم نے کھانا بارک میں ہی منگوا کر کھایا۔ اس کے بعد ڈبے کے پیچھے دودھ

والی چائے ایک بار پھر پی۔ اس دوران رات کے نوج گئے تھے۔ بارش بھی رک گئی

تھی۔ میں نے صدیقی سے کہا۔

”اب میں چلتا ہوں۔ بھائی جان کو بتا کر نہیں آیا۔“

اس نے کہا۔

”نمبر میں شیٹن دیکھن کا انتظام کرتا ہوں۔“

میں اس خوشبوؤں والی بارش اور ہوا میں بند دیکھن میں بیٹھ کر کولہو کی

خوشبو بن جائے تو پھر وہ ان چیزوں کو کیسے بھلا سکتا ہے۔

میرے اوپر اونچے اونچے گھنے درخت تھے جن کی شاخوں پر ہلکی بارش کی بوندیں گرتیں تو شاخوں کے پتے آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ کبھی ان کی سرگوشیوں میں مجھے دبی دبی ہنسی کی آواز آتی اور کبھی ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ مگرشتہ خزاں میں شاخوں کے پتھڑے ہوئے زرد پتوں کو یاد کر کے آپس بھر رہے ہوں۔ جھیل کے کنارے پر سرکندے آگے ہوئے تھے۔ آگے جا کر یہ سرکندے ختم ہو گئے اور مجھے اندھیرے میں پانی میں سے باہر نکلے ہوئے دو چار کنول کے پھولوں کے دھندلے سے خاکے نظر آئے۔ میں ان کے قریب آ کر جھک کر انہیں دیکھنے لگا۔ کنول کا پھول اپنی خوشبو چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ ہر کسی پر اپنی خوشبو کے خزانے نہیں لٹاتا۔ وہ آدمی کو پہچان کر اپنے خوشبو نکل کا دروازہ کھولتا ہے۔ کوئی نامحرم اس کے قریب آئے تو وہ اپنی خوشبو کا سانس روک لیتا ہے۔ یہ باتیں مجھے کہاں سے معلوم ہوئیں، اگر ایک کنول کا پھول مجھے نہ بتاتا۔ برسات کی گہرے اندھیرے والی رات میں بھی اس کنول کے پھول نے مجھے پہچان لیا تھا اور مجھے اس کی خوشبو محسوس ہوئی۔ میرے ہاتھ میں گولڈن فلیک کا جو سلگتا ہوا سگریٹ تھا اس پر بارش کی ایک دو بوندیں اندھیرے میں گریں اور وہ بجھ گیا۔ بجھتے ہوئے بھی اس کلاسیکل سگریٹ میں سے ایسی کڑوی اور گہری خوشبو آئی کہ میرا جی اسے پھینکنے کو نہ چاہا۔ آج ان سگریٹوں کی لاشیں میری یادوں کے غائب گھروں میں شیشے کی الماریوں میں بند پڑی ہیں۔ کیسے وفا شعار پاک باز سگریٹ تھے کہ ان پر کوئی فلٹر نہیں لگا ہوتا تھا۔ ان کا تمباکو خالص تھا۔ ان کی کونٹین خالص تھی۔ ان کا زہر خالص تھا۔ پینے والوں کی انگلیاں براؤن ہو جاتی تھیں مگر ان کے پینے سے کسی کو کینسر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی نہیں سنا تھا کہ فلاں آدمی کو سگریٹ پینے سے کینسر ہو گیا اور وہ مر گیا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اس زمانے میں لوگوں کی زبان پر اس کا چرچا ضرور ہوتا۔ جب کہ آج اعلیٰ سے اعلیٰ اور گھٹیا سے گھٹیا ہر سگریٹ پر فلٹر بڑھا ہوتا ہے۔ پینے والوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ خاص فلٹر ہے۔ یہ سگریٹ کی ساری کونٹین اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ جاپانی سگریٹوں پر تو یہ بھی لکھا ہوتا کہ ان سگریٹوں میں تار کول بالکل نہیں ہے۔ ان میں کونٹین بھی نہیں ہے۔ پھر بھی لوگوں کو یہ سگریٹ پی کر کینسر ہو جاتا ہے۔ ایسے ایسے وفا شعار لوگوں نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے جنہوں نے سگریٹوں سے ساری زندگی ساتھ نبھانے کا پیمان وفا باندھا تھا۔ جو پیتے

مگر اب رات کا وقت تھا اور ابر آلود رات نے تاریکی کی گہری چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں اندازے سے ایک چھوٹی سی سڑک پر چل رہا تھا۔ یہ کوئی پہاڑی علاقہ نہیں تھا مگر یہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن کے درمیان جھیلیں تھیں۔ ان چٹانوں اور چھوٹی پہاڑیوں کے پیچھے کچھ فاصلے پر سمندر کا چٹانی ساحل تھا۔ جہاں ایک لائٹ ہاؤس بھی نصب تھا۔ اس لائٹ ہاؤس کی نصف دائرے میں گھومتی ہوئی روشنی کا عکس تھوڑی دیر کے لیے آسمان پر پڑ کر غائب ہو جاتا تھا۔ سنگاپور، ملایا اور برما کی جھیلوں کی طرح کولمبو کی یہ جھیلیں بھی ایک دوسری سے ملی ہوئی تھیں اور آخری جھیل سمندر کی ایک کھاڑی میں جا کر گرتی تھی۔

دن کے وقت لوگ یہاں سیر و تفریح کو آتے تھے اور ان میں کشتیاں بھی چلتی تھیں مگر اس وقت جھیل پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ میرا دیوانہ پن تھا کہ میں اس بارش والی اندھیری رات میں نیلے، کاسنی اور سفید کنول کے پھول دیکھنے ان جھیلوں کی طرف نکل آیا تھا، لیکن یہ دیوانہ پن مجھے اس وقت بھی بہت پسند تھا اور آج بھی مجھے اس سے بڑی محبت ہے اور میں عقل کے ایک ہزار راستے چھوڑ کر اس دیوانگی کے راستے پر چلنے کے لیے ہر دقت تیار رہتا ہوں۔ میں ہلکی بوندا باندی والی اندھیری رات میں کبھی آنکھیں پوری کھول کر اور کبھی سکیڑ کر ان درختوں کے خاؤں کو دیکھتا جاتا تھا جن کے درمیان جھیلیں تھیں۔ بارش ابھی تک بوندا باندی کی شکل میں ہی تھی۔ آخر میں پہلی جھیل کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں کس قسم کی خوشبو فضا میں موجود تھی؟

کیا میں اسے یاد کر کے لکھوں؟

نہیں! یہ خوشبوئیں تو مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے ابھی ایک منٹ پہلے میں ان جھیلوں سے مل کر واپس آیا ہوں۔ یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کی یادیں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ روشن زیادہ تروتازہ ہوتی جا رہی ہیں۔

میں لوگوں کے نام بھول جاؤں، شکلیں بھول جاؤں، سب کچھ بھول جاؤں مگر یہ خوشبوئیں یہ بارشیں اور گرم استوائی راتوں کے جنگل اور ان جنگلوں کی شور مچاتی، درختوں کو اکھاڑ اکھاڑ کر اپنے ساتھ بھاتی بارشیں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔ میں چاہوں بھی تو قدرت کے حسن کی ان نشانیوں کو نہیں بھلا سکتا۔ جب آدمی جنگلوں، خوشبوؤں اور بارشوں کی محبت میں خدا کی زمین پر پھرتے پھرتے خود جنگل، بارش اور

ہیں وہ ڈر ڈر کر پیتے ہیں۔ جو نہیں پیتے وہ پینے والوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کیس انہیں بھی کینسر نہ ہو جائے۔

سوچنا چاہیے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ اس زمانے میں لوگ خالص ٹکونین پی کر بھی لمبی عمریں پاتے تھے۔ ضرور ان کے جسم کے اندر کوئی ایسا تریاق پہلے سے موجود ہوتا ہو گا جو ٹکونین کے زہر کو بے اثر کر دیتا ہو گا۔ میں نے اس تریاق کا بڑا کھوج لگایا مگر ناکام رہا۔ آخر اس راز پر سے آج کے زمانے کے ایک تخریب کار سگریٹ نے پردہ اٹھایا۔ میں نے اس تخریب کار سگریٹ کو پکڑ لیا اور اس سے اس تریاق کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا لیکن ساتھ ہی مجھ سے قسم لے لی کہ میں یہ راز آگے کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اب میں مجبور ہوں۔ آپ کو یہ راز تو نہیں بتاؤں گا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آج کے زمانے کے سگریٹ بالکل نہ تھیں۔ ان سے واقعی کینسر ہو جاتا ہے۔ ایک تو آج کے زمانے کا آدمی اس تریاق سے محروم ہو چکا ہے جو زہر کے اثر کو زائل کر دیتا تھا دوسرے آج کے زمانے کے سگریٹ دہشت گرد ہیں۔ تخریب کار ہیں۔ ان کا ہر کش آدمی کے اندر تباہ کن دھماکے کرتا ہے۔ پہلے زمانے کے سگریٹ رضا کار ہوتے تھے۔ وہ آدمی کی بڑی مدد کرتے تھے۔ ایسے ایسے خوبصورت خیال پکڑ کر لے آتے تھے کہ آدمی ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ بارش سے بچا ہوا گولڈ فلیک کا سگریٹ میرے ہاتھ میں تھا اور اسے پھینکنے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں کنول کے ایک پھول پر جھکا ہوا تھا۔ برسات کی اندھیری رات میں مجھے صاف طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کنول کا پھول بھی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میرے اوپر بو گھٹنے درخت تھے ان میں اچانک بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ پھر کالے کالے بادلوں میں بجلی نے چمک کر سارے منظر کو ایک سیکنڈ کے لیے روشن کر کے پہلے سے زیادہ تاریک کر دیا۔ ساتھ ہی بادل زور سے گرجے اور بارش شروع ہو گئی۔

کولہو کی بارشیں میں نے بہت دیکھی تھیں۔ یہ بڑی موسلا دھار ہوتی تھیں اور ایک دم شروع ہو جاتی تھیں۔ اس رات بھی ایسے ہی ہوا۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج کے ساتھ ہی زور شور سے بارش ہونے لگی۔ میں دوڑ کر درخت کے تنے کے پاس آ گیا۔ بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ بادل گرتے رہے تھے۔ بارش ایسی ہی رہی تھی جیسے بادلوں میں سے آباریں گر رہی ہوں۔ میں درخت کے نیچے بھی بیٹھ

لگا تو سوچا کہ اس سے پہلے کہ سڑک پر بھی ندی بنے لگے، یہاں سے واپس نکل جانا ہاں ہے۔

بش شرت اور پتلون تو بھیگ ہی گئی تھی۔ میں بارش میں ہی سڑک پر آ گیا۔ ایک تو رات کا اندھیرا، دوسرے موسلا دھار بارش، بجلی چمکتی تو ایک سیکنڈ کے لیے جھاڑیاں، درخت اور بارش میں بھیجتی چھوٹی سی سڑک نظر آتی اور پھر گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ میں اندازے سے بارش میں شرابور سنہیل سنہیل کر چل رہا تھا۔ بجلی کی چمک میں چند قدموں کے فاصلے کو غور سے دیکھ لیتا اور جب اندھیرا چھا جاتا تو تیز تیز قدموں سے اتنا فاصلہ طے کر لیتا۔ چھ سات مرتبہ ایسا کرنے کے بعد ایک بار بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک ٹیلے کے قریب میں آ گیا ہوں۔ آتی دفعہ میں یہاں سے بالکل نہیں گزرا تھا۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔ بارش کی وجہ سے مجھے بار بار آنکھوں کو پونچھنا پڑتا تھا۔ بجلی چمکی تو میں وہیں سے واپس ہو گیا۔ اس خیال سے کہ جہاں سے میں غلط راستے پر آ گیا ہوں وہاں پہنچ کر بڑی سڑک پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

اب بجلی بھی کافی وقفہ ڈال کر چمکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اندھیرے میں بالکل ہی بھٹک گیا۔ نہ اصلی سڑک ملی اور نہ وہ راستہ ہی ملا جہاں سے میں واپس ہوا تھا۔ میں کسی اور ہی طرف نکل آیا تھا۔ اندھیرے میں درخت اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرت نظر آ رہے تھے۔ اچانک ڈھلان آ گئی۔ ڈھلان سے اترا تو وہاں پانی ہی پانی تھا۔ میرے پاؤں پانی میں چل رہے تھے۔ بارش مجھے کسی جگہ رک کر سوچنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ پانی پہلے میرے فخنوں تک تھا پھر بڑھتے بڑھتے میری پنڈلیوں تک آ گیا۔ میں ٹھہر گیا۔ خدا جانے میں کسی جمیل کی طرف جا رہا تھا یا آگے کوئی دریا تھا یا کیا تھا۔ سامنے سے درختوں کے سیاہ کالے بھوت نما خاکے بجلی کی ہلکی چمک میں نظر آ جاتے تھے۔ میں دائیں طرف ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ بائیں طرف جمیلیں ہیں۔

پانی میری پنڈلیوں کو چھوتا ہوا مجھ سے آگے آگے جا رہا تھا۔ پہلے اس کا بہاؤ معمول تھا۔ پھر تیز ہونے لگا۔ مجھے ایک طرف سے ایسی آواز آنے لگی جیسے اوپر سے پانی آبشار کی شکل میں نیچے گر رہا ہو۔ یہاں ارد گرد اتنے درخت تھے کہ بجلی کی روشنی یہاں تک پہنچنے پہنچنے اندھیروں میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ جس طرف سے پانی کے زبردست شور کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں اس سے ہٹ کر چل رہا تھا۔

کرنے لگا کہ شاید کنارے پر کہیں ہاتھ پڑ جائے اور میں پانی کے ریلے کے ساتھ سرنگ میں جانے سے بچ جاؤں لیکن پانی کا تیز ریلہ مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اندھرا گھب چھا گیا اور پانی کی گونج سنائی دینے لگی۔ میں سرنگ میں داخل ہو گیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ سرنگ بھری ہوئی نہیں تھی۔ اگر سرنگ پائپ کی طرح پانی سے بھری ہوتی تو میں کہاں تک پانی کے اندر سانس روک سکتا تھا۔ میں نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ میرا ہاتھ سرنگ کی چھت سے ٹکرایا۔ سرنگ کی چھت مجھ سے ایک ہاتھ اونچی تھی۔ پانی کا بہاؤ سرنگ میں آتے ہی زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پانی کی موجوں کے اوپر ڈال دیا تھا اور صرف ہاتھ آگے کو کر رکھے تھے کہ میرا سر کسی پتھر سے نہ ٹکرا جائے۔ سرنگ کے اندر بھی پانی گمراہ تھا اور میرے پاؤں تمہ کے ساتھ نہیں لگ رہے تھے۔ دل میں یہی خیال آ رہا تھا کہ میں گیرزن سے سیدھا گھر ہی چلا جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔

ایک جگہ سرنگ مڑی تو میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے بعد پانی اچانک چڑھنا شروع ہو گیا۔ شاید سرنگ چھوٹی ہونے لگی تھی۔ پہلے پانی میرے کندھوں تک تھا، پھر گردن تک آ گیا اس کے بعد میری ٹھوڑی بھی پانی میں ڈوبنے لگی اور سر اوپر سرنگ کی چھت سے ٹکرانے لگا۔ میں گھبرا گیا۔ جتنی دعائیں یاد تھیں، پڑھنی شروع کر دیں مگر پانی اوپر ہی اوپر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پانی میرے سر کے اوپر سے نکل گیا اور میں پانی کے اندر گھبراہٹ میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ بار بار اوپر آتا کہ شاید سرنگ میں پانی کم ہو گیا ہو مگر ہر بار میرا سر پانی کے اندر ہی اندر سرنگ کی چھت سے ٹکراتا۔ میں کوئی تربیت یافتہ غوطہ خور نہیں تھا۔ مجھے سانس زیادہ سے زیادہ روکنے کی مشق بھی نہیں تھی۔ امرتسر کے کمپنی باغ کی بڑی اور چھوٹی دونوں نہروں میں لڑکپن میں غوطے لگایا کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ آدھا منٹ پانی کے اندر رہتا تھا۔ اس وقت یقین کریں کہ میرے دل میں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کسی کا خیال نہیں تھا اور میں اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔ میرے جیسے لوگوں میں پانی داخل ہونے لگا تھا۔ دو تین بار بے اختیار ہو کر میں نے سانس لینے کے لیے منہ کھولا اور پانی کافی مقدار میں میرے حلق میں اتر گیا تھا۔ اس کے بعد مجھ پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پانی

جب مجھے پانی کا بہاؤ تیز ہوتا ہوا محسوس ہوا تو میں رک گیا۔ میں نے وہاں سے بچ جانے کا فیصلہ کر لیا اور مڑ کر چلنے ہی لگا تھا کہ ایک جانب سے پانی کا زبردست ریلہ آیا اور میں پانی میں گر پڑا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر پانی ا ریلہ اس قدر تیز اور زور دار تھا کہ میرے اکھڑے ہوئے پاؤں کہیں تک نہیں رہے تھے۔ میں بے اختیار پانی میں بہا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے پانی کا ریلہ مجھے آگے لئے جاتا تھا اس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں گہرے پانیوں میں آ گیا ہوں۔ میرے پاؤں تمہ میں نہیں لگ رہے تھے۔ یہ کوئی پرشور برساتی نالہ تھا جس میں ادھر ادھر سے موسلا دھار بارش کا پانی شامل ہو کر تیز رفتار دھارے کی طرح بہہ رہا تھا اور مجھے درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔

عجیب صورت بن گئی تھی۔ اندھیری رات، موسلا دھار بارش اور برساتی نالے کا طوفانی پانی۔ مجھے تیرنا ضرور آتا تھا لیکن مجھے تیرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ پانی کی موجیں اچھل اچھل کر ایک طرف سے آ کر مجھ سے ٹکراتیں اور مجھے اپنے ساتھ اچھال کر دوسرے کنارے کی طرف لے جاتیں۔ میں دوسری طرف کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا تو ادھر سے پانی کی اونچی دیوار سی مجھ پر آ کر گرتی اور میں ایک بار پھر نالے کے وسط میں آ جاتا۔ اندھیرے میں جتنا میں دیکھ سکتا تھا اس سے مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ میں ایک طوفانی برساتی نالے میں بہا جا رہا ہوں جس کی دونوں جانب کے کنارے اونچے ہیں۔ کنارے اونچے ہونے کی وجہ سے پانی میں زبردست طوفانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

مجھے صرف یہ خطرہ تھا کہ کہیں آگے جا کر یہ برساتی نالہ بلندی سے نیچے پٹائی پتھروں پر نہ گرتا ہو۔ ایسی صورت میں میرا زندہ بچنا مشکل تھا۔ اچانک بجلی چمکی تو میں نے جو منظر آنکھ جھپکنے کے وقفے میں دیکھا وہ یہ تھا کہ میری دونوں جانب کنارے دیواروں کی طرح اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور جس طوفانی نالے میں بہا جا رہا تھا وہ تھوڑے فاصلے پر ایک پہاڑی سرنگ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ خدا جانے پانی کی یہ سرنگ مجھے کہاں سے کہاں لے جائے گی۔ میں زور زور سے بازوؤں اور ٹانگوں کو تیز پانی میں چلاتا کنارے کی طرف جانے کی کوشش

سے لدے ہوئے بادلوں میں تیرتا جا رہا ہوں۔ میری آنکھوں میں روشنی کے چھوٹے
چھوٹے نقطے ابھرتے اور پھلجھڑیوں کی طرح پھٹ رہے تھے۔ اس کے بعد روشنی کے
یہ نقطے بھی اندھیروں میں ڈوب گئے۔
پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں ایک چارپائی پر سیدھا پڑا تھا۔ بانس کے ساتھ لٹکی ہوئی
لائین روشن تھی۔ لائین کی روشنی میں چھت کے بانس نظر آئے۔ یہ کوئی جھونپڑی
تھی۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور جسم میں سخت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اتنا میں سمجھ
گیا تھا کہ کوئی مجھے پانی میں سے نکال کر یہاں لے آیا ہے۔ میں زندہ بچ جانے پر خدا
کا شکر ادا کر رہا تھا۔ جھونپڑی کافی کشادہ تھی۔ کونے میں مٹی کے کچھ برتن پڑے
تھے۔ جھونپڑی کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں
سوچنے لگا وہ فرشتہ صفت انسان کہاں ہے جو مجھے موت کے منہ سے نکال کر یہاں لایا
ہے۔

اتنے میں دروازے کا پردہ ہٹا اور میں نے ایک عورت کو اندر داخل ہوتے
دیکھا۔ یہ عورت لائین کی روشنی میں آئی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی ٹپل
روڈ والی پراسرار عورت تھی جو مجھے اپنے گھر میں اشارے سے بلا کر لے گئی تھی۔
جس نے مجھ سے عجیب و غریب باتیں کی تھیں اور جس کے گھر سے میں بھاگ آیا
تھا۔ وہ چارپائی پر میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر وہی پراسرار
مسکراہٹ تھی۔ میں نے کہا۔

”مجھے کس نے پانی میں سے نکالا تھا؟“

اس نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی انگلیوں میں سے ناریل
کی خوشبو آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”تم بولومت۔ آرام کرو۔“

پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں پیالہ لئے اندر آ
گئی۔

”یہ پی لو۔“

اس نے مجھے سارا دے کر چارپائی پر بٹھا دیا۔ میں نے پوچھا۔

جب ہوش آیا تو جھونپڑی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لالین بچہ چلی تھی۔
 میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں یہی
 سمجھا کہ میں ایک دو گھنٹے سویا ہوں۔ ابھی تھوڑی سی رات باقی ہے۔ لالین اپنے
 آپ بچھ گئی ہو گی۔ میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ جسم کی توانائی بھی واپس آ چکی
 تھی۔ ذرا سی کمزوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ باہر سے بارش کی آواز بھی
 نہیں آرہی تھی۔ بارش رک گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر بعد صبح ہونے
 والی ہے۔ مجھے اس عورت کا انتظار نہیں کرنا چاہئے اور یہاں سے گھر کی طرف نکل
 دینا چاہیے۔ بھائی جان میرے رات کو گھر سے غائب رہنے کی وجہ سے سخت پریشان
 ہوں گے۔

اتنے میں مجھے قدموں کی آہٹ کی آواز آئی۔ میں نے اندازے سے
 جھونپڑے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے دیا سلائی جلانے کی آواز آئی اور پھر
 میں نے اسی عورت کو دیکھا کہ وہ لالین روشن کر رہی تھی۔ اس نے چنی کے اندر
 فی جلائی اور چنی بیچے کر دی۔ جھونپڑی میں اجالا ہو گیا۔ میں چارپائی پر بیٹھا ہوا
 تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ میں نے پوچھا۔

”رات کا کیا بتا ہو گا؟“

وہ چارپائی پر پھرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

”کون سی رات؟ پہلی یا دوسری؟“

میں حیران ہوا۔ کہنے لگی۔

”تم پوری ایک رات اور ایک دن سوئے رہے ہو۔ یہ دوسری رات ہے

اور اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں۔“

میں نے گھبرا کھا۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔ تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔ گھر میں لوگ پریشان ہو

رہے ہوں گے۔“

وہ بولی۔

”تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صبح جب تم اپنے گھر جاؤ گے تو

لوگ یہی سمجھیں گے کہ تم صرف ایک رات گھر سے غائب رہے ہو۔ کہہ دینا

”اس میں کیا ہے؟“

کہنے لگی۔

”یہ رات ہے۔“

عرق کا غلظت سری لنکا میں بڑا عام فہم تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سری لنکا کی
 سرکاری ڈسٹری میں جو شراب تیار ہو کر بازار میں فروخت ہوتی تھی اس کا سرکاری
 نام عرق تھا۔ میں نے ہاتھ سے پیالے کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”یہ شراب ہے، میں نہیں پیوں گا۔“

وہ مسکرائی۔ اس نے کہا۔

”یہ وہ عرق نہیں ہے۔ یہ لنکا کے جنگلوں کی خاص جڑی بوٹیوں کا ست
 ہے۔ اس کو پینے سے تم اچھے ہو جاؤ گے۔“

میں نے عرق کا ایک گھونٹ پیا۔ اس کا ذائقہ ایسا تھا جیسے کچے بانس کا رس
 ہو۔ چونکہ بانس کے درختوں سے میں محبت کرتا ہوں اس لیے سارا عرق پی گیا۔ اس
 نے واقعی میرے جسم کو بڑی طاقت دی۔ میرے چکر غائب ہو گئے اور طبیعت خوشگوار
 ہو گئی۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں انسان سے بانس بن
 گیا ہوں۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ میں بانس نہیں تھا۔ اس نے
 پوچھا۔

”چکر تو نہیں آتے؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔

اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ جھونپڑی کس کی ہے۔
 کہنے لگی۔

”جو اس جھونپڑی میں آجائے یہ اسی کی ہے۔ تم اب آرام کرو۔ میں صبح
 تمہارے پاس آؤں گی۔“

وہ لالین کی بقی بچی کر کے جھونپڑی سے نکلنے لگی تو پلٹ کر میری طرف
 دیکھا اور مسکرائی۔ پھر پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے ساتھ ہی مجھ پر کچھ
 اس قسم کی غنودگی سی طاری ہونے لگی جیسے عرق میں کوئی خواب آور شے ملائی گئی
 ہو۔

اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

بارش کے طوفان میں پھنس گیا تھا۔

کے ہاتھ کی گرفت اور گری اپنے ہاتھ پر باقاعدہ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ میرے آگے آگے چلتی جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔

اس کی یہ عجیب و غریب بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کہا۔
”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے دو راتیں گزر گئی ہوں اور میرے بھائی جان سمجھیں کہ میں ایک رات گھر سے باہر رہا ہوں۔“
وہ کہنے لگی۔

”یہی تو بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ یقین کرو میرا جھونپڑی میں میرے ساتھ تمہیں دو راتیں گزر چکی ہیں مگر جھونپڑی کے باہر ایک پوری ایک رات بھی نہیں گزری۔“

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ لٹکا کی یہ پراسرار عورت زیادہ سے زیادہ پراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”وہ چاہے جو بھی سمجھیں۔ میں اب گھر جانا چاہتا ہوں۔“

اس عورت نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے تمہارا گھر کہاں ہے؟“

میں نے کہا۔

”کیوں نہیں۔ میں اپنے بھائی جان کے ساتھ کولمبو کے بوریا جکشن میں رہا ہوں۔ ہماری کوٹھی کا نام آئس پلس ہے۔“

وہ بولی۔

”یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ کیا تم اپنا گھر دیکھنا چاہتے ہو؟“

میں نے دل میں سوچا کہ اسی زمانے میں سے تو نکلو۔

میں نے کہا۔

”چلو پھر تم ہی مجھے میرا گھر دکھا دو۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے چارپائی سے نیچے اتارا۔

میں نے کہا۔

”میرا ہاتھ بے شک چھوڑ دو۔ میں اپنے پاؤں پر چل سکتا ہوں۔“

اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ عجیب بات ہے۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا

مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے ار

مجھے یہاں کس مقصد کے لیے لائی ہے۔ وہ گاؤں تکٹے کے سارے اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کے سیاہ بال نیچے گاؤں تکٹے تک آئے ہوئے تھے۔ لکڑی کی دیواروں پر عجیب نم کے رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس میں سے رطوبت رات کی بھیگی ہوئی ہوا آرہی تھی۔ میں نے اس سے صاف صاف پوچھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لائی ہے۔

”میں اس جھوپڑی میں بھی رات گزار سکتا تھا۔“

وہ میری طرف نیم وا آنکھوں سے نکتے جا رہی تھی۔ میں حقیقت اور سرایت کی درمیانی کیفیت میں تھا۔ حقیقت کا دامن بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا اور زندگی کی اسراریت سے بھی کنارہ کش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میرا یہ تجربہ تھا اور ہے کہ دل کو حقائق سے ماورا چیزوں سے دلچسپی ہو اور آدمی کے دل میں اس بات کی رید خواہش ہو کہ دیکھنا چاہئے کہ زندگی کی دیوار چین کی دوسری طرف کیا ہے اور خواہش عشق کی حد تک پہنچ چکی ہو تو آدمی کو حیران کر دینے والی پراسرار چیزیں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور ایسے ہی واقعات پیش آتے ہیں جو مجھے پیش آرہے تھے۔ چنانچہ جب اس پراسرار عورت نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے جھوپڑی میں دو راتیں زبردستی ہیں لیکن دنیا والوں کی صرف ایک رات ہی گزری ہے تو کسی حد تک میں یقین کر لیا تھا اور میرا آج بھی یہ یقین ہے کہ وقت صرف ہماری قیاس آرائی ہی لیکن میں اس پراسرار عورت سے یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ مجھ سے کتنی لگا رہی ہے۔

جب میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ مجھے یہاں کس مقصد کے لیے لائی ہے اس نے خواب آلود آواز میں کہا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جانا چاہتی ہوں جہاں آج سے ہزار سال پہلے ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔“

مادر اسارت اور اسراریت سے مجھے محبت ضرور تھی لیکن میں اس بات کے بھی تیار نہیں تھا کہ گولڈ فلک کے سگروں اور گولڈن چائے اور دیودار کے شہوار جنگلوں اور ان جنگلوں کی بارشوں کی دنیا کو چھوڑ کر ایک عورت کے ساتھ رایت کے اندھروں میں چھلانگ لگا دوں۔ میں نے کہا۔

باہر رات کی تاریکی تھی۔ اندھیرے میں وہ رک گئی۔ میں دو قدم چل کر اس کے قریب آیا تو کہنے لگی۔

”زیادہ دور نہیں جانا۔ میرے ساتھ چلتے رہو۔“

اس نے ساڑھی پن رکھی تھی۔ ایک بار اس نے ہاتھ سے کھلے بالوں کو پیچھے کیا تو مجھے دار چینی کی بڑی دھیمی سی خوشبو آئی۔ ہمارے کشمیری گھروں میں جب قہو تیار ہوتا تھا تو ایسی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوتی تھی۔ اندھیرے میں وہ مجھے نظر آرہی تھی اور میں اس کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ کولہو کا کون سا علاقہ ہے۔ میں جھیلوں سے کتنی دور ہوں؟“

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان اندھیرے میں روشنی جھللا رہی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک جگہ جھاڑیوں اور درختوں میں زمین سے کوئی پانچ چھ فٹ اونچی مچان پر ایک لکڑی کا کاج سا بنا ہوا ہے۔ مچان کے ساتھ بیڑھی لگی ہے۔ برآمدے میں بانس کے ستون کے ساتھ لالین روشن ہے۔ میں نے پوچھا۔

”یہاں کون رہتا ہے؟“

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ دروازہ کھول کر وہ مجھے کاج کے اندر لے گئی۔ اندر جاتے وہ بانس پر سے لالین اتار کر ساتھ ہی لے آئی تھی۔ اندر ایک عجیب خواب ایسا ماحول تھا۔ اس نے لالین کارنس پر رکھ دی تھی جہاں چاندی ایسے چمکتے ہوئے پیالے میں تین چار موم بتیاں لگی تھیں۔ اس نے موم بتیاں روشن کر دیں اور لالین بجھا دی۔ کمرے کی فضا اور رومانیک ہو گئی۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ کارنس کے قریب آمنے سامنے دو چھوٹے تخت بیچے تھے جو سرخ قالین کے ٹکڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سرخ رنگ کے گاؤں تکٹے لگے تھے۔ وہ ایک تخت پر گاؤں تکٹے کا سارا لے کر بیٹھ گئی۔ میں دوسرے تخت پر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

تھی۔

جب اسے گئے چھ سات منٹ گزر گئے تو میں آہستہ سے تخت پر سے اٹھا اور دروازے کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ جاتے ہوئے دروازے کو بند کر گئی تھی۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ عین اسی لمحے بجلی زبردست آواز کے ساتھ چمکی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ بادل گرجنے لگے۔ ان کی گرج جیسے ریل گاڑی کی طرح کمرے کی چھت کے اوپر سے ہوتی ہوئی دور چلی گئی۔ مجھے بارش کی آواز سنائی دی۔ یہ ایک ایسی آواز ہے جس نے بیش مجھے اپنی طرف بلایا ہے اور پھر جب جنوبی سمندروں کی بارش آدھی رات کو آواز دے تو اگر یہ بارش آدم خور شیروں سے بھرے ہوئے جنگل میں بھی ہو رہی ہو تو میں بے اختیار اس جنگل کی طرف دوڑ پڑوں گا۔ میں نے دروازے کے دونوں ہاتھ کھول دیے۔ ٹھنڈی مرطوب ہوا کا تیز جھونکا جیسے میرے بدن کے اندر سے ہو کر نکل گیا۔

بارش بانس کے ستونوں والے برآمدے کے باہر ہو رہی تھی۔ میں برآمدے میں آ کر ایک ستون کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مجھ پر بارش کی پھوار پڑنے لگی۔ رات کے اندھیرے میں بارش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی پھوار میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ بارش رات کا بھیگا ہوا جسم ہے اور اس بارش کی پھوار اس کے بھیگتے ہوئے بدن کا لمس ہے۔ بدن کی سرگوشی ہے۔ برآمدے کی ڈھلوان چھت تاریل کی خوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔ میرے ہاتھ پر بارش کا آبشار کی طرح گرنے لگا۔ بارش بارش جنوبی سمندروں کے سبز جزیروں کی ش! آدھی رات کو نظر نہ آنے والے پھولوں کی خوشبوئیں دینے والے جنگلوں کی ش! بحر! ڈاکوؤں کے ڈوبے ہوئے بادبانی جہازوں کے طوفانی سمندروں کی بارش! ت! رنگوں، سیلون، ہند چینی کے ریسٹورانوں میں کافی چائے اور سگاروں کی خوشبوئیں اڑانے والی بارش! دھیمپور ٹرکوں کی پہاڑی ڈھلانوں پر گھٹے درختوں کو بادل سے اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکنے اور چٹانوں کو گردار آوازوں میں لڑھکانے والی ش! انسانوں کی دشمن، انسانوں کی دوست بارش! موسلا دھار بارش! آسمان پر سے ہوئے سیاہ بادلوں کے سمندر کی ادھ کھلی سیسوں سے موتیوں کی طرح برسنے بارش! زمین کے سینے میں پانی بن کر اترنے اور سونا بن کر نکلنے والی بارش! گاؤں

”پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور آواگون اور دوسرے جنم پر میرا بالکل یقین نہیں ہے۔ تمہارا اس لیے یقین ہے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ اپنے عقیدے کو تم اپنے پاس ہی رکھو۔ میں تمہارے ساتھ کسی دوسری دنیا میں جانے کو تیار نہیں ہوں اور میں جانتا ہوں کہ بغیر میرے یقین کے تم مجھے اپنی دنیا میں لے جا بھی نہیں سکو گے۔“

اس کے چہرے پر مایوسی اور کرب کے تاثرات ابھر آئے۔ گاؤں نکلنے کا سہارا چھوڑ کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس نے چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کا جسم بے معصوم انداز میں آگے پیچھے ہلنے لگا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ میں بھاگنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر بالوں کو پیچھے کیا اور میری طرف ٹھنکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ میں نے سوچا کہ ضرور کوئی جادو کرنے والی ہے مگر مجھے یقین تھا کہ مجھ پر اس کے کسی جادو کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔

میں نے کہا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

”میں وہ دیکھ رہی ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آہستہ آہستہ چل کر دروازے کے پاس گئی۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ مجھے زندگی کی دیوار کی دوسری طرف کی چیزوں کو دیکھنے کا شوق جنون کی حد تک ہے اور چونکہ مجھے ان چیزوں سے عشق ہے اس لیے میں اکثر پر اسرار اور عقل و فہم میں سا جانے والی چیزیں دیکھتا رہتا ہوں لیکن میں زندگی کی دیوار پر بیٹھ کر ہی ان پر اسرار چیزوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ دیوار کی دوسری طرف چھلانگ نہیں لگانا چاہتا۔ مجھے اپنی حدود کا علم ہے۔ میں ان حدود کے اندر ہی رہتا چاہتا ہوں۔ میری ساری خوشیاں، سارے دکھ اور ساری لذتیں، سارا اچھی، بُری یادیں اسی حدود کے اندر میرے ساتھ زندہ ہیں۔ جتنا میں ہوں اتنا میں ہی خوش ہوں۔ چنانچہ میں اس عورت کے اسرار سے بھی لطف اندوز ہو رہا ہوں اور جب وہ چلی گئی تو اس کے جانے پر بھی مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اگر افسوس تھا تو صرف اس بات کا تھا کہ دار چینی کی خوشبو بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے چلی گئی۔

آخر بارش رک گئی۔

میں کانچ کے چٹان کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ معمولی سی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ ایک دھندلی سی گینڈی کانچ کے چٹان کے پیچھے کی طرف چلی گئی تھی۔ یہاں چونکہ زمین نشیبی تھی اس لیے بارش کا پانی وہاں رکا نہیں تھا۔ میں نے سوچا چل پڑنا چاہیے۔ آخر میں شہر کے مضافات میں ہوں۔ کسی جنگل میں نہیں ہوں۔ کہیں نہ کہیں شہر کی کسی نہ کسی سڑک پر نکل ہی آؤں گا۔ میں گینڈی پر چل پڑا۔ لگتا تھا کہ اس گینڈی پر لوگ آتے جاتے رہے ہیں۔ کچھ دور چلنے کے بعد ناریل کے درختوں کا بہت بڑا ذخیرہ آ گیا تھا۔ اندھیرے میں بھیگے ہوئے درخت ٹپک رہے تھے۔ ناریل کے درختوں میں چلنے کے لیے کافی کھلی جگہ تھی۔ مجھے صرف سانپوں کا ڈر تھا۔ سانپوں سے دیے بھی میں بہت ڈرتا ہوں۔ میں احتیاط کے طور پر دو چار قدم چلنے کے بعد زمین پر زور سے پاؤں مار دیتا تھا کہ اس کی دھمک سے اگر سانپ وغیرہ گھاس میں کہیں چھپ کر بیٹھا ہو تو بھاگ جائے۔

ناریل کے درختوں کے تنے کالے سیاہ ستونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ درختوں کے اس ذخیرے سے باہر آیا تو کچھ فاصلے پر مجھے روشنیوں کے نقطے جھللاتے دکھائی دیے۔ یہ یقیناً "کولبو کی کوئی مضافاتی سڑک تھی۔ میں ادھر کو چلنے لگا۔ آخر میں سڑک پر پہنچ گیا۔ سڑک کی بتیاں روشن تھیں مگر وہاں کوئی آبادی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ایک جانب روانہ ہو گیا۔ اتنے میں مجھے پیچھے سے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے سڑک ایک طرف کو گھوم جاتی تھی۔ ادھر گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ روشنیاں سڑک پر بالکل سامنے آ گئیں تو میں نے ہاتھ ہلاتا شروع کر دیا۔ یہ ایک ٹرک تھا جو چند قدم آگے جا کر رک گیا۔ میں دوڑ کر ٹرک کے پاس گیا۔ سنہالی ڈرائیور نے اپنی زبان میں کچھ پوچھا۔ میں نے کچھ انگریزی کچھ اردو میں کہا کہ مجھے بوریلہ جنگشن جانا ہے۔ ڈرائیور نے مجھے اپنی ساتھ والی سیٹ پر بٹھالیا اور ٹرک آگے چل پڑا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ٹرک کے ڈرائیور نے مجھے بوریلہ جنگشن کے چوک میں اتار دیا۔

میں گھر پہنچا تو بھائی جان مجھ پر برس پڑے کہ میں فوجی گیریژن سے نکلنے کے بعد کہاں چلا گیا تھا؟ معلوم ہوا کہ مجھے گھر سے غائب ہوئے دو راتیں نہیں گزری

فصلوں، کھیتوں، آدمیوں کو اپنے ساتھ بنا لے جانے والی اور گاؤں کو آباد کرنے والی اور کھیتوں اور فصلوں کو سرسبز و شاداب کرنے والی بارش! میں بھی تیرے بادلوں کے سمندر سے ٹوٹ کر گرا ہوا موتی ہوں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ بھاتی ہوئی ان قدیم چٹانی سمندروں میں لے جا جن کی تہ میں کبھی دریافت نہ ہونے والے خزانے غرق ہیں اور جن کی گہرائیوں کی گہرائیوں میں ایسے ایسے شہر، ان شہروں کی گلیاں، ان گلیوں کے مکان، ان مکانوں کے خوبصورت لوگ اور ان لوگوں کی تہذیب و ثقافت ڈوبی ہوئی ہے، آسودہ آب ہے۔ جن کی تہذیبیں، اس وقت اپنے نقطہ عروج پر تھیں جب ہماری تاریخ کی ابھی بنیاد بھی نہیں پڑی تھی۔ اے زمین پر نئے پھول کھلانے، نئی نئی تہذیبوں کو جنم دینے والی بارش، مجھے بھی اپنے ساتھ بھاتی ہوا لے جا اور مجھے بھی بحری ڈاکوؤں کے خزانے کی طرح سمندر میں ہمیشہ کے لیے غرق کر دے۔ مگر ذرا ٹھہر جا! مجھے سیلون کی چائے اور پرانے گولڈ فلیک سگریٹوں پیکٹ اپنے ساتھ لے آئے دے۔

میں نے بارش کی پھوار والے برآمدے میں کھڑے کھڑے پتلون کی جب میں سے گولڈ فلیک کا پیکٹ نکالا جو چار پانچ سگریٹ اس میں تھے ان کا کاغذ الگ، تمباکو الگ ہو گیا تھا۔ کاغذ اور تمباکو کیلے ہو کر ایک دوسرے میں کھل مل گئے تھے میں نے بارش سے کہا۔ آئی ایم سوری میری پیاری بارش! اس وقت میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ پھر کبھی سی۔

اب مجھے فکر ہوئی کہ وہاں سے نکل کر بوریلہ جنگشن اپنے گھر کیسے پہنچاؤں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کس علاقے میں ہوں۔ میں برآمدے میں نکلی فریض پر بیٹھ گیا۔ پراسرار عورت کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ رات کے نو بجے وقت ہے۔ اگر میں وہاں صبح ہونے کا انتظار کروں تو میں مجھے ساری رات برآمدے میں بیٹھ کر گزارنی تھی۔ میں کمرے میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ کمرہ جہاں بتیاں روشن تھیں اور تخت پر سرخ قالینوں کے ٹکڑے بچے ہوئے تھے اور دیوار پر عجیب قسم کے دیو مالائی نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اب مجھے جنوں بھوتوں کا لگنے لگا تھا۔ میں جنوں بھوتوں سے ڈرتا نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے بھی مجھے ڈرایا تھا پھر بھی میں ان کے ساتھ رات نہیں گزار سکتا تھا۔ وہیں بیٹھا بارش کی سنتا رہا۔ اندھیری رات میں اسے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

میں زمین کے اوپر کی فضاؤں میں بھٹکتی پھرتی ہے اور جو کسی نہ کسی روپ میں مجھ سے رابطہ کرتی رہتی تھی۔

ان ہی دنوں لیٹیننٹ صدیقی کا دلی فوجی ہیڈ کوارٹر میں تاولہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایک خوش شکل نوجوان کیپٹن فاروق آگیا جس کا تعلق آٹھویں پنجاب رجمنٹ سے تھا اور جو فوجی اخبار کا اسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہ چکا تھا۔ یہ وہی اخبار تھا جس کے چیف ایڈیٹر مشہور صحافی مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔

کیپٹن فاروق بڑا ہنس کھ اور کھلی طبیعت کا نوجوان تھا۔ میری اس سے بڑی دوستی ہو گئی۔ ہم دونوں مل کر جنوب مشرقی ایشیا میں مقیم برٹش فورس کی ہندوستانی ریتھوں کے لیے رنگا رنگ پروگرام لکھتے اور انہیں نشر کرتے۔ ہمارے مزاحیہ فیچر اور گانوں کے ڈیسک جو کی پروگرام فوجیوں میں بے حد مقبول ہونے لگے۔ امریکی میرن کور کے کرنل رچرڈ ریڈیو SEAC سیلون کی امریکی اور اردو سروس کے انچارج تھے۔ وہ ہم دونوں کی کارکردگی کی رپورٹوں سے بڑے خوش تھے۔ کچھ روز پہلے جاپان کے شہزادہ ہاما میں جو امریکی فوجی ریڈیو تھا وہاں سے بھی اردو سروس شروع کی گئی تھی مگر کرنل رچرڈ وہاں کے اردو سروس کے پروگراموں سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اوکو ہاما کی اردو سروس کے پاس تجربہ کار شاف نہیں تھا۔ ایک روز کرنل رچرڈ نے مجھے اور کیپٹن فاروق کو اپنے کمرے میں بلایا۔ کافی پلائی اور ہم سے پوچھا کہ کیا ہم جاپان جانا پسند کریں گے؟

کیپٹن فاروق اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں جاپان کیوں بھیجا جا رہا ہے۔

کیپٹن فاروق نے کہا۔

”سر میں تیار ہوں۔“

کرنل رچرڈ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

”سر میں بھی تیار ہوں۔“

کرنل رچرڈ نے اس کے بعد بتایا کہ جاپان میں اوکو ہاما کی اردو سروس کے اس کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ہے۔ تم دونوں اس معاملے میں تجربہ کار ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جاپان جا کر اردو سروس کے پروگراموں کو فوجیوں میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کرو۔

تھیں۔ یہ اسی شام کی رات تھی جب میں صدیقی صاحب کو یہ کہہ کر فوجی گیریزن سے نکل گیا تھا کہ میں اکیلا ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد میں نے ریڈیو سیلون کی عمارت سے نکل کر ایک رکشہ پکڑا اور بوریلہ جنکشن چوک میں اتر کر گھر کی طرف جانے کی بجائے ٹپل روڈ کے فٹ پاتھ پر چل پڑا۔ میں یہ دیکھتا چاہتا تھا کہ وہ پراسرار عورت اپنے گھر پہنچی ہے یا نہیں۔ اس کا مکان ٹپل روڈ کے وسط میں تھا۔ میں مکان کے قریب آ کر رک گیا۔ مکان کے صحن کا دروازہ فٹ پاتھ کی طرف کھلتا تھا جو بند تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے دروازے کی تھنٹی بجانی چاہیے یا نہیں۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے تھنٹی کا ہٹن دبا دیا۔ تین چار مرتبہ ہٹن دبانے کے بعد صحن میں کسی بوڑھے آدمی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھلا۔ میرے سامنے سیاہ رنگ کا سفید بالوں والا ایک بوڑھا سنہالی کھڑا مجھے اپنی زرد آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سنہالی زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے انگریزی میں اور پھر ٹوٹی پھوٹی وہاں بولی جانے والی اردو زبان میں اسے کہا کہ میں ریڈیو سیلون سے آیا ہوں۔ یہاں ایک خاتون پروفیسر رہتی ہے۔ ہمیں ان کا انٹرویو لینا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔

سنہالی بوڑھے نے کھانسنے کے بعد نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں بتایا کہ وہاں کوئی عورت نہیں رہتی۔ میں نے پراسرار عورت کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا کہ میں دو روز پہلے اس خاتون کو اسی مکان میں مل چکا ہوں۔ سنہالی بوڑھے نے کہا کہ مجھے غلطی لگی ہے۔ میں غلط مکان میں آگیا ہوں اور یہ کہ وہ پانچ سال سے اس مکان میں اکیلا رہ رہا ہے۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور بولا۔

”بے شک اندر آ کر دیکھ لو۔“

میں نے صحن میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں لوہے کی تین چار زنگ آلود کرسیاں بانس کی ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی اور اسی قسم کا ٹوٹا پھوٹا گھریلو سامان صحن میں بکھرا پڑا تھا۔ برآمدے میں تخت پر میلا کچھلا بستر بچھا ہوا تھا۔ یہ بوڑھا سنہالی اسی بستر پر سے اٹھ کر آیا تھا۔ میں سنہالی بزرگ کو کھانسا چھوڑ کر فٹ پاتھ پر واپس چل پڑا۔ مکان وہی تھا۔ مکان کا نمبر وہی تھا جہاں اس پراسرار عورت نے مجھے پہلی بار اپنی طرف بلایا تھا اور پھر مجھے مکان کے اندر لے گئی تھی۔ میں اس مکان کو کیسے بھول سکتا تھا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ عورت ماورائی مخلوق ہی تھی جو کبھی مرئی اور کبھی غیر مرئی شکل

ہم نے حامی بھری اور کٹرل رچرڈ کو یقین دلایا کہ اردو سروس کے پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی ہم بھرپور کوشش کریں گے۔ کٹرل رچرڈ نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور یہ کہہ کر ہمیں رخصت کر دیا کہ میں تمہیں دو دن دیتا ہوں۔ اپنی تیاری مکمل کرلو۔

دو دن کے بعد ہمیں امریکن میرن کے ایک ٹرانسپورٹ شپ پر سوار کرا دیا گیا جو کولمبو سے ہوتا ہوا جاپان جا رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ جہاز پر دشمن کے طیاروں کی بمباری یا سب میرن کے تارپیڈو اٹیک کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بہت بڑا امریکی ٹرانسپورٹ بحری جہاز ایک خاص رفتار سے کولمبو کی بندرگاہ سے نکل کر جاپان کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ کافی طویل سمندری سفر تھا۔ مجھے صبح یاد نہیں کہ ہم کتنے دن سمندر میں سفر کرتے رہے۔ آخر ہم اوکوہاما پہنچ گئے۔

اتنے سمندروں میں سفر کرنے کے بعد دنیا ہی بدل گئی تھی۔ لوگوں کے چہروں کے نقش و نگار بدل گئے تھے۔ جاپان میں خزاں کا موسم تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ فوجی ریڈیو شیشن شہر کے مضافات میں تھا۔ یہ ایک فوجی بیرک تھی۔ جس میں لکڑی کی دیواروں کی پارٹیشن کر کے دو سٹوڈیو اور ایک انجینئرنگ روم بنا دیا گیا تھا۔ ان کے درمیان چھوٹا سا دفتر تھا۔ ڈیوٹی روم کو نے میں تھا جہاں ایک حوالدار باوردی بیٹھا اردو ریڈیو پروگراموں کی مانیٹرنگ کر رہا تھا۔ اردو سروس کا انچارج پوٹھوہار کا ایک گرانڈیل میجر تھا۔ جانگی کا لفظ ہر وقت اس کی زبان رہتا تھا۔ بلکہ یہ لفظ اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ ہم نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر سیلوٹ کیا تو اس نے میری طرف اشارہ کر کے کیپٹن فاروق سے کہا۔

”اچھا یہ وہی سی اور ریک کا نیا جانگی ہے۔“

اس وقت مجھے بڑا غصہ آیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جانگی ان میجر صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ دیے بھی جانگی کا لفظ فوجی بارکوں میں عام بولا جاتا تھا۔ فوجی انسٹرکٹر نوٹے رگروڈوں کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ میں اور کیپٹن فاروق ریڈیو پروگراموں کے بارے میں کافی تجربہ رکھتے تھے مگر اس شعبے میں میجر صاحب کی واقفیت واجب سی تھی۔ میجر نے سارا کام ہم دونوں کے کندھوں پر ڈال دیا اور کہا۔

”ادھر تم لوگوں کی بڑی ضرورت تھی۔ اب جانگیوں کو گانے سننے کا کام

تم ہی کرو گے۔“

اس زندہ دل میجر کا نام شاہ زمان تھا۔ دفتر میں ہمارے علاوہ ایک حوالدار رام بھروسے تھا۔ ایک صوبیدار دربارا سنگھ اور ایک ادھیڑ عمر جاپانی خزانچی تھا۔ ہماری اردو یا ہندوستانی سروس دو کھٹے کی ہوتی تھی۔ اس میں اتحادی فوجوں کا پروپیگنڈا بھی ہوتا۔ مزاحیہ خاکے بھی ہوتے۔ خبریں ہوتیں اور فوجیوں کو ہندوستانی، تامل، تلگو، کنڑ، پنجابی، گورکالی اور بنگالی فلمی اور غیر فلمی گانے بھی سنائے جاتے۔ اس کے بعد انگریزی سروس شروع ہو جاتی تھی۔

جاپانی قوم ابھی تک ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بموں کی ہلاکت خیزیوں کی زد میں تھی۔ ان دو ایٹم بموں نے ہزاروں انسانوں کو ایک سیکنڈ میں موت کی نیند سلا دیا تھا۔ ہزاروں زخمی ہسپتالوں میں پڑے موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر روز ان کے مرنے کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔ جاپان شدید اقتصادی بد حالی کے شعلے میں تھا۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اتحادی خاص طور پر امریکی فاتح کی حیثیت سے جاپان میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں جاپان کی گرہنی ہوئی معیشت کی کیا پروا تھی۔ امریکی فوجی ہائی کمانڈر اوکی ناوا اور دوسرے فوجی اہمیت کے جزیروں پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے میں مصروف تھی۔ شدید بے روزگاری تھی۔ صنعتی شہروں پر امریکی طیاروں کی بمباری نے کارخانے تباہ کر دیئے تھے۔ اشیائے خوردنی کی شدید قلت تھی۔ نوجوان جاپانی لڑکیاں اور لڑکے نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ہمارے فوجی ریڈیو شیشن پر روزانہ کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں روزگار کی تلاش میں آتے۔ میجر شاہ زمان نے دفتر کے جاپانی اکاؤنٹنٹ کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ ایسے لوگوں کو فوراً رخصت کر دے۔

میں نے اور کیپٹن فاروق نے پروگراموں کو دلچسپ بنانے کے لئے محنت سے کام شروع کر دیا۔ ہمارے پروگرام فوجیوں میں بے حد پسند کئے جانے لگے۔ سینکڑوں کی تعداد میں فوجیوں کے خطوط آتے۔ اس فوجی ریڈیو شیشن کا انچارج ایک امریکی کٹرل تھا۔ اس کا نام جو کوپ تھا۔ وہ اردو سروس کی کارکردگی سے بے حد خوش تھا۔ ایک روز اس نے ہمیں اپنے کمرے میں بلا کر ہمارے کام کی تعریف کی اور ہمیں کافی پلائی۔ مجھے جاپان کے اس فوجی ریڈیو شیشن پر کام کرتے دو مہینے گزر گئے۔ جاپان میں شدید سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ دوسرے تیسرے روز بر فباری ہو جاتی تھی۔ اسی دوران ہماری سروس میں مزید ایک ٹاپسٹ کی ضرورت پڑ گئی۔ کام

سے باہر آگئی اور کیپٹن فاروق کے پاس جا کر اسے تین بار جھک کر سلام کیا اور بڑے ادب سے کھڑی ہو گئی۔ جاپانی خزانچی نے کیپٹن فاروق کو ایک کانفہ دیتے ہوئے شکستہ انگریزی میں کہا کہ میجر صاحب نے رپورٹ کرنے کو کہا ہے۔

کیپٹن فاروق نے اس کے ہاتھ سے کانفہ لے کر پڑھا اور اس پر کچھ لکھ کر مہر لگائی اور جاپانی لڑکی سے انگریزی میں پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ لڑکی نے جھک کر کہا۔

”سر! میرا نام تو ییکو ہے۔ آکامی تو ییکو۔“

اس جاپانی لڑکی کو جس کا نام تو ییکو تھا فوجی ریڈیو سٹیشن کی اردو سروس میں بطور ٹائپسٹ ملازم رکھ لیا گیا۔ میری میز کیپٹن فاروق کے پہلو میں تھی۔ میرے ساتھ ہی تو ییکو کے لئے ایک چھوٹی سی میز ڈال دی گئی۔ میز پر ٹائپ مشین رکھ دی گئی۔ تو ییکو نے اسی روز سے کام شروع کر دیا۔

یہ جاپانی لڑکی تو ییکو بڑی کم گو اور خاموش قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے زرد چہرے پر ایک ایسی افسردگی تھی جو مسکراتے وقت بھی اس کے چہرے پر موجود رہتی تھی۔ وہ ٹھیک وقت پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دفتر میں آتی۔ گرم لمبا کوٹ اور اونٹنی ٹاپ اتار کر کرسی کے پیچھے دیوار پر لگی کھوئی پر لٹکاتی اور کرسی آگے کھینچ کر ٹائپ کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ اس کی سپیڈ حوالدار رام بھروسے کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ وہ کیپٹن فاروق کے ماتحت تھی۔ کیپٹن فاروق اسے ٹائپ کرنے کے لئے کام دیتا رہتا۔ اسی دوران اندر سے میجر زمان بھی اسے کسی وقت بلا لیتا۔ وہ سر جھکائے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میجر شاہ زمان کے کمرے میں چلی جاتی۔ آفس میں وہ کام کی بات کے سوائے کوئی فالتو بات کسی سے نہیں کرتی تھی۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش بھی نہیں تھی۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ رنگ زرد تھا۔ جسم میں بظاہر کوئی بیجان خیزی نہیں تھی۔ اردو اسے بالکل نہیں آتی تھی۔ دفتر میں اسے کسی سے بات کرنی ہوتی تو وہ انگریزی میں کرتی تھی۔ یہ میں نے دیکھا تھا کہ وہ آفس کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں انگریزی بڑی روانی سے بولتی تھی۔ اس کی چھوٹی سی میز میری میز کے پہلو میں تھی۔ اس کے لباس سے کسی قسم کی کوئی رومانی خوشبو بھی نہیں آتی تھی۔ ایک دن کیپٹن فاروق کو کسی جگہ آفس کے کام سے جانا تھا۔ اس نے تو ییکو کو ایک ڈرافٹ ٹائپ کرنے کے لئے دیا اور مجھ سے کہا کہ تم چیک کر لیتا۔ کیونکہ اس

کی تلاش میں جاپانی نوجوان بھی اور ادھیڑ عمر کے لوگ بھی اکثر آتے رہتے۔ ٹائپسٹ کی اسامی نکلی تو جاپانی اکاؤنٹ نے میجر زمان سے کہا کہ میری ایک رشتے دار کی بچی ہے۔ وہ بڑی اچھی ٹائپسٹ ہے۔ اس کی سپیڈ بھی بہت ہے۔ کسی بیک میں کام کرتی تھے۔ جو اب دیوالیہ ہو گیا ہے۔ اگر آپ آرڈر کریں تو میں اسے لے آؤں۔ وہ بڑا اچھا کام کرے گی۔

میجر شاہ زمان نے کہا۔

”لے آؤ چاچا لے آؤ۔“

دوسرے روز جاپانی اکاؤنٹ ایک دبلی پتلی زرد رنگ کی جاپانی لڑکی کو اپنے ساتھ لایا۔ جس نے لمبا گرم کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر اونٹنی ٹاپ تھی۔ ہمارے شاف کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جھک کر باری باری سب کو سلام کیا اور پھر جاپانی اکاؤنٹ کے ساتھ میجر زمان کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ صوبیدار دربارا سنگھ شیفت سے فلمی ریکارڈ نکال رہا تھا۔ حوالدار رام بھروسے اپنی چھوٹی سی میز پر بیٹھا بڑے مزے سے ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ ٹائپ کر رہا تھا۔ صوبیدار دربارا سنگھ نے ہنستے ہوئے حوالدار رام بھروسے سے کہا۔

”حوالدار تیری نوکری اب گئی۔ جتنی دیر میں تو ٹک ٹک کر کے ایک کانفہ ٹائپ کرتا ہے اتنی دیر میں دس کانفہ ٹائپ کرنے والی جاپانی لڑکی آگئی ہے۔“

حوالدار رام بھروسے نے کہا۔

”صوبیدار! فکر نہیں۔ اپنی نوکری بچی ہے۔ یہاں ٹائپ نہیں کروں گا تو یونٹ میں کواٹر گارڈ کی ڈیوٹی پر کھڑا ہو جاؤں گا۔“

کیپٹن فاروق نے اسے تسلی دی۔

”فکر نہیں حوالدار رام بھروسے۔ ہمیں دو ٹائپسٹ چاہئیں۔ تم ہمارے پاس ہی رہو گے۔“

حوالدار رام بھروسے نے صوبیدار دربارا سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سن لیا ہے کیپٹن صاحب نے کیا کہا ہے۔ اب آگے بولو۔“

دربار سنگھ نے ہنس کر کہا۔

”بھگوان نے تمہارا مفت راشن پانی لگا دیا ہے۔ اپنا عیش کرتے رہو۔“

اتنی دیر میں جاپانی لڑکی بوڑھے خزانچی کے ساتھ میجر شاہ زمان کے کمرے

کرتے ہوئے کہا۔

”تو ٹیکو! اب تم آفس میں ہماری ساتھی ہو۔ تم بار بار جھک کر سلام کرنے کا تکلف نہ کیا کرو۔“

اس نے اپنی وہی نسوانی آواز میں کہا۔

”سر! یہ ہمارا کلچر ہے۔ یہ ہمارے خون میں شامل ہے۔ سر! آئی ایم

سوری۔“

تو ٹیکو دفتر میں ادنیٰ ٹوپی اتار کر بیٹھتی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ ہلکا بادامی تھا اور وہ بالکل ہموار اور سیدھے تھے۔ ان میں کسی قسم کا بیج و تاب نہیں تھا۔ کانوں میں اس نے کبھی سفید موتی پہنے ہوتے تھے اور کبھی ہلکے کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پتھر چمک رہے ہوتے تھے۔ اس کا زرد چہرہ ہمیشہ میک اپ کے بغیر ہوتا تھا۔ جاپانی خزانچی دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ کسی میجر شاہ زمان کے کمرے کی طرف آتا تو تو ٹیکو اس کو دیکھ کر کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی، جھک کر سلام کرتی۔ جاپانی خزانچی بھی جھک کر اسے سلام کرتا۔ جاپانی زبان میں دونوں ایک آدھ بات کرتے، خزانچی میجر کے کمرے میں چلا جاتا اور تو ٹیکو دوبارہ اپنا کام کرنے لگتی۔ جاپانی زبان کا ایک لفظ بھی کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تو ٹیکو مجھے انگریزی بولتی بڑی اچھی لگتی تھی۔ بڑی رومانٹک لگتی تھی مگر جاپانی بولتے ہوئے وہ مجھے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہوتی تھی۔

اس سے اگلے روز تو ٹیکو دفتر آئی تو حسب معمول اپنا پرانا لمبا اور لیڈیز گرم کوٹ اور ادنیٰ ٹوپی اتار کر کھونٹی پر لٹکانے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر اپنے کانڈات دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے اس نے جھک کر کمرے میں موجود سب کو سلام کیا تھا۔ جو مجھے بے جا تکلف معلوم ہوا تھا مگر تو ٹیکو بلکہ ہر جاپانی اس معاملے میں مجبور تھا۔ ایک ہی آفس کے کارڈور میں اگر ان کا آپس میں چہ بار آنا سامنا ہوتا تو چہ کے چہ بار وہ جھک جھک کر ایک دوسرے کو سلام ضرور کرتے۔ پہلے ہمارے شاف کے لوگ بھی تو ٹیکو کے سلام کے جواب میں جھک جاتے تھے۔ اب کوئی ایسا نہیں کرتا تھا۔ بس ذرا سا گردن کا اشارہ کر دیتے تھے۔

میں کوئی فیچر لکھنے میں مصروف تھا۔ کیپٹن فاروق میجر کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ تو ٹیکو نے مشین پر کانڈ چڑھایا اور ٹک ٹک کر کے ٹائپ کرنی شروع کر دی۔ اس

میں کئی ہندوستانی فلموں کے اردو نام تھے۔ جنہیں رومن الفاظ میں لکھتا تھا۔ تو ٹیکو جب ٹائپ کر چکی تو اس نے مشین سے کانڈ باہر نکالا اور اٹھ کر کانڈ میرے آگے رکھا اور ذرا سا جھک کر انگریزی میں کہا۔

”سر! چیک کر لیں۔“

میں ٹائپ کیا ہوا کانڈ دیکھ رہا تھا اور وہ میرے قریب بڑے ادب سے کھڑی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

”تو ٹیکو! تم بیٹھ جاؤ۔ بے شک کرسی میرے قریب کر لو۔“

وہ جھک کر بولی۔

”یس سر۔“

اس نے کرسی میرے قریب کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی۔ حوالدار رام بھروسے اور صوبیدار دربارا سنگھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اس روز باہر بڑی بریلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ پارک نما کمرے کے وسط میں امریکن طرز کی بنی ہوئی بخارجی میں آگ دہک رہی تھی۔ مجھے پہلی بار تو ٹیکو کے گرم لباس میں سے کسی پرفیوم کی خوشبو آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

”تو ٹیکو! تم نے کونسا پرفیوم لگایا ہوا ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے شرماسی گئی۔ کہنے لگی۔

”سر! یہ میری چھوٹی بہن می ہو کو کا پرفیوم ہے۔ میں آفس آنے لگی تو اس نے میری جرسی پر لگا دیا۔“

میں نے کہا۔

”بڑا اچھا پرفیوم ہے۔ اپنی بہن سے اس کا نام ضرور معلوم کرنا۔“

”تھینک یو سر! ادکے سر!“

دوسرے دن وہ دفتر آئی تو میرے قریب اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”سر میں نے اپنی بہن سے پرفیوم کا نام معلوم کر لیا ہے۔“

اور اس نے مجھے پرفیوم کا جاپانی نام بتایا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے کہا کہ اسے کانڈ پر رومن لفظوں میں لکھ دو۔ اس نے چھوٹے سے زرد کانڈ پر پرفیوم کا نام رومن الفاظ میں لکھ کر بڑیے ادب سے اٹھ کر میرے آگے رکھ دیا اور ایک بار پھر جھک کر مجھے آداب کرتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا

نے آدھا صفحہ ٹائپ کیا ہو گا کہ اٹھ کر دیوار کی طرف گئی۔ اپنے کوٹ کی جیب میں سے چھوٹا سا گئے کا پیکٹ نکال کر میرے سامنے رکھا اور جھک کر انگریزی میں کہا۔

”سرا! میری چھوٹی بہن نے آپ کے لئے تحفہ بھیجا ہے۔“

میں نے قلم رکھ دیا اور تویکو کر طرف دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”سرا! کھول کر دیکھ لیں۔“

تویکو کے چہرے پر مخصوص افسردہ سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے پیکٹ کے گرد لپٹا ہوا سنری کاغذ الگ کیا۔ اندر ایک لمبوتری ڈبی تھی۔ اسے کھولا تو یہ پرفیوم کی شیشی تھی۔ شیشی پر جاپانی کے علاوہ رومن الفاظ میں بھی پرفیوم کا نام لکھا تھا۔ یہ وہی پرفیوم تھا جس کا نام تویکو نے مجھے لکھوایا تھا اور جس کی خوشبو کو میں نے پسند کیا تھا۔ میں نے تویکو سے کہا۔

”یہ تکلیف تم نے کیوں کی؟“

اس نے جھک کر مجھے آداب کیا اور بولی۔

”سرا! یہ میری بہن نے اپنی خوشی سے آپ کو تحفہ بھیجا ہے۔“

اور وہ ذرا سا جھکی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ٹک ٹک ٹک ٹائپ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

مجھے معلوم تھا کہ پرفیوم کی شیشی تویکو کی بہن نے نہیں بلکہ خود تویکو نے خرید کر مجھے دی ہے۔ وہ چھ ڈالر کی تھی اور یہ اس زمانے میں جاپان میں بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ تویکو کو بھی کوئی تحفہ میری طرف سے ضرور ملنا چاہئے۔ ہمیں امریکی فوجی ریڈیو شیشی میں بہت سولتیں میسر تھیں۔ سمندر پار کے الاؤنس کے علاوہ فوجی کینٹین میں سے ہر شے انتہائی سستے داموں مل جاتی تھی۔ جاپان میں چینی، لپٹن چائے، آسٹریلین شہد، چاول، ٹن بلک اور خالص کوئنگ آئیل کی شدید قلت تھی۔ ہمیں ہر ہفتے فوجی کینٹین سے راشن ملتا تھا۔ ہم جتنا چاہے سامان خرید سکتے تھے۔ میں نے ہفتے کے روز کینٹین میں سے چینی، شہد، چاول ٹن بلک اور امریکی کوئنگ آئیل وافر مقدار میں خرید کر اس کا بڑا ڈبہ پیک کروا کر کینٹین میں ہی رکھوا دیا۔ تیسرے پہر چار بجے جب تویکو چھٹی کر کے دفتر سے جانے لگی تو میں نے اسے کہا۔

”تمہاری چھوٹی بہن کے لئے میں نے اک تحفہ خریدا ہے۔ ملٹری کینٹین میں پڑا ہے۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔“

یہ کہہ کر میں تویکو سے پہلے دفتر سے نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ تویکو اوکو ہا شہر کے گنجان علاقے سے روزانہ دو بسیں بدل کر دفتر آتی ہے۔ وہ اتنا بڑا پیکٹ اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی۔ میں کینٹین کے باہر برآمدے میں ایک طرف سگریٹ سلگائے تویکو کا انتظار کرنے لگا۔

رات کو برفباری ہوئی تھی۔ اس وقت برف نہیں گر رہی تھی۔ آسمان پر بادل تھے۔ برف سخت ہو چکی تھی۔ امریکی بل ڈوزروں نے نمک ڈال کر سڑک پر سے برف صاف کر دی تھی۔ صرف کناروں پر برف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سرد اور برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے گرم امریکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جسم پر جہاں جہاں جیکٹ تھی وہاں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے تویکو کو دیکھا۔ وہ اپنا پرس دستانے والے ہاتھوں میں پیٹ کے ساتھ لگائے چھوٹے قدم اٹھاتے کینٹین کی طرف چلی آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ برآمدے میں آگئی۔ میں نے اس سے کہا۔

”تم یہاں ٹھہرو۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔“

میں نے اسے بتا دیا کہ تحفہ وزنی ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ بس میں رکھ کر نہیں لے جاسکے گی۔ ریڈیو شیشی کے احاطے کے باہر جاتے ہی مجھے خالی ٹیکسی مل گئی۔ میں اسے لے کر کینٹین پر آگیا۔ ڈرائیور کی مدد سے گروسری کے سامان والا بھاری پیکٹ ٹیکسی میں رکھوایا۔ جس علاقے میں تویکو کا گھر تھا اس علاقے کا نام مجھے معلوم تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو پانچ ڈالر دے کر کہا کہ وہ میڈم کو اس کے گھر پہنچا دے۔ تویکو تو میرا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہی تھی۔

”سرا! اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ سر آپ نے بڑی زحمت کی۔ سر میں کس طرح شکریہ ادا کروں۔“

وہ یہ کہتی ہوئی اور بار بار جھک کر مجھے سلام کرتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور ٹیکسی چل پڑی۔

اگلے روز اتوار تھی۔ مجھے ریڈیو شیشی کے فوجی احاطے میں ہی ایک بارک کا چھوٹا سا کمرہ رہنے کے لئے ملا ہوا تھا۔ اس میں ٹیلی فون بھی لگا تھا۔ اس لئے کہ

اس نے وہی پرانا گرم لیڈز کوٹ اور اونی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اکثر مکانوں کے باہر برف کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ تو ٹیکو نے جھک کر مجھے تین بار آداب کیا اور پوچھا کہ مکان تلاش کرنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ میں نے کہا۔ بالکل نہیں اب میں شہر کے سارے علاقوں سے واقف ہو گیا ہوں۔ ٹیکو نے لکڑی کے پٹی گاڑی سے نکال کر باہر رکھ دی۔ تو ٹیکو نے کہا۔

”یہ آپ نے کیوں تکلیف کی سر؟ اس کی کیا ضرورت تھی؟“

میں ان لوگوں کے لئے بہت سی چیزیں لے گیا تھا۔ ان میں چاول، گھی، چینی، چائے، چاکلیٹ، ٹن فروٹ اور میٹھے دودھ کے ڈبے، سارڈین مچھلی کے ڈبے اور تو ٹیکو کے والد کے لئے امریکی سگریٹ وغیرہ تھے۔ تو ٹیکو نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے والد کو امریکی سگریٹ بہت پسند ہیں۔ وہیں سے ایک مزدور مل گیا۔ پٹی اس کے سر پر رکھوائی اور ہم تو ٹیکو کے مکان کی طرف چلے گئے۔ ٹین اور لکڑی کی چھوٹوں والے ڈربہ نما مکانوں کے درمیان ایک تنگ سارستہ تو ٹیکو کے مکان کو جاتا تھا۔ ان کا مکان بھی ویسا ہی تھا جیسے وہاں دوسرے مکان تھے۔ تو ٹیکو کی بوڑھی ماں اور اس کا باپ دونوں دروازے پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے تین بار جھک کر آداب کیا۔ اندر دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ بانس کی دیواریں تھیں۔ فرش لکڑی کا تھا جس کے تختے صاف تھے مگر بوسیدہ ہو رہے تھے۔ کونے میں بانس کی تیلیوں والی چٹائی بھی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ بستر لحاف وغیرہ تہہ کئے ہوئے تھے۔ کمرے کے درمیان میں تھوڑی سی جگہ کھود کر انگیٹھی بنائی ہوئی تھی جس میں کونے دھک رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک لمبی چوکی اور چھ سات گدیاں آنے سامنے پڑی تھیں۔ جوتے میں بے وہاں کے رواج کے مطابق کمرے کے باہر ہی اتار دیئے تھے۔ میں نے گرم جرابیں پہنی ہوئی تھیں۔ پھر بھی لکڑی کا فرش ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ انگیٹھی میں دھکی ہوئی تھوڑی سی آگ کمرے کی شدید ٹھنڈ کو بڑی مشکل سے گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تو ٹیکو نے جلدی سے انگیٹھی کے ارد گرد گدیاں ڈال دیں۔ وہ لوگ دوزانو ہو کر اور میں آلتی پالتی مار کر آگ کے گرد بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک تو ٹیکو کی شکل کی مگر عمر میں اس سے ذرا چھوٹی لڑکی اندر آئی۔ جھک کر آداب بجا لائی۔ تو ٹیکو نے بتایا کہ یہ اس کی چھوٹی بہن می ہو کو ہے۔ جس کو وہ می ہو کہہ کر بلاتے ہیں۔ میں نے پٹی بکھلوا کر انہیں وہ چیزیں پیش کیں جو میں اپنے ساتھ لے گیا

میرا تعلق ریڈیو سٹیشن سے تھا اور ہماری کسی بھی وقت وہاں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اتوار کی صبح کو تو ٹیکو کا فون آیا۔ کہنے لگی۔

”سر! آپ نے اتنی ساری چیزیں دی ہیں۔ میری بہن، میرا باپ، میری ماں آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ سر! میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“

پیروار کو تو ٹیکو آئی تو اس نے مجھے ایک چھوٹا سا پیکٹ دیا۔ اس میں ایک ننھی سی جاپانی پیک کی ہوئی تھی۔ یہ گڑیا اتنی معصوم اور خوبصورت تھی کہ آج مجھے تک وہ نہیں بھولی۔ میں نے وہ گڑیا اپنے کمرے میں پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر سجا کر رکھ دی۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک روز تو ٹیکو نے چھٹی کے بعد مجھ سے کہا۔

”سر! میری ماں ڈیڈی نے اس اتوار کو گھر پر بلایا ہے۔ سر وہ چاہتے ہیں کہ اتوار کی شام کو آپ چائے ہمارے ساتھ پیئیں۔“

میں خود کسی جاپانی گھر میں چائے پینے کا خواہشمند تھا۔ میں نے جاپان میں چائے نوشی کی بڑی تعریف اور بڑی عجیب عجیب باتیں سن رکھی تھیں کہ جاپانی چائے نوشی کو ایک عبادت سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا۔

”میں ضرور آؤں گا۔ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتا دو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“

اگر آپ نے نئے نئے جاپان میں گئے ہوں اور کوئی آپ کو اپنے گھر کا ایڈریس بتائے بلکہ لکھا بھی دے تو آپ سارا شہر چھان ماریں آپ کو وہ گھر نہیں ملے گا۔ جر سے پوچھیں گے وہ جھک جھک کر آداب بجالائے گا اور آپ کو کسی دوسرے راتے پر ڈال دے گا۔ وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرے گا مگر زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے آپ یقیناً غلط راستے پر پڑ جائیں گے۔ میں جاپان میں اگرچہ نووارد نہیں تھا پھر بھی شہر کے گنجان علاقے میں نہیں گیا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میں پہنچ جاؤں گا۔ تو ٹیکو نے مجھے اتوار کے دن شام چار بجے آنے کو کہا تھا۔ میں ٹھیک تین بجے فوجی کینٹین سے کچھ چیزیں پیک کر داکر ٹیکسی میں سوار ہو کر نکل پڑا۔ ایک گھنٹے کی دربدری کے بعد ملہ تو ٹیکو کے محلے میں پہنچ گیا۔ یہ شہر کے مضافات کا علاقہ تھا۔ ایک پہاڑی کے دام میں بانس ٹین اور لکڑی کے ڈبہ نما مکان بنے ہوئے تھے۔ کچھ مکان پہاڑی کی ڈھلاؤ پر تھے۔ کچھ پہاڑی کے دامن میں چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے درمیان تھے۔ یہاں ایک پرانی خانقاہ تھی۔ تو ٹیکو نے کہا تھا کہ اس خانقاہ کے پیچھے ان کا مکان ہے۔ میں نے ٹیکسی خانقاہ کے دروازے کی ایک طرف کھڑی کی تو مجھے تو ٹیکو آتی دکھائی دی

تھا۔ بوڑھے ماں باپ جاپانی زبان میں بار بار سر جھکا کر شکریہ ادا کرتے نہیں جھکتے تھے۔ می ہو کو میں نے چاکلیٹ کے دو لمبے پیکٹ دیے اور انگریزی میں کہا۔
”یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں۔“

بہت جلد وہاں گھریلو سی فضا بن گئی۔ تو ییکو تو بڑی روانی سے انگریزی بولتی تھی۔ می ہو رک رک کر انگریزی میں اپنا منموم ادا کرتی تھی۔ اس کے بوڑھے ماں باپ تو سوائے جاپانی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ ان سے کوئی بات کرنی ہوتی تو میں تو ییکو کی وساطت سے کرتا تھا۔ ہمارے آگے می ہو نے چھوٹی چھوٹی لکڑی کی چوکیاں رکھ دیں۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی چینی کی پھولدار پیالیاں لا کر رکھ دیں۔ اس کے بعد وہ چائے کی چینک لائی جس پر بانس کی پتلی پتلی تیلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ چینک اس نے اپنے بوڑھے باپ کے آگے لا کر رکھ دی۔ بوڑھے جاپانی نے میری طرف دیکھ کر سینے پر ہاتھ باندھ کر تین بار بیٹھے بیٹھے جھک کر آداب کیا اور جاپانی میں کہا۔ تو ییکو نے اس کا ترجمہ کر کے کہا۔

”ڈیڑی تم سے چائے پیالوں میں ڈالنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔“

میں جاپانیوں کی چائے نوشی کی رسومات کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ میں نے کہا۔ اجازت ہے۔ بوڑھا بڑے ادب سے اٹھا اور اس نے جھک کر پیالیوں میں چائے ڈالنی شروع کر دی۔ چائے کا رنگ گہرا براؤن تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی جگہ پر آ کر اسی طرح دوڑا تو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی بھی اسی انداز میں بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ تو ییکو نے میرے کان میں آہستہ سے انگریزی میں کہا۔

”جب تک تم اپنی پیالی نہیں اٹھاؤ گے کوئی اپنی پیالی نہیں اٹھائے گا۔“

میں نے اپنی پیالی اٹھالی۔ می ہو، تو ییکو اور ان کے بوڑھے والدین نے بھی اپنی اپنی پیالیاں اٹھالیں۔ چائے کا ذائقہ کڑوا تھا مگر اس میں ایک خاص قسم کی دھیمی دھیمی خوشبو تھی۔ میں نے چائے کی تعریف کی تو بوڑھے جاپانی نے اپنی بیٹی تو ییکو کی طرف دیکھا۔ تو ییکو نے اپنی زبان میں اسے کچھ کہا۔ جسے سن کر دونوں بوڑھوں کے چہرے کھل گئے۔ میں تو ییکو سے انگریزی میں باتیں کرنے لگا۔ اس کے بوڑھے والد اور بوڑھی والدہ سے میری آنکھیں چار ہوتیں تو وہ نقشہ آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جھکا دیتے۔ یہ بڑا ہی تکلیف کی حد تک پر تکلف ماحول تھا۔ میں چائے کی دو پیالیاں پی چکا تو اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو ییکو! اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ بھی جانا ہے۔“

مجھے اٹھتا دیکھ کر تو ییکو کے ماں باپ بھی جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب تو ییکو کے والد نے امریکی سگریٹوں کا پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ سلا لیا تھا اور جھوم جھوم کر اسے پی رہا تھا اور جاپانی زبان میں بار بار کچھ کتا جاتا تھا۔ تو ییکو نے بتایا کہ ڈیڑی تمہارا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ میرے ساتھ مکان کے باہر تک آئے۔ باہر بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ تو ییکو میرے ساتھ میں روڈ تک جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے روک دیا اور اکیلا ہی چل کر مین روڈ پر آگیا۔ یہاں سے ٹیکسی پکڑی اور اپنی فوجی بارک کی طرف روانہ ہو گیا۔

دفتر میں تو ییکو کا میرے ساتھ رویہ ایسا ہو گیا کہ ٹائپ کرتے ہوئے کسی وقت میری طرف دیکھ کر افسردہ تبسم کے ساتھ مسکرا دیتی۔ مجھ سے بات کر رہی ہوتی اور اوپر سے کوئی آ جاتا تو چپ ہو جاتی۔ اسے پہلی تنخواہ ملی تو اس نے مجھے ایک جاپانی انڈی پن کا تحفہ دیا۔ اس کے جواب میں میں نے اس کے لئے ایک بڑی خوبصورت لیڈیز جرسی خریدی اور اس کا پیکٹ بنوا کر ڈیوٹی روم میں ڈیوٹی آفسر کے پاس رکھوا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دفتر سے نکل کر کون سے بس شاپ پر آتی ہے۔ میں دس منٹ پہلے دفتر سے نکل کر پیکٹ ہاتھ میں لئے بس شاپ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے بس شاپ پر دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا۔

”سر! کیا آپ کیس جا رہے ہیں؟“

میں نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تو ییکو! میں یہ چھوٹا سا تحفہ تمہیں دینا چاہتا تھا۔“

اس نے پیکٹ لے لیا اور میں خاموشی سے واپس آگیا۔ ہم بڑی رازداری اور خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔

صاف کر دی تھیں مگر فٹ پاتھوں پر برف کی موٹی تہ جی ہوئی تھیں۔ اس برف پر دو دن سے پیدل چلنے والوں نے ایک راستہ سا بنا دیا تھا۔ ہم برف پوش فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ٹی ہاؤس کی نیم گرم فضا میں پہنچ گئے۔ دروازے کے اندر ایک گیشا نے جھک کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس نے لمبی آستینوں والا کیمونو پہنا ہوا تھا۔ جاپانی عورتیں جو کیمونو پہنتی ہیں وہ تہہ در تہہ ہوتا ہے اور اس کے اندر جسم بہت دور چلا جاتا ہے۔ کیمونو کی تھوں کو آپ کھولتے چلے جائیں۔ آپ جسم تک ایک گھنٹے میں پہنچیں گے۔ ٹی ہاؤس کی فضا میں جاپان کی خانقاہوں میں سلگائی جانے والی آگریٹیوں کی بہت دھیمی سی مہک لمبی ہوئی تھی۔ کونوں میں گمرے رنگ کے ریشمی اور کانڈ کے فانوس روشن تھے۔ جن کی رومانیک اور مدہم روشنی زیادہ دور تک نہیں جاتی تھی۔ اندر امریکی اور جاپانی بیٹھے تھے۔ جن میں گیشائیں چائے کی چھوٹی چھوٹی بانس کی تیلیوں والی پیئیکس لئے بڑی شائستگی کے ساتھ بے آواز قدموں سے جھک جھک کر گاہکوں کو آداب بجالاتی چل پھر رہی تھیں۔ بڑا خواب ایسا ماحول تھا۔ زیادہ روشنی نہیں تھی۔ میں اس سے پہلے بھی یہاں تین چار مرتبہ چائے پینے آ چکا تھا۔ تو یہ تو بھی دو تین دفعہ اپنی سیہلی کے ساتھ یہاں آ چکی تھی۔ ہم ٹی ہاؤس کی گیلری میں دوسری طرف جھیل کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ کھڑکی کے بند شیشے سے جھیل پر پھیلی ہوئی دھند اور اس دھند کے پس منظر میں پتلے پتلے خوبصورت درخت سر نکال کر کھڑے نظر آ رہے تھے۔۔۔ ہماری میز سے کچھ دور کونے میں دیوار کے ساتھ لگا ہوا ریشمی فانوس روشن تھا جس کی روشنی ہماری میز تک آتے دھندلے اندھروں میں جذب ہو جاتی تھی۔

اس جاپانی ٹی ہاؤس کی فضا میں خانقاہوں والی اداس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی وقت کسی کی میز پر سے آدمیوں کے بولنے کی بہت مدہم آواز آ جاتی تھی جیسے خانقاہ کے گنبد کے اوپر کہیں کوہ تر بول کر چپ ہو گئے ہوں۔ مجھے ٹی ہاؤس کی یہ فضا ہی یہاں کھینچ کر لے آتی تھی حالانکہ جاپان کی روایتی کڑوی کیسی چائے مجھے اتنی زیادہ پسند نہیں تھی۔ تو یہ تو نے اس روز پرانے لمبے اوور کوٹ کی بجائے ٹائیلون کی جرسی اور سوئٹر پہن رکھا تھا۔ ٹی ہاؤس کی گرم فضا میں آ کر اس نے جرسی اتار دی تھی۔ اوٹی ٹوپی اور مظفر بھی اس نے اتار دیا تھا۔ دو گیشائیں ہماری میز کے پاس دبے پاؤں خواب میں نظر آنے والی خوبصورت عورتوں کی طرح آئیں اور جھک کر آداب

اوکو ہاما بڑا ماڈرن اور خوبصورت شہر تھا۔ جنگ کے دوران وہاں بمباری نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ اتنی اہمیت کا صنعتی شہر نہیں تھا۔ اس شہر کی عمارتوں اور خوبصورتی کو امریکی طیاروں کی بمباریوں نے تباہ نہیں کیا تھا۔ وہاں بڑی مارکیٹیں تھیں۔ تفریح گاہیں تھیں۔ ریستوران، کلب ہاؤسز، رقص گاہیں، ٹی ہاؤس اور بار تھے جو راتوں کو جگمگایا کرتے تھے۔ ایسے بار اور ڈانس کلبس بھی تھیں جو ساری ساری رات کھلی رہتی تھیں۔ ہمارے فوجی ریڈیو سٹیشن سے کچھ فاصلے پر اوکو ہاما کی ایک جھیل تھی جہاں ٹائٹ کلب بھی تھا اور ایک ٹی ہاؤس بھی تھا۔ یہ ٹی ہاؤس جھیل کے کونے میں ایک بڑے رومانیک اور پرسکون مقام پر واقع تھا۔ میں کبھی کبھی وہاں شام کے وقت چائے پینے چلا جاتا تھا۔ یہاں جاپانیوں کے خاص روایتی انداز میں گیشا عورتیں چائے پیش کرتی تھیں لیکن امریکیوں کی آمد کے بعد وہاں فرش نشینوں کی جگہ میز کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ کیونکہ مغرب اور خاص طور پر امریکیوں کے لئے زیادہ دیر تک گدیوں پر دوڑانو ہو کر بیٹھنا بہت وقت طلب کام تھا۔ کرسیوں میزوں کی وجہ سے وہاں غیر ملکی فوجی جو جاپان کی چائے کا ذوق رکھتے تھے، ہماری تعداد میں آنے لگے تھے۔

اس ٹی ہاؤس کا نام ٹی ہاؤس ہی تھا۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں یہاں جاپانی گیشائیں گاہکوں کو چائے پیش کرتی تھیں۔ یہاں جاپانی چائے نوشی کی قدیم روایت سے صرف اسی قدر انحراف کیا گیا تھا کہ گاہک فرش پر دوڑانو ہو کر نہیں بیٹھتے تھے اور گیشائیں چوکیوں کی بجائے پلاسٹک کی رنگ برنگ میزوں پر چائے پیش کرتی تھیں۔ ایک روز میں نے تو یہ تو کو ٹی ہاؤس میں چائے پینے کی دعوت دی جو اس نے ایک شرمیلی اداس مسکراہٹ سے قبول کر لی۔ اس روز دفتر سے مجھے بھی چھڑا تھا۔ تو یہ تو دن کے دس بجے جس بس شاپ پر بس سے اتری وہاں میں پہلے سے موجود تھا۔ آسمان رات ہی سے ابر آلودہ تھا۔ اوکو ہاما کی سڑکیں تو بل ڈوڑروں سے

انداز مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اس سے چائے سے محبت ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ چائے کی بت پرستی ہے۔ چائے جنگلوں میں چلنے والی ہمار کی آزاد ہوا ہے۔ ہم نے اسے خانقاہ کے بند حجرے میں قید کر دیا ہے۔ یہ چائے کے ساتھ سراسر بے انصافی ہے۔

توشیکو کی زبان سے چائے کی اس قدر رومانوی سی تعریف سن کر میں خوش بھی ہوا اور کچھ حیران بھی ہوا۔ کیونکہ اس سے پہلے اس نے کبھی اس طرح کی رومانیک باتیں نہیں کی تھیں۔ کہنے لگی

”اگلی اتوار ہم ایک اور جگہ چل کر چائے پیئیں گے۔ تم وہاں چائے کو اپنے اصلی اور نچل ماحول میں دیکھ سکو گے۔“

میں نے پوچھا۔

”کیا وہ بھی کوئی جاپانی ٹی ہاؤس ہے؟“

توشیکو نے کہا۔

”وہ ٹی ہاؤس بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ بس تم میرے ساتھ چلنا۔“

مجھے توشیکو کا یہ جملہ کہ تم میرے ساتھ چلنا برا اچھا لگا۔ میں نے کہا۔

”توشیکو! میرے لئے یہی خوشی بہت ہے کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔“

توشیکو شرما سی گئی۔ ہم اپنی اپنی پیالیاں اٹھا کر خاموشی سے چائے پینے لگے۔ چائے کا ذائقہ کڑوا تھا مگر میں جاپان کی چائے کا عادی ہو گیا تھا۔ چائے سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ توشیکو میرے پاس بیٹھی ہے۔ کھڑکی کا شیشہ باہر کی سردی کی وجہ سے دھندلا ہو رہا تھا۔

توشیکو نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

”باہر برف گرنے لگی ہے۔“

اس نے ٹشو پیپر سے شیشے کو اندر کی جانب سے صاف کیا تو مجھے باہر برف کے پھولوں کی پتیوں ایسے ننھے ننھے گالے گرتے نظر آئے۔ توشیکو گرتی برف کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”تھوڑی دیر میں شیشہ پھر دھندلا ہو جائے گا اور گرتی برف نظر آنی بند ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ خاص طور پر جب آدمی چائے پی رہا ہو تو برف گرتی ضرور نظر آنی چاہئے۔ جہاں میں لے جاؤں گی وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں ہمارے“

بجالاتے ہوئے ان میں سے ایک نے ہمارے آگے مینو کارڈ رکھ دیا۔ میں نے توشیکو کو بتا دیا تھا کہ ہم چائے پیئیں گے۔ وہاں چائے کے علاوہ سمندر کی بعض عجیب و غریب پھلیوں اور پھولوں کا شوربہ بھی ملتا تھا۔ توشیکو نے میز پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے گیٹھا سے جاپانی میں کچھ کہا۔ وہ مسکرا کر آداب بجالاتی چلی گئیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے ایک گیٹھا سفید پھولوں کی دو ٹہنیاں لے کر آ گئی۔ ایک پھول بڑے سلیقے سے اس نے میرے آگے بائیں جانب اور دوسرا پھول توشیکو کی بائیں جانب رکھ دیا اور پچھلے سے خود کو ہوا دیتے ہوئے مسکرا کر واپس چلی گئی۔ پھر دوسری گیٹھا آئی۔ وہ ہمارے آگے چائے کی چھوٹی چھوٹی پھولدار پیالیاں رکھ گئی۔ اس کے بعد دونوں آئیں۔ ایک نے چائے کی بڑی خوبصورت کیتلی اوپر سے اٹھا رکھی تھی۔ دوسری کے پاس سفید پھولوں کی دو ٹہنیاں تھیں۔ جن پر چھوٹے چھوٹے سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہماری پیالیوں میں چائے ڈالی گئی۔ پھر ٹہنیوں پر سے ایک ایک پھول توڑ کر ہماری پیالیوں کے سامنے اس طرح رکھ دیئے گئے کہ پھولوں کے چرے ہماری طرف تھے۔ اس کے بعد ان گیٹھاؤں نے دھیمی آواز میں عجیب قسم کے روم Rythem والا کوئی جاپانی گیت گنگانا شروع کر دیا۔ وہ تین بار ہاتھ جوڑ کر ہماری چائے کی پیالیوں کے آگے جھکیں اور پھر ہاتھ باندھے اٹے قدموں چلتی ٹی ہاؤس کی نیم روشن فضا میں واپس چلی گئیں۔ میں نے توشیکو سے کہا۔

”تم لوگوں نے چائے کو بہت پر تکلف بنا دیا ہے۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے ان پیالوں میں جو چائے پڑی ہے اس پر جادو کیا گیا ہے۔“

توشیکو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سرا! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

ہم چونکہ انگریزی میں بات کر رہے تھے اس لئے وہ آپ کی جگہ مجھ سے تم اور تو کہہ کر مخاطب ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے توشیکو کے مکالمے لکھتے ہوئے میں نے جہاں جہاں اس کی زبان سے آپ کا لفظ استعمال کروایا ہے اسے بھی درست کر لیجئے۔ یہ مجھے اب خیال آیا ہے اس لئے تصحیح کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ توشیکو کہہ رہی تھی۔

”میں خود جاپانی ہوں۔ میں اپنی مذہبی رسومات اور روایات کو تقدس کی نگاہ سے دیکھتی ہوں اور ان کا بڑا احترام کرتی ہوں مگر چائے کے معاملے میں یہ روایتی

ہماری چائے اور بر فباری کے درمیان کوئی شے حاصل نہیں ہوگی۔“

اگلی اتوار کو برف تو نہیں گر رہی تھی مگر موسم ابر آلود تھا اور سردی بہت شدید تھی۔ مکانوں کی ڈھلوان چھتوں پر اور سڑک کے کنارے برف جمی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کی آمدورفت بہت کم تھی۔ میں اور توئیکو دوپہر کے بعد بس سٹاپ پر آکر ملے۔ وہیں سے ایک بس میں سوار ہو کر نیچرل بیوٹی والے ٹی ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ یہ اوپن ایئر قسم کا ٹی ہاؤس ہوگا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ وہاں بہت سردی لگے گی کیونکہ ہم کھلی فضا میں بیٹھے ہوں گے مگر وہاں جا کر معلوم ہوا کہ یہ ٹی ہاؤس بانس کے پتلے پتلے اونچے اونچے درختوں کے درمیان ایک گرم پہاڑی چٹے کے پہلو میں واقع تھا۔ لکڑی کے در و دیوار تھے۔ لکڑی کی ڈھلوان چھت تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سامنے چھوٹے چھوٹے پتھروں والا صحن تھا جس کے درمیان میں گول چبوترے میں ایک سیاہ ٹینیوں والا پھیلا ہوا درخت تھا۔ توئیکو نے بتایا کہ یہ سبب کا درخت ہے۔ درخت کا رنگ سردی کی وجہ سے سیاہ پڑ چکا تھا اور اسکی ٹینیوں پر ایک بھی پتا نہیں تھا۔

ٹی ہاؤس ایک لمبوتر اکمرہ تھا۔ آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے میں گھلے تھے جس میں گل صد برگ نظر آ رہے تھے۔ میں انہیں گل صد برگ سمجھ رہا تھا، توئیکو نے کہا۔

”یہ گل صد برگ ہی کی قسم کا ایک پھول ہے جو صرف بر فباری کے موسم میں کھلتا ہے۔“

ٹی ہاؤس کے اندر فرش پر چٹائیوں کی بجائے درختوں کے بڑے بڑے ٹڈھ کاٹ کر سٹولوں کی طرح رکھے ہوئے تھے۔ میزوں کی جگہ بھی درختوں کے کٹے ہوئے تنے ہی سیدھے پڑے تھے۔ ایک جاپانی جوڑا ایک طرف بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ انہوں نے گرم جینیں اور ادنی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ کیونکہ کمرے کے آئنے سامنے والے دونوں دروازے اور کھڑکیاں کھلی تھیں۔ جن میں سے سرد ہوا اندر آرہی تھی۔ اندر کہیں آگ بھی نہیں جل رہی تھی۔ اندر بھی بڑے بڑے مرتبان نما گلوں میں وہی سرویوں میں کھٹنے والے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ ہم بھی ایک کھڑکے کے پاس کٹے ہوئے تنوں پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک جاپانی لڑکی گرم جری پنے آگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہمیں جھک کر خوش آمدید کہا۔ توئیکو نے اسے

جاپانی میں کچھ کہا۔ وہ مسکرائی اور جھک کر چلی گئی۔ توئیکو نے کہا۔

”یہاں چائے کے لئے چٹے کا تازہ گرم پانی استعمال ہوتا ہے۔“

جہاں ہم بیٹھے تھے اس کی کھڑکی لمبوتری تھی اور وہاں سے باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے بھی دستانے پہن رکھے تھے۔ کیونکہ وہاں کافی سردی تھی۔ بانس کے درخت نیچے سے لے کر اوپر تک بالکل سیدھے چلے گئے تھے۔ اوپر جا کر ان کی پھتیاں ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ توئیکو نے کہا۔

”یہ کورین بانس کے درخت ہیں۔ یہ اوپر جا کر گھنے ہو جاتے ہیں۔ نیچے ان کی جھاڑیاں نہیں بنتیں۔“

گرم چٹے کا پانی تین چار پتھروں کے اوپر سے ہو کر نیچے ایک چھوٹے سے تالاب میں گر رہا تھا۔ اس تالاب میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یہاں چٹے کے اوپر چیری کے چھوٹے قد کے درختوں کی بے برگ و بار شبنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی چھت سی پڑ گئی تھی۔ توئیکو نے کہا۔

”ہمارے دنوں میں جب چیری کے پھول کھلتے ہیں تو یہ منظر بڑا خوبصورت ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف فضا میں چیری کے پھولوں کی ہلکی دھیمی دھیمی بے معلوم سی خوشبو ہر وقت پھیلی رہتی ہے۔“

جاپانی لڑکی چائے لے کر آگئی۔ بانس کے ایک ٹرے میں چائے کی چٹیک، دو پیالیاں اور دو سفید پھل رکھے ہوئے تھے۔ ٹرے ہمارے سامنے درخت کے کٹے ہوئے تنے کے میز پر رکھ کر وہ چلی گئی۔ توئیکو نے ایک پھول مجھے دیا اور بولی۔

”یہاں یہ بات مشہور ہے کہ اس پھول کے ساتھ چائے کی شادی ہونے والی ہے اس لئے چائے کے ساتھ یہ پھول ضرور دیا جاتا ہے۔ ٹرے میں خالی چائے کبھی نہیں لے جاتی جاتی۔ اسے بدشگون سمجھا جاتا ہے۔“

اس نے چائے بنائی۔ چائے کا رنگ طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کی طرح سرخی مائل سنہری تھا۔ اس میں سے مجھے بانس کے جنگلوں کی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کا ایک گھونٹ پیا تو ایسے لگا جیسے باہر کی برف آلود سردی میں ایک گرم سورج میرے جسم کے اندر بھی طلوع ہو گیا ہو۔ میں نے چائے کی تعریف کی۔ توئیکو بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

”بادل گمرے سرمئی ہو گئے ہیں۔ ہوا بھی رک گئی ہے۔ لگتا ہے برف

گرنے والی ہے۔ اگر برف گرنے لگی تو ہم دوسری پیالی باہر چشمے کے پاس بیٹھ کر گرتی برف میں پیئیں گے۔ کیا تم برف باری میں میرے ساتھ باہر آ جاؤ گے؟“
میں نے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ بمباری میں بھی باہر آ جاؤں گا۔“

وہ ہنس پڑی۔ ہنسنے سے اس کے رخساروں میں ننھے ننھے سے گڑھے پڑ گئے جنہیں انگریزی میں ڈبل کہتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ میرے سامنے اس طرح کھل کر کبھی نہیں ہنسی تھی۔ یہ خوبصورت ڈبل میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے اچھے لگے۔ مجھے تو یقین بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح گلاب کی ہنسی پر کھلا ہوا سفید پاکیزہ پھول اچھا لگتا ہے۔ تو یقین کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ باہر برف گرنے لگی۔ پہلے ننھے ننھے سفید ذرے گرنے لگے۔ پھر سفید پھولوں کی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں کرنا شروع ہو گئیں۔ تو یقین نے خوش ہو کر کہا۔

”خدا نے میری دعا قبول کر لی۔ برف گرنے لگی ہے۔ اب ہم چائے کی دوسری پیالی چشمے کے پاس بیٹھ کر پیئیں گے۔“
میں نے کہا۔
”او کے۔“

ہم نے چائے کی چٹیک اور اپنی اپنی پیالی اٹھائی اور فی باؤس کے کانچ سے نکل کر چشمے کے پتھروں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے اوپر چھری کے بے برگ و بار ورختوں کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے برف کی بے آواز، بے وزن پنکھڑیاں ہم پر گر رہی تھیں۔

چشمے کا گرم پانی نیلے اور سبز پتھروں پر سے اچھلتا ہوا ایک چھوٹے سے تالے کی شکل میں ایک چوہے میں گر رہا تھا۔ پانی میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی کافی گرم تھا۔ تو یقین نے بتایا کہ یہاں کوئی نہاتا نہیں۔ کیونکہ پانی بڑا گرم ہے۔ آگے جا کر جہاں یہ پانی ایک تالاب میں گرتا ہے وہاں لوگ نہانے کے لئے آتے ہیں۔ مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی مگر تو یقین پر میں ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ ویسے وہاں ماحول بڑا رومانٹک تھا۔ برف گر رہی تھی۔ اور ہم گرم چشمے کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ برف کی کوئی پنکھڑی چائے کی پیالی میں گرتی تو گرتی ہی چائے میں حل ہو جاتی۔ ہماری ہینٹوں پر بھی برف جمع ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر ہم

وہاں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اندر آ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ اندر کی فضا باہر کے مقابلے میں اب پرسکون اور گراہٹ والی محسوس ہونے لگی تھی۔ تو یقین کہہ رہی تھی۔

”تمہیں برف باری میں چشمے کے پاس بیٹھ کر چائے پینا کیسا لگا؟“

میں نے کہا۔ ”میں نے بہت انجوائے کیا ہے۔“

تو یقین کہنے لگی۔

”آپ چائے بنا رہے ہوں اور باہر برف گرنے لگے تو اسے بڑا نیک ٹھونک سمجھا جاتا ہے۔ یہ ساری چائے کی روایت ہمارے ہاں چین سے آئی ہے۔ بلکہ ہمارے آبا و اجداد جب چین کی سرزمین سے نکل کر کوریا اور جاپان کے جزیروں میں آ کر آباد ہو گئے تھے تو دوسری روایات کے علاوہ چائے کی روایت بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم نے چائے نوشی کو اپنی مذہبی رسومات میں شامل کر لیا ہے۔ چائے تو اپنے باغ کی، اپنے باغ کے جنگل کی آزاد خوشبو ہے۔ ہم نے اسے قید میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مگر خوشبو کو کون قید کر سکتا ہے۔“

تو یقین نے مجھے دو تین جاپانی نظموں کا ترجمہ کر کے بھی سنایا جن میں شاعر نے چائے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہمیں چائے کے پاؤں سے مذہبی رسومات کی زنجیریں کاٹ کر اسے آزاد کر دینا چاہیے۔ برف گر رہی تھی جب ہم اس نیچرل فی باؤس سے نکل کر مین روڈ کی طرف پیدل چل پڑے۔ ہمیں کافی دور جا کر خالی ٹیکسی ملی۔ تو یقین اپنے محلے کے باہر ہی ٹیکسی سے اتر گئی۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ جھک رہے تھے کہ میں اپنی بارک میں واپس پہنچا۔ اس روز ساری رات برف گرتی رہی۔

ایک بلبل آڑو کے درخت کی ٹنٹی پر سے اڑا تو ٹنٹی پر سے سفید پھولوں کی پتیاں ہم پر گریں۔ میں نے تو ٹیکہ سے کہا۔

”اگر تمہیں میری بات بری لگی ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

تو ٹیکہ نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر نظریں جھکا کر پیالیوں میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

”نوسر۔ نو۔“

تو ٹیکہ نے مجھے اجازت دے دی تھی۔ میں اپنی روایتی گرم جوشی کے ساتھ اس سے محبت کی باتیں کرنے لگا۔ یہاں تک کہ میری انگریزی ختم ہو گئی۔ انگریزی پیچھے رہ گئی اور محبت آگے نکل گئی۔ میں بھی اپنی محبت کے ساتھ آگے نکل گیا اور میں نے تو ٹیکہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔ یہ کوئی اپنا ملک نہیں تھا کہ لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں منانا پکڑا جاتا۔ جاپانی معاشرے میں اس قسم کی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اس بات کو بڑا رومانٹک تصور کیا جاتا تھا کہ ایک نوجوان لڑکا اپنی نوجوان محبوبہ سے اظہار محبت کرتے ہوئے اس کا ہاتھ چوم لے۔ تو ٹیکہ کا ننھا سا زرد ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور دفتر کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے تو ٹیکہ سے بالکل نہیں پوچھا تھا اور نہ یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں؟ میں نے کبھی کسی گیندے گلاب یا موتے کے پھول کو چومنے کے بعد اس سے یہ نہیں پوچھا تھا اور نہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ جس طرح میں اس سے محبت کرتا ہوں کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟ میں ساری ساری رات صبح کو طلوع ہونے والی سورج کی پہلی کرن کی محبت میں آہیں بھرتا ہوں اور جب مشرقی افق پر سورج کی پہلی کرن نمودار ہو کر میری طرف مسکرا کر دیکھتی ہے تو میں آنکھیں بند کر کے اسے چوم لیتا ہوں مگر اس کرن سے کبھی نہیں پوچھا کہ کیا وہ بھی مجھ سے اسی گرم جوشی سے محبت کرتی ہے؟ محبت بدلے میں کچھ نہیں طلب کرتی۔ یہ گنام جنگلوں میں کھلنے والے پھول کی طرح ہے جو اس بات سے بے نیاز ہو کر اپنے بھرپور نقش و نگار کے ساتھ کھلتا ہے کہ کوئی اسے دیکھنے والا ہے یا نہیں۔

ہم نے ایک دوسرے کو محبت بھرے رقعے لکھنے شروع کر دیے۔ میں نے تو ٹیکہ کو پہلا محبت بھرا رقعہ لکھا اور تب کر کے سب کی نظریں بچا کر اس کے پاس

وقت گذرتا چلا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری اور تو ٹیکہ کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ یہ دوستی محبت میں بدل گئی۔ ہماری آنکھیں ایک دوسرے کی محبت کا اعتراف کر رہی تھیں، اقرار کر رہی تھیں مگر زبانیں خاموش تھیں۔ سردیوں کا موسم گذر گیا۔ بہار کا موسم آ گیا۔ چیری کے پھول کھل گئے۔ ہفتے میں ایک بار ہم دونوں کسی نہ کسی بس شاپ پر ملتے اور پھر کسی پارک میں بیٹھ کر باتیں کرتے یا کسی ریسٹوران میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ ایک روز ہم اسی ٹی ہاؤس میں گئے جہاں ہم نے برہاری میں چشمے کے پاس بیٹھ کر چائے پی تھی۔ چشمے والا چیری کا درخت پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ چیری کے پھول کنول کے پھولوں کی طرح ٹہنیوں پر کھلے ہوئے تھے اور ان پر بھونرے منڈلا رہے تھے۔ فضا میں چیری کے پھولوں کی عجیب سی دھیمی دھیمی طلسمی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جانب آلوچے اور آڑو کے درخت تھے۔ وہ بھی سفید اور پیازی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے بید کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم نے وہاں بیٹھ کر چائے منگوالی۔ اس روز اس نیچرل ٹی ہاؤس کی فضا واقعی نیچرل لگ رہی تھی۔ ہمارے اوپر ایک جانب آلوچے کا سفید پھولوں سے لدھا ہوا درخت تھا اور دوسری جانب آڑو کا درخت تھا جس کی ٹہنیاں ہمارے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ کوئی چڑیا یا بلبل درخت کی ٹنٹی پر آ کر بیٹھتی یا بیٹھنے کے بعد اڑ جاتی تو ہم پر پھولوں کی پتیاں گرنے لگتیں۔ ایسے رومانٹک ماحول کا تقاضا تھا کہ میں سوائے محبت کے اور کوئی بات نہ کروں۔ چنانچہ اس روز پہلی بار میں نے تو ٹیکہ سے کہا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اظہار محبت کے وقت میں نے اس کا چھوٹا سا زرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ تو ٹیکہ نے شرما کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور چیری کے درخت کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

”تو ٹیکہ! تم نے میری بات کا برا تو نہیں مانا؟“

تو ٹیکہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چیری کے درخت کی طرف دیکھتی رہی۔

باہر بارش کا منظر دیکھتے۔ ابھی برف گرنی شروع نہیں ہوئی تھی کہ اچانک تو شیدو بیمار پڑ گئی۔ میں اس کی خبر لینے اس کے گھر گیا۔ وہ چٹائی پر کبل اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ اور چھوٹی بہن بھی اس کے پاس بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ تو شیدو کے گلے میں تکلیف ہے جس کی وجہ سے اس کی آواز بند ہو گئی ہے۔ میں اس کے لئے پھولوں کا کلدستہ اور گیت ویل کا بڑا خوبصورت کارڈ اور اس کے باپ کے لئے امریکی سگریٹوں کا کارٹن ساتھ لے کر گیا تھا۔

تو شیدو دو تین دن کے اندر کمزور ہو گئی تھی۔ چہرہ پہلے سے زیادہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ چہرے پر ہلکا سا افسردہ تبسم نمودار ہوا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے تو شیدو کی بہن سے کہا کہ ہم اسے فوجی ہسپتال میں داخل کرائیں گے۔ وہاں اس کا علاج بھی صحیح طریقے سے ہو گا اور سارے ٹیسٹ وغیرہ بھی ہوں گے۔ اگرچہ تو شیدو ہمارے فوجی ریڈیو کی باقاعدہ ملازم نہیں تھی اور کنٹرکٹ پر ملازم تھی اور اسے اتنی زیادہ طبی سولتیں بھی میسر نہیں تھیں لیکن میرے اور کیپٹن فاروق اور میجر شاہ زمان کے اصرار پر ریڈیو سٹیشن کے امریکی انچارج نے تو شیدو کے لیے امریکی میرن کے ہسپتال میں علاج کی تمام سولتوں کی اجازت دے دی۔ تو شیدو کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ تو شیدو کے گلے کا زرخہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ میں روز شام کو اس کا حال پوچھنے پھول لے کر ہسپتال آتا۔ تو شیدو مجھے اداس نظروں سے دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بننے لگتے۔ اس کی چھوٹی بہن می ہو اس کے پاس سر جھکائے بیٹھی ہوتی۔ بوڑھے ماں باپ فرش پر بیٹھے اپنی بیٹی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے۔ 1947ء کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان کے قیام کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور چودہ اگست کو پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا۔ برٹش آرمی کی مسلمان یونٹوں کو کراچی روانہ کرنے کے انتظامات شروع ہو گئے تھے۔ اوکوہاما کا فوجی ریڈیو سٹیشن بھی ختم کیا جا رہا تھا۔ ایک روز ہمیں آرڈر ملا کہ اپنا سامان باندھ کر گیریزن کمناڈر کو رپورٹ کر دو۔ میں نے فوجی سٹیشن ویگن پکڑی اور سیدھا تو شیدو کے پاس ہسپتال آگیا۔ میں نے اسے بالکل نہ بتایا کہ میں جاپان سے جا رہا ہوں۔ اس کی بہن می ہو کو ایک طرف لے جا کر

میں ڈال دیا۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد تو شیدو ایک فائل اٹھا کر میرے پاس آئی اور فائل کھول کر مجھ سے کچھ پوچھنے لگی۔ اس دوران اس نے فائل میں سے زرد رنگ کا تہ کیا ہوا چھوٹا سا خط میری طرف کھسکا دیا۔ خط کے اوپر چیری کے پھول کا ہاتھ سے خاکہ سا بنا ہوا تھا۔ نیچے انگریزی میں کسی جاپانی شاعر کی نظم کے چار مصرعے ترجمہ کر کے لکھے ہوئے تھے۔

”برفباری نے مجھے روک لیا ہے۔

میرے شہر کی فحش نظروں سے اوجھل ہے۔

مجھے اس پھول کی تلاش ہے۔

جو برفباری میں کھلتا ہے۔“

نہ اوپر نام لکھا تھا اور نہ نیچے تو شیدو نے اپنا نام لکھا تھا۔ دو تین ہفتوں کی اس خفیہ مگر بڑی اہم رومانوی خط و کتابت کے بعد ہم نے خطوں پر ایک دوسرے کا نام لکھنا شروع کر دیا۔ تو شیدو اب زرد رنگ کے بڑے خوبصورت کانڈوں پر خط لکھتی۔ جس روز ہم شہر کے کسی پارک یا کسی ریستوران میں ملتے تو ایک دوسرے کے خطوں کے بارے میں بھی باتیں کرتے۔ ہمارے دن زیادہ خوبصورت اور راتیں زیادہ روشن ہو گئیں۔ مجھے آج تک یاد نہیں ہے کہ کبھی تو شیدو نے مجھے یہ کہا ہو کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ پہلے دن کے اظہار محبت کے بعد میں نے بھی اسے کبھی نہیں کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ہماری مثال تو ایسی تھی جیسے دو بچے بارش ہوتی دیکھ کر گلی میں نکل آئے ہوں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بارش میں دوڑتے چلے جا رہے ہوں۔ بارش! بارش! محبت! محبت! محبت! محبت میں سر سے پاؤں تک بھیگ رہے ہیں اور دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ بارش اپنی بارش آپ ہے۔ محبت اپنی خوشی آپ ہے۔ بارش کو بارش سے کون چھین سکتا ہے۔ محبت کو محبت سے کون جدا کر سکتا ہے۔ بارش پہلے آپ بھیگتی ہے پھر سب کو شرابور کر دیتی ہے۔ محبت خود ہی آواز دیتی ہے اور خود ہی اپنی آواز کا جواب دیتی ہے۔ وہ اپنے سوال کا آپ ہی جواب ہے۔

جاپان میں ہمارا موسم بھی گزر گیا۔ پت جھڑکا موسم شروع ہو گیا۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرنے لگے۔ پھر بارشیں شروع ہو گئیں۔ میں اور تو شیدو کسی ریستوران یا کافی ہاؤس میں اس کی کمزری کے پاس بیٹھ کر

رہ عہدے دار بھی تھے۔

ہم نے دلی کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں جا کر رپورٹ کی تو معلوم ہوا کہ وہاں بھارت کی فوجی ہائی کمانڈ کا راج ہے۔ مرہٹہ، گورکھا اور جاٹ ریشٹوں کے ہندو بی ہمیں گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ابھی بھارت کے آزاد ہونے اور پاکستان کی آزاد مملکت کے قیام میں ایک مہینہ باقی تھا مگر عملی طور پر بھارت میں ہندو کانگریس کا راج قائم ہو گیا ہوا تھا۔ جگہ جگہ ترنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ دلی میں فسادات شروع ہو چکے تھے اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے مکانوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ شہر کے گنجان محلوں میں سے مسلمان جانیں بچا کر جو دلی کے پرانے قلعے میں پہنچ گئے تھے وہی زندہ بچے تھے باقیوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے ہید کر دیا تھا۔ یہ ساری رپورٹیں ہمیں فوجی ہیڈ کوارٹر میں ملیں۔ معلوم ہوا کہ ہمیں دوسرے مسلمان یونٹوں کے ساتھ بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے کراچی پہنچایا جائے اگر یہ جہاز ایک ماہ بعد بمبئی سے روانہ ہو گا۔

میں جلدی سے جلدی امرتسر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے پاس پہنچنا اپنا تھا۔ کیونکہ پنجاب میں بھی حالات انتہائی نازک صورت اختیار کر چکے تھے۔ میں نے فوجی ہیڈ کوارٹر کی بارک میں ہی ایک مسلمان لاٹمری سے معلوم کر لیا تھا کہ دلی سے مشرقی پنجاب کی طرف ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔ اس نے بتایا کہ ایتلے تک تو کوئی خطرہ نہیں ہے مگر اس کے آگے گاڑیوں پر ہندو سکھوں کے جتنے حملے کر رہے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بار بار امرتسر میں مقیم اپنے گھر والوں کا خیال آتا کہ خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ امرتسر میں ریلوے طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ آخر میں نے ٹرین کے ذریعے امرتسر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ کمانڈنگ آفیسر کو رپورٹ کرنے کی اب ضرورت نہیں تھی۔ ایک طرح سے ہم مسلمان فوجی فوج سے ریلیز ہو چکے تھے۔ میں نے کسی کو کچھ نہ بتایا۔ ایک فوجی ٹرک کی ہندو قتل کا سامان لے کر ریلوے اسٹیشن جا رہا تھا۔ میں اس میں بیٹھ کر دلی کے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔

ریلوے اسٹیشن پر وہ پہلے والی روٹ نہیں تھی۔ ہر طرف ایک ویرانی سی اس رہی تھی۔ اسٹیشن پر جگہ جگہ ترنگے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ہندو کانگریسیوں کا ایک جلوس بھارت ماتا کی جے۔ ہندوستان زندہ باد۔ پاکستان مردہ باد کے نعرے لگاتا

بتا دیا کہ ہمیں کوچ کے آرڈر مل گئے ہیں اور ہو سکتا ہے آج شام اوکوہاما سے روانہ ہو جائیں۔ لاہور کا ایئر لیس لکھا اور ورق الگ کر کے می ہو کو دے کر کہا۔
”مجھے تو شید کی خیریت کی خبر اس پتے پر خط لکھ کر دیتا۔ مجھے اس کی بڑی فکر رہے گی۔“

می ہو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کانڈلے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ میں تو شید کے بستر کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بوڑھے ماں باپ سر جھکائے جیسے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ تو شید کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا چہرہ چیری کے پھول کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ نرس نے جھک کر میرے کان میں کہا۔
”وہ سو رہی ہے۔ اسے جگانا نہیں۔“

میں نے گہری دیکھی۔ مجھے دس منٹ میں واپس ریڈیو اسٹیشن پہنچنا تھا جہاں سے ہمارے کارکنوں کو اوکوہاما کے فوجی گیریزن میں جا کر گیریزن کمانڈر کو رپورٹ کرنی تھی۔ میں نے تو شید کا چھوٹا سا زرد ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے چوما اور تیزی سے وارڈ سے باہر نکل گیا۔ تو شید کا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ جیسے برنباری میں آلوچے کے درخت کی شبنمیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ وہاں سے اسٹیشن ویگن میں بیٹھ کر ملٹری گیریزن پہنچا تو معلوم ہوا کہ میجر شاہ زمان، کمپنن فاروق اور اردو سروس کے دوسرے مسلمان فوجی کارکنوں کو لے کر ایک ٹرانسپورٹ طیارہ نکلنے روانہ ہو چکا ہے۔ دوسرا طیارہ ایک گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ وہیں فوجی ایرپورٹ پر بیٹھا رہا۔ خیال تو شید کی طرف تھا۔ خدا جانے وہ کس حالت میں ہو گی۔ ایک گھنٹے بعد دوسرا فوجی ٹرانسپورٹ طیارہ دن دے پر آکر لگ گیا۔ میرے ساتھ پنجاب یونٹ کے کچھ مسلمان فوجی بھی تھے۔ طیارے کو سنگاپور سے ہو کر نکلنے اور وہاں سے دلی جانا تھا۔ ہمیں دلی ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کرنی تھی۔ طیارہ ٹیک آف کر گیا۔

مجھے یاد نہیں یہ پرواز کتنے گھنٹوں کی تھی۔ جولائی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں یہ بھری برسات کا زمانہ ہوتا ہے۔ نکلنے تک طیارہ بادلوں اور بارش میں پرواز کرتا رہا۔ نکلنے میں بھی بادل چھائے ہوئے تھے اور رات کو بڑی بارش ہوئی تھی۔ سڑکیں گیلی تھیں۔ ایرپورٹ پر ایک گھنٹہ رکتا پڑا۔ اس کے بعد دلی کی طرف پرواز کر گئے۔ دلی میں دھوپ نکلی ہوئی تھی اور موسم جس آلود تھا۔ ایک دن پہلے دلی میں بھی موسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ میرے ساتھ پنجاب یونٹ کے دس

عورتوں، مردوں اور بچوں کا ایک ہجوم پہلے سے بیٹھا تھا۔ یہ میرٹھ شہر کے مسلمان تھے جو جائیں بچا کر میرٹھ کے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ایسا ہی ہجوم میں نے انبالہ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر دیکھا۔ مسلمان برقعہ پوش خواتین اپنے بچوں اور مردوں کے ساتھ جگہ جگہ سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔

ٹرین انبالے سے چل کر مشرقی پنجاب میں داخل ہوئی تو دونوں جانب کھیتوں میں ویرانی برس رہی تھی۔ کسی جگہ کوئی کسان کام کرتا یا بل چلاتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک گاؤں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ جیسے جیسے ٹرین آگے بڑھتی گئی حالات زیادہ سنگین شکل اختیار کرتے گئے۔ ریلوے لائن کے ساتھ جتنے گاؤں نظر آئے ان میں یا تو آگ لگی ہوئی تھی یا ویران پڑے تھے۔ صرف سکھ کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔

لدھیانے پہنچ کر ٹرین دیر تک رکی رہی۔ پلیٹ فارم پر سکھ ہی سکھ بھر رہے تھے۔ وہ جھماک جھماک کر ڈبوں میں دیکھتے اور پھر آگے چل دیتے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے ٹرین کے ذریعے امرتسر پہنچنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ میری جان لے سکتا ہے۔ میں دل میں کلمہ شریف پڑھنے لگا کہ یا اللہ مجھے خیریت سے امرتسر پہنچا دے۔ ٹرین لدھیانہ شہر کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھی۔ ڈبے کی کھڑکی میں سے جو تین چار سڑکیں نظر آئیں وہ ویران پڑی تھیں اور کہیں کہیں پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ کسی نے کہا۔ ”یہاں بھی کرنیو لگا ہوا ہے۔“

ہر طرف وحشت برس رہی تھی۔ شہر میں کہیں کہیں دھواں اٹھ رہا تھا۔ جالندھر آ گیا۔ یہاں پلیٹ فارم پر پولیس کے سپاہی موجود تھے۔ سکھ ایک طرف کھڑے کرپائیں اور کٹواریں لہراتے ہوئے پاکستان مردہ باد اور ست سری اکال کے نعرے لگا رہے تھے۔ جالندھر سے امرتسر چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں دعائیں مانگنے لگا، یا خدا یہ راستہ خیریت سے سٹ جائے۔ میں کسی طرح زندہ سلامت گھر پہنچ جاؤں۔

جالندھر سٹیشن پر ٹرین دو تین منٹ ہی ٹھہری اور چل پڑی۔ جالندھر اور کرتار پور کے درمیان ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور تک کئی ہوئی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ سب لوگ ان لاشوں کو دیکھ کر سہم گئے۔ کئی نے کھڑکیاں بند کر دیں ایک دھوئی پوش ہندو نے کہا۔

سٹیشن کے سامنے سے گزرنے لگا۔ میں خاکی وردی میں تھا۔ کاندھے کے ساتھ خاکی تھیلا لٹک رہا تھا۔ میں دوسری طرف سے ہوتا ہوا سٹیشن کی لابی میں آ گیا۔

انکوائری سے معلوم ہوا کہ کلکتے سے ایک میل ٹرین آرہی ہے جو لاہور جائے گی۔ میں نے دلی سے امرتسر تک کا تھرو کلاس کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر آ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ پلیٹ فارم پر کئی سکھ اپنے بال بچوں اور سامان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ تحصیل حافظ آباد، راولپنڈی اور جہلم کے علاقے کے شرنا رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پلیٹ فارم کی فضا بڑی کشیدہ تھی۔ ان میں ہندو شرنا رہتے بھی تھے۔ یہ لوگ دلی کے ہندوؤں اور سکھوں کو جو ان سے ملنے آئے ہوئے تھے، ہندو بسکھوں کے قتل کی جھوٹی سچی باتیں سنا رہے تھے۔ مجھے ایک مسلمان قتل نے بتایا کہ خوف کے مارے سٹیشن پر کوئی مسلمان نہیں آتا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھنے کی بجائے سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں چلا جاؤں۔ چنانچہ میں پلیٹ فارم سے اٹھ کر سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں آ گیا۔ یہاں ایک بوڑھا انگریز پہلے سے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایک سکھ فیملی بھی تھی۔ میں بید کے بیچ پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور ایک اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اخبار ہندو مسلم فسادات کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ پنجاب میں حالات زیادہ خراب تھے۔ امرتسر میں ہر طرف آگ لگنے اور قتل عام کی خبر بھی تھی۔ اس کو پڑھ کر میں بہت پریشان ہو گیا۔ دل کی چیخاٹا تھا کہ کسی طرح اڑ کر امرتسر پہنچ جاؤں۔

کافی دیر بعد پلیٹ فارم میں کسی ٹرین کے داخل ہونے کا شور سنائی دیا۔ معلوم ہوا لاہور جانے والی گاڑی آگئی ہے۔ میں ویٹنگ روم سے باہر نکل آیا۔ ٹرین میں پہلے ہی سے کافی رش تھا۔ میں تھرو کلاس کے ایک ڈبے میں کسی نہ کسی طرح سوار ہو گیا۔ ٹرین دلی سٹیشن پر کافی دیر تک رکی رہی۔ ڈبے میں رش کی وجہ سے کافی گرمی اور جس تھا۔ مسافروں میں سکھ بھی تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنی دھوتیاں اور تنگ پاجاموں سے ہی پہچانے جاتے تھے۔ آخر ٹرین دلی سٹیشن سے چل پڑی۔ میں ڈبے میں دروازے کے پاس ایک صندوق پر بیٹھا تھا۔ ٹرین چلی تو اندر ٹھنڈی ہوا آنے لگی۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹرین نے دلی شہر سے نکلتے ہی سپیڈ بکھری۔ کھیتوں میں کسان مل چلائے دکھائی دے رہے تھے۔

یہاں حالات نارمل محسوس ہو رہے تھے۔ ٹرین میرٹھ پہنچی تو یہاں مسلمان

”ان مسلمانوں کو پاکستان بنانے کی سزا مل رہی ہے ماراج۔“

میں دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی نے دروازے کی کھڑکی بند نہ کی بلکہ کئی مسافر وہاں سے گردنیں باہر نکال کر لاشوں کو دیکھنے لگے۔ ان میں عورتوں کی لاشیں بھی تھیں۔ بچوں کی لاشیں بھی تھیں۔ سامان جھاڑیوں اور سڑک پر جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ مسلمان مہاجرین کا قافلہ تھا جو پاکستان کی طرف جا رہا تھا کہ اسے ہندو سکھوں کے جتھے نے راستے میں ہی قتل کر دیا۔ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا۔ ڈرائیور نے یہاں گاڑی کی رفتار تیز کر دی تھی۔ ڈبے میں سکھ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے مسافر یقیناً ”ہندو“ ہی تھے۔ کیونکہ وہ پاکستان کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ اندر سے میں سخت ڈرا ہوا تھا۔ ٹرین نے دو تین چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑ دیئے۔ پھر اس کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ میں ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہندو سکھ مسافروں کو بھی سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور باہر بھی دیکھ لیتا تھا۔ امرتسر شہر کے باہر کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ امرتسر آ رہا تھا۔ میرا شہر آ رہا تھا۔ مجھے اپنے شہر کے کھیت اور کھیتوں کے ٹیوب ویل اور ریل کے پھانک دیکھ کر حوصلہ ہونے لگا۔ میری بائیں جانب امرتسر کے مشہور علاقے شریف پورہ کی آبادی شروع ہو گئی۔ یہ ساری کی ساری امرتسری مسلمانوں کی آبادی تھی۔ میں نے مکانوں کی چھتوں پر کچھ نوجوانوں کو ہالیاں اور ڈنڈے لہراتے دیکھا تو محسوس ہوا کہ میں اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ اب کوئی ہندو یا سکھ مجھے قتل کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

ٹرین شریف پورے والا ریلوے پھانک پار کر کے عید گاہ والی دیوار کے پاس رک گئی۔ آگے سگنل ڈاؤن نہیں تھا۔ ایک دم مجھے خیال آیا کہ امرتسر پر خطرہ ہو گا مجھے یہیں اتر جانا چاہیے۔ دروازے کے آگے رکھے ہوئے بھاری صندوق کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے پہلے اپنا تھیلا نیچے پھینکا۔ پھر خود نیچے چھلانگ لگا دی۔ تھیلا اٹھا کر کاندھے سے لٹکایا اور عید گاہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ واپس ریلوے پھانک کی طرف چلنے لگا۔ یہ رام باغ یا کمپنی باغ والا ریلوے پھانک تھا۔ ٹرین گزر جانے کے بعد پھانک کھول دیا گیا تھا مگر یہاں نہ کوئی سائیکل ناگہ نظر آ رہا تھا نہ کوئی آدمی ہی تھا۔

اوپر سگنل کے کبین میں سے کسی نے مجھے آواز دے کر کہا۔

”اوائے منڈیا۔ ننھ کے جا۔ کرفو لگن والا ای۔“

اس سگنل والے نے مجھے خبردار کیا تھا کہ جہاں بھی جانا ہے بھاگ کر جاؤ۔ شہر میں کرفو لگنے والا ہے۔ اس کے باوجود مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے شہر میں آکر میرا سارا خوف دور ہو گیا تھا اور میں پھر سے دلیر ہو گیا تھا۔ وہاں سے ہمارا محلہ زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں کمپنی باغ والے پھانک سے لے کر رام باغ کے پولیس سٹیشن تک صرف ایک سڑک ہی تھی۔ میری بائیں جانب امرتسر کے مشہور سکھ ڈاکٹر کا آنکھوں کا ہسپتال تھا۔ دائیں جانب عید گاہ کا چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ آگے جی ٹی روڈ آگئی۔ پھر گھاس منڈی تھی۔ سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ دو تین آدمی ضرور نظر آئے جو دوڑ کر چلتے ہوئے ادھر ادھر غائب ہو گئے۔ ایک فوجی جیپ تیزی سے میرے قریب سے گذر گئی۔ جیپ میں دو بے کے تینوں والے فوجی رائفلیں لیے بیٹھے تھے۔ میری وردی بھی خاکی تھی اور تھیلا بھی خاکی تھا۔ شاید انہوں نے مجھے بھی فوجی سمجھا تھا۔ گھاس منڈی کی ساری کانیں بند تھیں۔ ریل کے سیزھیوں والے پل کی طرف درختوں کے پیچھے آسمان کی طرف دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں جلی ہوئی ٹکڑیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ رام باغ پولیس سٹیشن کے باہر تین چار سکھ سپاہی کھڑے تھے۔ ایک فوجی بھی چوک کے وسط میں راقط لے نسل رہا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا فوجی نے ہاتھ سے مجھے جلدی نکل جانے کا اشارہ کیا۔

یہ میرا محلہ تھا۔ اتنے میں کرفو لگنے کا سائرن بج اٹھا۔ میں دوڑ کر رام باغ والے پرانے قلعے کی دیوار کے ساتھ ہوتا ہوا اس گلی میں داخل ہو گیا جو آگے جا کر اسے بازار میں نکل آتی تھی۔ یہ سارا محلہ مسلمانوں کا تھا۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں ادھر ادھر کھڑے یا چارپائیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے مجھے پہچان لیا اور کہا۔

”تم سیلون سے کب آئے؟“

میں نے کہا۔ ”چچا! ابھی آ رہا ہوں۔“

ان لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور پوچھنے لگے۔ ریل سے آرہے ہو یا لاری؟ جالندھر لہ میاں میں کیا صورتحال ہے؟ جب میں نے انہیں بتایا کہ جالندھر اور تارپورہ کے درمیان میں بنی ریلوے لائن کے ساتھ مسلمان عورتوں، بچوں اور

ہندو قیدی راتیں چلتی رہیں۔ نعروں کی آوازیں آتی رہتیں۔ دن میں تھوڑی دیر کے لیے کرفیو کھلا اور پھر لگ جاتا۔ ہم لوگ اپنے محلے کی گلیوں میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ امرتسر کے مسلمانوں کو یقین تھا کہ امرتسر گورداسپور کا علاقہ پاکستان میں شامل ہو گا لیکن عین وقت پر یہ علاقہ ہندو اور انگریز کی سازش کے نتیجے میں ہندوستان کو دے دیا گیا۔ اس کے بعد گورداسپور اور چھاٹکٹ کے اضلاع کے مسلمانوں کے بھی پاؤں اکڑ گئے۔ ادھر سے بھی لئے پئے مسلمانوں کے قافلے خاک اور خون میں ڈوبے ہوئے اپنی منزل پاکستان کی طرف چل پڑے۔ اس دوران پٹیالہ، ناہرہ اور مشرقی پنجاب کی دوسری سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کا جس بے دردی سے خون بہایا گیا اس کی مثال شاید ہی تاریخ میں مل سکے ہمارے اپنے شہر امرتسر کے ہندو اکثریتی محلے میں مسلمانوں کے دس بارہ گھر تھے۔ ہندوؤں نے ان گھروں پر حملہ کر دیا۔ مردوں نے لاشیوں اور ڈنڈوں سے مقابلہ کیا اور ایک ایک کر کے اپنے مکانات کے سامنے شہید ہو گئے۔ اس محلے میں ایک کنواں تھا۔ بارہ کے بارہ مکانات کی سلمان عورتوں نے ان کنوؤں میں چھپا لیں لگا دیں اور شہید ہو گئیں۔

چودہ اگست 1947ء کے روز پاکستان بن گیا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا۔۔۔۔۔ اور شہر میں ڈوگرہ فوج ہندو غنڈوں کے ساتھ مل کر مسلمان محلوں پر حملہ آور ہوئی۔ جب تک شہر میں فوج ہندو سکھوں کے ساتھ نہیں تھی امرتسر کے مسلمان بڑی دلیری کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے تھے اور کسی ہندو سکھ کو مسلمانوں کے محلے پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی مگر اب مشین گنوں اور دستی بموں سے لیس ڈوگرہ فوج ان کے ساتھ تھی۔ فوج آگے آگے ہوتی۔ ہندو غنڈے پیچھے پیچھے لاشیاں تواریں لئے آرہے ہوتے۔ فوجی دستی بم مار کر گلی کا آہنی دروازہ اڑا دیتے اور مسلمانوں پر مشین گنوں کا فائر کھول دیتے۔ امرتسر کے مسلمان اپنی دو ٹالی بندھتوں اور لاشیوں سے ڈوگرہ فوج کی مشین گنوں اور دستی بموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان کے پاؤں اکڑ گئے۔ شریف پورے کو مہاجر کیمپ بنا دیا گیا۔ اس کے باہر بلوچ رجسٹ کے جوانوں نے مورچے سجھال لئے۔ ہماری گلی میں آس پاس کی تمام گلیوں کے مسلمان کنبے آگئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ بلوچ رجسٹ اور مسلم لیگ کے ٹرک آکر انہیں پاکستان لے جائیں گے۔ اکا دکا ٹرک آتے مگر گلی میں لوگوں کا جھوم تھا۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو ٹرکوں میں سوار کرا دیا جاتا۔ ابھی تین چار ٹرک

مردوں کی کئی ہوئی بے شمار لاشیں دیکھی ہیں تو سب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ایک نے کہا۔

”فلز نہ کرو۔ ایک ایک مسلمان کے خون کا بدلہ لیں گے۔“

میں گلیوں میں سے گذرتا ہوا پکی گلی میں داخل ہو گیا اور پھر اپنے بازار میں پہنچ گیا۔ میرے گھر والوں نے مجھے دیکھا تو مجھ سے باری باری لپٹنے لگے۔ والد صاحب نے مجھے گھور کر کہا۔

”تم اس سے پہلے نہیں آ سکتے تھے؟ راستے میں تمہیں کچھ ہو جاتا تو کون ذمے دار تھا؟“

امرتسر شہر جل رہا تھا۔ ہماری گلی میں ہندو سکھوں کے چھ سات مکان تھے۔ وہ مکان خالی کر کے ہندو سکھوں کے محلوں میں چلے گئے تھے۔ اسی طرح ہندو سکھوں کے محلوں میں جو مسلمان رہتے تھے وہ جانیں بچا کر مسلمانوں کے محلوں میں آگئے تھے۔ کئی مسلمان غلطی سے اگر غیر مسلموں کے محلے میں چلا جاتا تو قتل ہو جاتا۔ کوئی ہندو سکھ مسلمانوں کے محلے میں آ جاتا تو مارا جاتا۔ شہر میں مکان جل رہے تھے۔ رات کو تھری ناٹ تھری راکٹوں اور ہندوؤں کے دھماکوں کی آوازیں آتیں۔ جس روز میں تیسرے پھر امرتسر پہنچا اس روز صبح نو بجے تک کا کرفیو لگ گیا۔ صبح نو بجے کرفیو کھلا تو لوگ سودا سلف خریدنے گھروں سے نکل پڑے۔ ہال بازار کی دکانیں بھی کھل گئیں۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ہال بازار میں جا رہا تھا کہ میوہ منڈی کے چوک میں ایک غیر مسلم قتل ہو گیا۔ وہ اپنے محلے سے نوکری لے کر میوہ منڈی سودا خریدنے آیا تھا۔ وہاں شور مچ گیا۔ لوگ ادھر ادھر گلیوں میں بھاگ اٹھے۔ پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم بھی بھاگ کر اپنی گلی میں آ گئے۔ اسی وقت شہر کے اس علاقے میں دوبارہ کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

جیسے جیسے چودہ اگست 1947ء کا دن قریب آ رہا تھا فسادات کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑکنے لگی تھی۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین کے قافلے پاکستان کی طرف چلے آرہے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ ان پر سکھوں اور ہندوؤں کے جتے حملہ کر کے نئے مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کرتے۔ عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی۔ شیرخوار بچوں کو ماؤں کی گودوں سے چھین کر درختوں کے ساتھ کیل ٹھوٹک کر لٹکا دیا جاتا۔ محلے کی گلیوں پر لوہے کے دروازے چڑھا دیئے گئے تھے۔ ساری رات

ہی آئے ہوں گے کہ ایک روز ڈوگرہ فوج نے ہماری گلی پر بھی دھاوا بول دیا۔

دن کا وقت تھا کہ گلی کے دروازے کی طرف اوپر تلے دو تین دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے اتنے زبردست تھے کہ دکانوں کے چھجوں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے کیوٹر پڑ پڑا کر اڑ گئے۔ فوج نے دستی بم مار کر گلی کا دروازہ اڑا دیا۔ گلی میں چیخ و پکار مچ گئی۔ لوگوں نے اپنا اپنا سامان چھوڑ کر گلی کے دوسرے دروازے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ دوسرے دروازے پر سکموں کے قلعے برج پھولا سگھ کی طرف سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ اسی دروازے سے گذرتے ہوئے ہماری گلی کے کئی آدمی شہید ہو گئے۔ غلام محمد شمال مرچنٹ کا جوان بیٹا موسیٰ اپنے بچے کو گودی میں اٹھائے دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے اور اس کے شیر خوار بیٹے کو گولیوں نے چھلنی کر دیا۔ دونوں باپ بیٹا شہید ہو گئے۔ ان کی لاشیں بھی وہیں سڑک پر پڑی رہ گئیں۔ لوگ محلے کے بڑے دروازے کی طرف دوڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ ادھر ڈوگرہ فوجی فائرنگ کر رہے تھے۔ یہاں سے جس کا جدھر کو منہ اٹھا، دوڑ پڑا۔ میں مشن سکول کی اونچی دیوار کے ساتھ بھاگتا ہوا بازار پار کر کے روڑاں والی مسجد میں آگیا۔ یہاں مسجد کے صحن میں امام مسجد اور کچھ دوسرے مسلمانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ میں مسجد کی چھت پر چڑھ کر چھپ گیا۔ چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ گلی میں مسلمانوں کے مکان جل رہے تھے۔ ہندو اور سکھ بلوائی مکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ مسجد کی طرف آئے۔ کسی نے کہا۔

”اس کو آگ کیوں نہیں لگاتے۔ یہ مسجد کیوں چھوڑ دی ہے۔“

اس کے ساتھ ہی مسجد کے صحن میں دو تین پٹرول بم آکر پھٹے۔ میں چھت پر سے دوسرے مکان پر کود گیا۔ تین چار مکانوں کی چھتوں پر سے ہوتا ہوا گلی رنگ ریزاں کے مکان کی چھت پر پہنچ گیا۔ اس گلی کے سارے مسلمان مکان خالی کر کے کیپ میں جا چکے تھے۔ گلی میں ہندو سکموں کے مکان لوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں بھنس گیا تھا۔ کیونکہ اس کے آگے ہندوؤں سکموں کے محلے شروع ہو جاتے تھے۔ آگے بھی موت تھی۔ ایک روز پہلے ہمارے گھر کی سب عورتیں محلے کی دوسری عورتوں کے ساتھ شریف پورہ ماجر کیپ میں پہنچا دی گئی تھیں۔ مرد نہیں گئے تھے۔ سوچنے لگا میں بھی ان کے ساتھ ہی چلا جاتا تو اچھا تھا۔ میں مکانوں کی چھتیں بھلاکتا بکرواٹاں کے بازار والے ایک خالی مکان کی چھت پر آکر منڈیر کے پاس بیٹھ

گیا۔ نیچے بازار میں ہندو اور سکھ بچے کچے مسلمانوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ میں نے جھرنے میں سے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ میں اس انتظار میں دہیں چھپ کر بیٹھا رہا کہ یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں تو میں نیچے اتر کر قبرستان کی طرف سے ہوتے ہوئے شریف پورہ کیپ پہنچنے کی کوشش کروں۔ اسی انتظار میں شام ہو گئی۔ پھر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ بازار میں ذرا خاموشی ہوئی تو میں نے چھت کی منڈیر پر سے جھانک کر بازار میں دیکھا۔ بازار خالی پڑا تھا۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں مکان کی سیڑھیاں اتر کر دوسری منزل میں آیا تو وہاں ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا پڑا تھا۔ غڈے گھر کا سارا قیمتی سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ میں پہلی منزل میں آگیا۔ یہاں نلک لگا تھا۔ میں نے نلک کھول کر پانی پیا اور ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا بازار میں آگیا۔ کیس کیس بجلی کے کھبے پر بلب روشن تھے۔

بازار شروع سے آخر تک سنسان پڑا تھا۔ میں اس محلے کی ساری گلیوں سے واقف تھا۔ چپکے سے اس گلی کی طرف چلنے لگا جو دوسری طرف دروازہ کھلی منڈی والے قبرستان کی جانب نکل جاتی تھی۔ گلی میں ٹوٹے ہوئے صندوق اور چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ سارا محلہ مسلمانوں کا تھا۔ ہندو سکموں نے مکانوں کو لوٹ لیا تھا۔ خدا جانے یہاں کتنے مسلمان شہید ہوئے تھے اور کتنی خواتین اغوا ہوئی تھیں۔ میں خالی مکانوں کے ساتھ ساتھ چلتا دوسرے دروازے پر آیا تو نضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ قہری ناٹ قہری راتقل کا دھماکہ تھا۔ میں حسن شاہ صاحب کے مکان کے قہرے پر چڑھ کر اندھیرے میں چھپ گیا۔

سامنے سڑک خالی پڑی تھی۔ ایک طرف سکموں کا قلعہ تھا اور دوسری طرف کھال کے پار قبرستان کو راستہ جاتا تھا۔ مجھے کھال کے پل پر سے ہو کر قبرستان کی طرف جانا تھا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کھال کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ کھال زیادہ دور نہیں تھا۔ بیچ میں ایک ہی سڑک تھی۔ کھال کے پل سے میں نیچے کچی سڑک پر آگیا۔ یہاں سے قبرستان شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں ہم عید شب برات پر اپنے گھر والوں کے ساتھ قبروں پر چراغ جلائے اور اگر بنیاں لگانے آیا کرتے تھے۔ اب ان قبروں کا کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ رات کے اندھیرے میں قبرستان پہلے سے زیادہ ویران معلوم ہو رہا تھا۔ راستہ مجھے آتا تھا۔ آگے امرودوں کا باغ آگیا۔ اس باغ میں ہم اسکول سے بھاگ کر امرود توڑنے آیا کرتے تھے۔ باغ میں

کچے کچے امرودوں کی بڑی افسردہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ امرودوں کے باغ کی دوسری طرف پھر قبرستان آ جاتا تھا۔ اس کے آگے جی ٹی روڈ تھی جس کو پار کر کے مجھے لوکانوں کے باغ میں سے ہوتے ہوئے شریف پورے کے مساجر یکپ میں داخل ہونا تھا۔ امرودوں کا باغ ختم ہو گیا۔ سامنے اندھیرے میں قبروں کی اونچی نیچی ڈھیریاں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔

امرودوں کے باغ سے نکل کر میں نے پیچھے امرتسر شر کی طرف نگاہ ڈالی۔ دور آسمان پر سرخی جھلک رہی تھی۔ مسلمانوں کے مکان جل رہے تھے۔ میں قبروں کے درمیان چل رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر جی ٹی روڈ کی ٹاہلیوں کے درختوں کے سائے چھے دکھائی دیئے۔ جی ٹی روڈ اور قبرستان کے درمیان ایک کمال تھا جو خشک پڑا تھا۔ میں اس میں سے ہو کر اوپر جی ٹی روڈ پر نکلا تو ایک رعب دار آواز آئی۔
”کون ہو تم؟ یہیں کھڑے رہو۔“

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

مجھے رات کے اندھیرے میں ایک آدمی نظر آیا جس نے دھوٹی اور بنیان پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمرا تھا۔ خوف سے میرے ہونٹ خشک ہو گئے۔ میں کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا تو اس نے ذرا قریب آ کر پوچھا۔
”مسلمان ہو؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ ہندو غنڈہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں تو یہ مجھے قتل کر دے گا۔ میں اگر بھاگا تو بھی یہ مجھ پر پیچھے سے کم از کم چمیرے کا ایک وار ضرور کر دے گا۔ میں اس کا منہ بکنے لگا۔ اتنے میں جی ٹی روڈ کی دوسری طرف کھیتوں سے ست سری اکال اور بزرگ ملی کے نعروں کی آواز آئی۔ اس آدمی نے اس طرف دیکھا اور غصے میں بولا۔
”بولتے کیوں نہیں؟ مسلمان ہو تو میرے ساتھ بھاگو۔ کچھ تمہیں مار ڈالیں گے۔“

یہ کہہ کر اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر سڑک پر ٹاہلی کے درختوں کی طرف بھاگا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھ سے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ درختوں سے نکل کر ہم جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے کھلی جگہ پر آ گئے جہاں آٹنے سامنے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ عیسائیوں کے کوارٹر ہیں۔ وہ ایک کوارٹر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے کوارٹر کا دروازہ کھول کر مجھ سے کہا۔
”اندر چارپائی کے نیچے چھپ جاؤ۔ خبردار آواز نہ نکالنا۔“

کوارٹر کے اندر اندھیرا اور جس تھا۔ میں اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چارپائی کے پاس آیا اور اس کے نیچے کھس کر لیٹ گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا اور جسم پیسے میں شراپور تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں کے نعروں کی آواز اسی جانب قریب آ

”میرا نام عنایت مسیح ہے۔ جب سے امرتسر میں ڈوگرہ ظہری داخل ہوئی ہے۔ میں رات کو چھرا لے کر جی ٹی روڈ پر نکل جاتا ہوں۔ کوئی بھولا بھٹکا مسلمان مل جائے تو اسے شریف پورے کیمپ میں پہنچا دیتا ہوں۔ فکر نہ کرو میں تمہیں بھی کیمپ میں پہنچا دوں گا۔ اگر میں وہاں نہ پہنچتا تو ان ظالموں نے تمہاری بوٹی بوٹی کر دینی تھی۔“

میں نے عنایت مسیح کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔
 ”شکریہ کس بات کا کا؟ یہ تو ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ مصیبت کے وقت دوسرے انسان کی مدد کرے۔“

میں نے کہا۔
 ”میں اب خود ہی شریف پورے چلا جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے یہاں سے تھوڑی دور تحصیل پورے کی جی ہے۔ پھر تحصیل پورہ ہے۔ میں اسکی گلیوں میں سے ہو کر شریف پورے پہنچ جاؤں گا۔“
 وہ کہنے لگا۔

”شاید تمہیں پتہ نہیں کہ تحصیل پورے میں جو چھ سات ہندوؤں کے مکان تھے وہ تو ہندو خالی کر کے بھاگ گئے ہیں مگر وہاں سکھ چھپے ہوئے ہیں۔ تم جیسے ہی تحصیل پورے میں داخل ہو گے وہ تمہیں قتل کر ڈالیں گے۔ کل انہوں نے دو مسلمان باپ بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔ دونوں بے چارے چائی وند دروازے سے نکل کر شریف پورے کیمپ جا رہے تھے اور مارے گئے ابھی تم تھوڑا انتظار کرو۔ منہ اندھیرے تمہیں یہاں سے نکال کر خود شریف پورے لے جاؤں گا۔“

میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کس قدر دلیر اور انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہے۔ دوسرے انسان کو بچانے کی خاطر اس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی ہے۔ میں نے کہا۔

”جیسے آپ کہتے ہیں ویسے ہی کروں گا۔“
 اس نے مجھے کونے میں رکھے ہوئے گھرے میں سے ٹھنڈا پانی پلایا اور یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ میں تحصیل پورے کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ تم کوارٹر سے باہر مت نکلتا۔ وہ چلا گیا پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔
 ”میرے ساتھ آ جاؤ۔“

رہی تھی۔ میرا محسن مسیحی بھائی کوارٹر بند کر کے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص کر بچن ہے۔ معلوم نہیں وہ چھرا لے کر سڑک پر اندھیرے میں کیوں کھڑا تھا۔ نعرے بند ہو گئے۔ باہر کچھ فاصلے پر آدمیوں کے تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرا دل خوف کے مارے تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ ان آوازوں میں مجھے کبھی کبھی اس آدمی کی آواز بھی سنائی دیتی تھی جو مجھے یہاں لایا تھا۔ پھر یہ ساری آوازیں دور ہونے لگیں۔ نعروں کی آوازیں بھی دور جا کر غائب ہو گئیں۔
 اس کے کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد کوارٹر کا دروازہ کھلا اور اسی مسیحی بھائی کی آواز آئی۔

”اندھرو ہو منڈیا؟“

میں نے کہا۔

”ہاں جی۔“

”باہر نکل آ۔“

میں چارپائی کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس آدمی نے موم بتی روشن کر دی۔ یہ شخص پچاس پچپن برس کا گھرے سانولے رنگ کا آدمی تھا۔ سر کے بال خشک تھے۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا اور خود فرش پر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔

”یہ بتاؤ کہ تم رات کے وقت موت کے منہ میں اس طرف کیسے آ گئے تھے؟ غنڈوں کو شک تھا کہ میں نے مسلمان عورتوں کو چھپایا ہوا ہے۔ ان میں میرا ایک واقف تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔“

میں نے اسے کہا کہ میں اپنی گلی سے نکل کر شریف پورے کیمپ کی طرف دوسرے لوگوں کے ساتھ بھاگا تھا کہ ڈوگرہ فوج نے گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بازار بکرواٹاں کے ایک مکان میں گھس گیا۔ اس کے بعد کی ساری روداد میں نے اسے سنا دی۔ وہ سانس بھر کر کہنے لگا۔

”بڑا قتل عام ہوا ہے مسلمانوں کا۔ بڑی لاشیں پڑی ہیں مسلمانوں کی۔“
 وہ ایک لمبے کے لئے چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔

اسے میری دعاؤں کی حاجت نہیں رہی۔ اس نے دنیا میں ہی جنت میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔

شریف پورہ کیمپ میں ماجرین کا ہجوم بڑا تھا۔ چونکہ یہ مسلمانوں کی آبادی والا علاقہ تھا اور مسلمانوں کے مکان تھے اس لئے یہاں کوئی خیمہ وغیرہ نہیں لگا تھا۔ لوگ مکانوں کی چھتوں اور گلیوں میں چارپائیوں اور تخت پوشوں پر دریاں بچھا کر ان پر اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مسلم لیگ کے ٹرک آتے تھے تو کچھ ماجرین ان میں سوار ہو کر پاکستان کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ماجروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ٹرک زیادہ سے زیادہ چار پانچ آتے تھے۔ پھر ریلوے لائن کی جانب خالی مال گاڑی کے ڈبے آکر لگنے لگے۔ ان میں دو ایک مال گاڑیاں ماجرین کو لے کر لاہور کی طرف چل دیتی تھیں۔ میں بھی ایک مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ڈبے کی ایک چھت خراب تھی۔ گاڑی کے سارے ڈبے مسلمان ماجرین سے بھرے ہوئے تھے۔ جن ڈبوں کی چھت تھی ان چھتوں پر بھی لوگ تھوڑا بہت سامان اور اپنے بال بچے لیکر بیٹھ گئے تھے۔ ٹرین آہستہ آہستہ امرتسریشٹن کی طرف چلنے لگی۔ شریف پورہ کے مکانوں کی دیواروں والا علاقہ گذر گیا۔ پھر کہنی باغ والا چھانک آگیا۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے کہنی باغ کی طرف دیکھا۔ دور سے دن کی روشنی میں مجھے کہنی باغ کا پرانی طرز کا محرابی دروازہ دکھائی دیا۔ دائیں بائیں اونچے اونچے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ ان درختوں کے سایوں میں کھیل کود کر میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ کہنی باغ میری یادوں کی جنت تھی۔ اس وسیع و عریض باغ کا کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میری مھتوں کے نام نہ لکھے ہوئے ہوں۔ آج یہ مھبتیں، ان مھبتوں کے سارے نام مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے تھے۔ کہنی باغ کے یہ درخت بھی دور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا ہو گا۔ وہ ہوا میں اپنی شاخوں کو آہستہ آہستہ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ انہیں میری خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے ان کی خوشبو آ رہی تھی۔ محبت کی صرف خوشبو ہی ہوتی ہے۔ محبت کا کوئی جسم نہیں ہوتا۔

مال گاڑی عید گاہ والی دیوار کے قریب سے گذرتی ہوئی امرتسریشٹن کی ریلوے لائن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے لوگوں کے ٹرکوں کے اوپر بیٹھے بیٹھے عید گاہ کے صحن اور جامن کے درختوں پر نگاہ ڈالی۔ درمیان میں بنا ہوا سبز پانی والا

ہم رات کے اندھیرے میں کوارٹر سے نکلے اور تحصیل پورے والی جی کی طرف چل پڑے۔ یہ راستہ میرا بھی دیکھا ہوا تھا۔ ہم میری والی کوٹھڑی کے آگے سے گزرے۔ پھر تحصیل پورے میں داخل ہو گئے۔ تحصیل پورے کی گلیوں میں سانا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہماری بائیں جانب لوکانوں کے باغ تھے۔ اس کے آگے ریلوے لائن آ جاتی تھی۔ جو جالندھر کی طرف جاتی تھی۔ وہیں سے ریل کی ایک پنہزی مثالہ گورداسپور کی طرف نکل جاتی تھی۔ عنایت مسیح مجھے مکانوں کے بالکل ساتھ ساتھ چلا رہا تھا۔ ہمیں ایک مکان میں سے دو تین آدمیوں کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ عنایت مسیح جھک کر دبے پاؤں چلنے لگا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ تحصیل پورے کی دوسری گلی ویران تھی۔ وہاں آکر عنایت مسیح نے مجھے بتایا کہ مکان کے اندر ہندو سکھ غنڈے شراب پی رہے تھے۔ ان لوگوں نے شریف پورے کی طرف جاتے کئی مسلمانوں کو قتل کر کے لاشیں گڑھوں میں پھینکی ہیں۔ جہاں سے شریف پورہ شروع ہوتا تھا وہاں بلوچ رجسٹ کے جوانوں نے ایک مورچہ بنایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں انہوں نے ہمیں دیکھ کر اونچی آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

عنایت مسیح نے کہا۔

”ایک مسلمان کو کیمپ میں لایا ہوں۔“

شریف پورہ کیمپ میں پہنچ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ عنایت مسیح بولا۔

”اب یہاں سے باہر مت نکلتا۔ مسلم لیگ کے ٹرک آئیں گے وہ تمہیں بھی

دوسرے مسلمانوں کے ساتھ پاکستان پہنچا دیں گے۔“

میرے پاس اس نیک دل مسیحی بھائی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں

تھے۔ اگر کچھ الفاظ تھے بھی تو عنایت مسیح کے اعلیٰ ترین انسانی جذبے کے آگے وہ سچ

معلوم ہو رہے تھے۔ میں کچھ کہنے لگا تو عنایت بولا۔

”کالا! کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“

اتنا کہہ کر عنایت مسیح سگریٹ پیتا تحصیل پورے کی گلیوں کی طرف چل دیا۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو یقین

کریں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے نہیں معلوم عنایت مسیح اس وقت کہاں

ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہے تو میں اس کی صحت کی دعا کرتا ہوں۔ اگر انتقال کر گیا ہے تو

بغیر چھت والے مال گاڑی کے ڈبے میں مسلمان مہاجرین سے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس جگہ مسلمانوں کا کوئی قافلہ کٹ گیا تھا۔ سامان جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا۔

یہاں مال گاڑی کی رفتار بہت دھیمی ہو گئی۔ شیٹن پر گاڑی رک گئی۔ سب بہت خوف زدہ تھے۔ سکھ پیٹ فارم پر دور کھڑے کرپائیں لہراتے ہوئے مسلمانوں کو گالیاں دے رہے تھے اور پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اس مال گاڑی کے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے مسلح جوان بھی تھے جو اس گاڑی کی حفاظت پر مامور تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر بھی ان دنوں ہندو سکھ غنڈوں پر بلوچ رجمنٹ کی ایسی دہشت بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی ہندو یا سکھ گاڑی کے قریب آنے کی جرات نہیں کر رہا تھا۔ گاڑی یہاں سوچی سمجھی سکیم کے تحت کھڑی کی گئی تھی کہ جیسے گاڑی کھڑی ہوگی ہندو سکھ غنڈے اس پر حملہ کر دیں گے۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان گاڑی کے اگلے ڈبوں سے لے کر پچھلے ڈبوں تک دوڑ دوڑ کر مسلمانوں کو حوصلہ دے رہے تھے کہ فکر نہ کرو۔ جب تک ہم زندہ ہیں تمہیں کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ انہوں نے ایک دو بار ہوائی فائر بھی کئے جس سے ڈر کر سکھ ہندو غنڈے پیٹ فارم سے بھاگ گئے۔ آخر گاڑی چل پڑی۔ اس کے بعد خاصہ آیا۔ اس کے بعد ٹرین کسی جگہ نہ رکی اور چلتی چلی گئی۔ پھر اتاری سے بھی گذر گئی۔ اب واہک قریب تھا۔ واہک سے پاکستان کی سر زمین شروع ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی واہک پر گاڑی رکی فضا ”پاکستان زندہ باد“ کے نعروں سے گونجنے لگی۔

پہلی بار پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہراتے دیکھا تو ایسے محسوس ہوا جیسے مردہ بدن میں پھر سے جان پڑ گئی ہو۔ ابھی یہ صرف سبز پرچم ہی تھا جو مسلم لیگ کا نشان تھا۔ یہاں کھانے پینے اور طبی امداد کا پورا انتظام تھا۔ میں مال گاڑی سے اتر کر واہک شیٹن سے باہر سڑک پر آگیا۔ یہاں فوج اور مسلم لیگ کے اور دوسری نجی ٹرانسپورٹ کے ٹرک کھڑے تھے۔ لوگ ان میں سوار ہونے لگے۔ یہ ٹرک پہلے سیدھا لاہور شیٹن کے باہر جو عارضی ریفرنری کیمپ بنا ہوا تھا پہنچے۔ مسلم لیگ کے رضا کار ہر ایک مہاجر سے پوچھتے کہ آپ والٹن کیمپ میں جائیں گے یا اپنے کسی رشتے دار کے ہاں جائیں گے۔ میں ٹرک سے اتر کر سیدھا دس پورے اپنی بڑی ہمشیرہ کے مکان کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری فیملی کے بھی لوگ پاکستان آچکے ہیں صرف چھوٹا بھائی ابھی تک نہیں پہنچا۔ سب لوگ اس کے لئے پریشان

تالاب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس تالاب میں زرد سنہری اور سرخ مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ عید کے روز میں اپنے والد صاحب کے ساتھ یہاں عید کی نماز پڑھنے آیا کرتا تھا۔ عید گاہ کے قریب سے گاڑی گذری تو ایک لمحے کے لئے مجھے عید گاہ کے جامن اور انار کے درختوں کی خوشبو محسوس ہوئی۔ پھر یہ خوشبو آہستہ آہستہ پیچھے رہ گئی۔

”الوداع! میری عید گاہ کے انار کے درختو!“

”جامن کے درختو!“

”سبز تالاب میں تیرنے والی مچھلیو!“

”عید کے دن عید کی نماز پڑھنے والے مسلمانو!“

”امرتر تم سے جدا ہو رہا ہے۔“

”تمہارا غناطہ تم سے جدا ہو رہا ہے۔“

”اب الحما کے باغ ویران ہو جائیں گے تم اپنے سارے رنگ ساری

خوشبوئیں اپنے ساتھ لے کر پاکستان جا رہے ہو۔“

”الوداع! میری عید گاہ کے انار کے درختو!“

”جامن کے درختو!“

مال گاڑی ریلوے لائن میں سے گذر رہی تھی۔ اس کی رفتار ہلکی تھی۔ پھر امرتر کا شیٹن آگیا۔ مال گاڑی رکی نہیں۔ اسے دوسری سائیڈ سے آگے گزار دیا گیا۔ امرتر شیٹن کے پیٹ فارم پر ہندو سکھ چل پھر رہے تھے۔ مال گاڑی امرتر شیٹن کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ وہ علاقہ قریب آ رہا تھا جہاں سکموں کا بڑا مقدس گوردوارہ ہے۔ ابھی گوردوارہ دور تھا کہ مجھے ریلوے لائن کے ساتھ جھاڑیوں میں ایک کٹی ہوئی لاش نظر آئی۔ لاش اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ اس کی کمر کندھے سے لے کر پیٹ تک پھٹی ہوئی تھی۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس لاش کو دیکھا۔ اس کے بعد ایک اور لاش نظر آئی۔ اس کے بعد جھاڑیوں کے درمیان اکٹھی تین لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک لاش کا سر غائب تھا۔ لوگ سسم کر کلہ شریف پڑھنے لگے۔ ظاہر ہے یہ مسلمانوں کی لاشیں تھیں جنہیں ہندو سکھ غنڈوں نے قتل کر دیا تھا۔

شیٹن تک ہم نے مسلمانوں کی بے شمار لاشوں کو بے گور و کفن جھاڑیوں میں اور ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ زمین پر پڑے دیکھا۔ ان میں بچوں اور عورتوں کی لاشیں بھی تھیں۔

تھے۔ میں دن میں شیش والے کیمپ کے دو تین چکر لگاتا کہ شاید بھائی آگیا ہو۔ یہ پندرہ سولہ اگست کے دن تھے۔ ایک دن میں لاہور شیش کے پلیٹ فارم پر پھر رہا تھا کہ فیروز پور کی طرف سے ایک گاڑی آکر رکی۔ اس میں سے ایک بھی مسافر باہر نہ نکلا۔ اس کی بجائے مسلم لیگ کے رضا کار اور کچھ سفید کونوں والے ڈاکٹر لوگ گاڑی کی طرف دوڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گاڑی کے پاس آگیا۔ دیکھا کہ ڈبوں میں خون جما ہوا تھا۔ ہر ڈبہ لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی لاشیں تھیں جو پاکستان پہنچنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر فیروز پور ذہرہ اور منوگا اور دوسرے دیہات سے گاڑی میں سوار ہوئے تھے کہ پاکستان پہنچ جائیں گے مگر راستے میں ہندو سکموں کے ایک بہت بڑے جتھے نے گاڑی پر حملہ کر دیا۔ جوان عورتوں کو اغواء کر لیا گیا۔ بچوں بوڑھوں اور نیتے جوانوں کو کپالوں تلواروں اور خنجروں سے کاٹ ڈالا گیا۔

ڈبوں میں سے کئی ہوئی لاشوں کو نکال کر سامان لادنے والی لوسہ کی بڑی بڑی ٹرالیوں پر ڈالا جانے لگا۔ لاشوں سے بھری ہوئی ٹرالیاں خدا جانے کس طرف چل پڑیں۔ پلیٹ فارم پر دہشت، غصے اور خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ایک نوجوان نے چیخ کر کہا۔

”ہم اپنے ایک ایک شہید کا پورا بدلہ لیں گے۔“

اسی شام کاموگی پر ہندو سکھ شہزادہوں سے بھری ہوئی مال گاڑی کو روک کر حساب چکا دیا گیا۔ فیروز پور سے آنے والی کئی ہوئی گاڑی کے ڈبوں کا خون پانی کے بڑے بڑے پائپوں سے دھویا جانے لگا۔ میں ایک دھوئے ہوئے ڈبے میں داخل ہوا تو مجھے ایک سیٹ کے نیچے لکڑی کے فرش پر کالے رنگ کا ایک انڈی چین پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے جبکہ کر اسے اٹھایا اور ڈر کر وہیں پھینک دیا۔ جیسے میں انڈی چین سمجھ رہا تھا وہ کسی انسان کا کتا ہوا انگوٹھا تھا۔ جب سکھ اور ہندو غنڈے تلواریں لہراتے اس ڈبے میں داخل ہوئے ہوں گے اور انہوں نے مسلمانوں عورتوں بچوں جوانوں اور بوڑھوں کو تلواروں سے کاٹنا شروع کیا ہوگا تو اس آدمی نے جس کا کتا ہوا انگوٹھا ڈبے میں پڑا رہ گیا تھا تلوار سے بچنے کے لئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا ہوگا اور تلوار نے اس کے انگوٹھے کو کلائی تک کاٹ کر الگ کر دیا ہوگا۔ یہ گناہ شہید کون تھا جس نے اپنی جان پاکستان پر قربان کر دی؟ کون اس کا سراغ لگائے؟ وہاں تو ہزاروں

عورتیں بچے جوان اور بوڑھے ترین میں شہید ہو گئے تھے۔ انہیں اس بے دردی سے تلواروں برچھوں اور کپالوں سے کاٹا گیا تھا کہ ٹرائی میں لدی ہوئی ایک بھی لاش کا چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ کسی لاش کا بازو سلامت نہیں تھا۔ ہمارے ان آبا و اجداد کو ان سکموں اور ہندوؤں نے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جن کی انڈین فلمیں اور فٹس ڈانس ہم زی اور ایل چمیل پر بڑے شوق سے بال بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہتا چاہتا۔ کیونکہ یہ کہنے کی نہیں سوچنے کی باتیں ہیں۔ ہم نے اپنے اس دشمن کی شناخت کھو دی ہے جو ہمارا نام و نشان تک صفحہ ہستی سے مٹانے کا انتظام کر رہا ہے۔ جس نے پاکستان کے وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ میں پاکستان کی نئی نسل کو پاکستان پر قربان ہو جانے والے اپنے شہیدوں کی کئی ہوئی لاشیں اس لئے دکھا رہا ہوں کہ میں ان کا یعنی شاہد ہوں۔ میں یہ لاشیں اپنی زندگی کے آخری سانس تک آپ کو دکھاتا رہوں گا۔ اس لئے کہ میری غیرت ابھی مری نہیں۔ اس لئے کہ میں نے اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ میں پھولوں، دریاؤں، جنگلوں، بارشوں، ستاروں اور گنگناٹے جھرنوں اور چائے کی خوشبوؤں اور مٹیوں کا ادیب ہوں۔۔۔۔۔ لیکن میں نے اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ اپنے وطن پاکستان کی سرحدوں کی حرمت کو پہچان لیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اگر پاکستان نہیں تو پھر میں بھی نہیں۔ میرے دریا بھی نہیں، میرے جنگل اور میری بارشیں بھی نہیں۔ پاکستان میری غیرت ہے اور محبتیں کرنے والے بڑے غیرت مند لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے کسی افسانے، کسی کتاب میں کبھی کوئی شعر نہیں لکھا مگر اس وقت مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر بے اختیار یاد آگیا ہے۔

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تک د - دو میں
پستائی ہے درویش کو تاج سر دارا

ایک روز میں چھوٹے بھائی کا پتہ کرنے لاہور شیش پر آیا تو وہیں پھرتے پھرتے شام ہو گئی۔ دوپہر کے وقت والٹن کے مہاجر کیمپ سے بھی میں ہو آیا تھا۔ جمال آج کل لاہور کی جدید فیشن امیل ڈینس کی عالی شان کوچیاں بنی ہوئی ہیں۔ وہیں قریب ہی اگست 1947ء میں والٹن کا مہاجر کیمپ ہوا کرتا تھا۔ مشرقی پنجاب سے

لٹے پٹے مسلمان اسی کیپ میں آتے تھے۔ ان کے پاؤں پیدل چل چل کے پھٹے ہوئے ہوتے تھے۔ چروں پر گرد جی ہوتی تھی۔ ویران آنکھیں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے ماں باپ بھائیوں اور اغواء شدہ بہنوں اور بیٹیوں کے غم میں رو رو کر سو جی ہوئی ہوتی تھیں۔ جسم بڑھال اور شکستہ ہوتے تھے اور اپنے ہچکڑے ہوؤں کی یاد میں کیپ کے کونوں میں کٹے ہوئے درختوں کی طرح پڑے ہوتے تھے۔ سینکڑوں مہاجرین ان کیپوں میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ والٹن کیپ میں میرا دن میں ایک بار ضرور جانا ہوتا۔ میں ان لٹے پٹے مہاجرین میں اپنے بھائی کا چہرہ ڈھونڈتا پھرتا۔ کئی بھائی کئی باپ کئی مائیں اپنے بھائیوں بیٹوں کے چہرے تلاش کرتی پھرتی تھیں۔ یہ وہ انمول قیمت تھی جو ہم اپنے آزاد وطن پاکستان کے لئے ادا کر رہے تھے۔ یہ وہ خستہ حال لوگ تھے جنہوں نے اپنے بکرگوئے ہندو سکھوں کے ہاتھوں کنوا کر وطن پاک کے لئے بے مثال قربانیاں دی تھیں اور ہمیں اسی قابل بنایا تھا کہ ہم آزاد اسلامی مملکت کی آزاد فضاؤں میں آزادی اور خود مختاری سے اپنے بچوں کی مستقبل تعمیر کر سکیں۔

شام ہونے سے پہلے میں لاہور سٹیشن پر والپس آ گیا۔ وہاں ایک واقف کار مل گیا۔ اس نے بتایا کہ میرا چھوٹا بھائی شریف پورہ کیپ میں پہنچ چکا ہے۔ اس نے میرے بھائی کو اپنی آنکھوں سے کیپ میں دیکھا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سٹیشن کے سامنے چائے کی دکان میں چائے پینے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں لاہور سٹیشن کے سامنے چائے کی دکانیں ہوتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہوتے تھے جہاں مسافر کھانا کھاتے۔ رات کو ان دکانوں کے اوپر چارپائیاں بچھا دی جاتی تھیں۔ دو آنے کرایہ دے کر مسافر چارپائی پر سو کر رات بسر کر سکتا تھا۔ چائے کی دکان میں مجھے میری عمر کا ایک نو عمر لڑکا مل گیا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ کونے میں بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کئے لگا۔

”ہم نکودر سے قافلے کے ساتھ چلے تھے۔ راستے میں سکھوں نے حملہ کر دیا۔ میرے ماں باپ اور دو بڑے بھائی سکھوں نے قتل کر دیے۔ میری چھوٹی بہن خوف کے مارنے ایک طرف گواٹھ دوڑی۔ میں دوسری طرف بھاگ گیا۔ میں کسی نہ کسی طرح جان بچا کر پاکستان پہنچ گیا۔ آج چھ روز سے جگہ جگہ اپنی چھوٹی بہن کو

تلاش کر رہا ہوں کہ شاید وہ کسی دوسرے قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچ گئی ہو مگر وہ کیس نہیں مل رہی۔ خدا جانے پاکستان پہنچی بھی ہے یا نہیں۔ خدا سے ڈر کر دعائیں مانگتا ہوں کہ کیس اسے کوئی سکھ نہ اٹھا کر لے گیا ہو۔“

یہ کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ رو رہا تھا۔ کئے لگا۔

”وہ مر گئی ہو تو اچھا ہے۔ اگر پاکستان نہیں پہنچ سکی تو مر گئی ہو تو اچھا ہے۔ کاش مجھے اس قافلے کا کوئی آدمی آکر بتا دے کہ میری بہن کیسے مر گئی تھی۔ اسے سکھوں نے قتل کر ڈالا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی لاشیں دیکھی ہے۔“

اس کے بعد میری نکودر ضلع کے اس نوجوان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ خدا جانے اس کی بہن والٹن کیپ میں پہنچی بھی تھی یا نہیں۔ اب تو اس بات کو اتنے برس گزر گئے ہیں۔ کئی زمانے بیت گئے ہیں۔ خدا جانے وہ نو عمر خوش شکل دیہاتی نوجوان زندہ بھی ہو گا یا اپنی بہن کو تلاش کرتے کرتے اس کی یاد میں روتے روتے مر گیا ہو گا۔

کے مصری شاہ میں آگئے۔ میاں ہم نے ایک مکان کرائے پر لے لیا اور بڑی خوبصورت اور پرسکون زندگی کا آغاز کیا۔ مصری شاہ کے آگے شاد باغ کا علاقہ تھا۔ اس کے آگے کھیت اور پھل دار باغات شروع ہو جاتے تھے جو آگے شالامار باغ سے جاملتے تھے۔ یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ آلودگی کا اس زمانے میں نام و نشان تک نہ تھا۔ موٹریں کسی کسی کے پاس ہی تھیں۔ لاریاں بھی چند ایک ہی دوسرے شہروں کو چلتی تھیں۔ صرف تانگے ہوتے تھے یا سائیکل۔ موٹر سائیکلیں بھی شہر میں کبھی کبھی نظر آتی تھیں۔

میں ہر روز صبح منہ اندھیرے اٹھ کر شاد باغ کے کھیتوں میں سیر کرنے نکل جاتا۔ شبنم سے دھلی ہوئی فضا ہوتی۔ پھولوں اور سبزے کی مکھ فضا میں بسی ہوتی۔ شاد باغ میں ایک بہت بڑا کھیت بچے گلابوں کا ہوتا تھا۔ اس کے گرد خاردار باڑھ لگی ہوتی تھی۔ ان گلابوں کی گل قد اور عرق بنتا تھا۔ میں اس کھیت کے کنارے صبح کی تروتازہ فضا میں جا کر کھڑا ہو جاتا اور لمبے لمبے سانس لیتا۔ مجھے ایسے لگتا جیسے بچے گلاب کی خوشبو مجھے زمین سے اٹھا کر آسمانوں کی طرف لے جا رہی ہے۔ ان گلابوں کی خوشبو اب کبھی نہیں ملتی۔ اس سے آگے آلوچوں، امروہوں اور ناشپاتیوں کے باغ تھے۔ بہار کے موسم میں ان پھل دار درختوں کی شبنیاں پھولوں سے لد جاتی تھیں۔ آلوچے کے درختوں کی شاخیں چھڑیوں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی تھیں۔ بہار میں یہ چھڑیاں سفید اور گلابی چھوٹے چھوٹے پھولوں سے بھر جاتی تھیں۔ ناشپاتی کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں کی طرح کے بڑے نازک سفید پھول کھلتے تھے۔ آلوچے کے پھولوں کے درمیان پتے نہیں ہوتے تھے مگر ناشپاتی کی شبنیوں پر پھول بھی ہوتے تھے اور سبز پتے بھی ہوتے تھے۔

ایک روز میں سیر سے واپس آتے ہوئے ناشپاتی کے پھولوں کی دو شبنیاں بھی توڑ کر لیتا آیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں مصری شاہ کے علاقے میں داخل ہوا تو مجھے کھیت میں بیٹھا ایک مالی مل گیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ناشپاتی کے پھولوں کی شبنی دیکھی تو کہنے لگا۔

”بابو جی! آپ ایک سیر ناشپاتیاں لے جا رہے ہیں۔“

اس کے بعد میں نے پھل دار درختوں پر سے شبنیاں توڑنی بند کر دی تھیں۔ صرف سفید یا پیازی گلاب کے دو چار پھول ہی توڑ کر گھر لے جاتا تھا۔ ہمارا

اگست 1947ء کا زمانہ تھا۔ مشرقی پنجاب سے لے پنے مہاجرین کے قافلے چلے آ رہے تھے۔ کوئی کسی طرف نکل جاتا۔ کوئی کسی طرف نکل جاتا۔ سب کچھ لٹ لٹا گیا تھا۔ صرف اسی بات کی خوشی تھی کہ ایک ایسی سرزمین میں پہنچ گئے ہیں جہاں ان کی زندگیاں، ان کی عزتیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ سب کچھ لٹ گیا۔ گھر جل گئے۔ بن بھائی بچھڑ گئے۔ ماں باپ شہید ہو گئے۔ لیکن اپنا ایک آزاد ملک قائم ہو گیا ہے۔ پاکستان بن گیا ہے۔ میاں نئی زندگی شروع کریں گے۔ اپنے بچوں کا بغیر کسی خوف و خطر کے سنہری مستقبل تعمیر کریں گے اور اپنے دین اسلام کے مطابق آزادی اور عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ قریانی بڑی تھی تو اس کا انعام بھی بہت بڑا تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے قریانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ زخم مندمل ہوتے گئے۔ جس کو جہاں سر چھپانے کو ٹھکانہ ملا وہیں رزق حلال کمانے اور اپنے مستقبل کی تعمیر میں لگ گیا۔ اتنے لوگ ہجرت کر کے آئے مگر سب کے سب وطن پاک کی سکون پرورد آغوش میں سما گئے۔ اس زمانے میں بھی لاہور شہر میں اتنی آبادی اور رش نہیں تھا۔ یہی حال کراچی اور دوسرے شہروں کا تھا۔ لاہور کی مال روڈ پر کماں اتنا ٹریفک ہوتا تھا۔ اتوار کے روز تو مال روڈ پر خاموشی چھائی رہتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ یا سائیکل سوار گزرتا تھا۔ نہ رکشے تھے۔ نہ وگینیں تھیں۔ نہ سکوترے نہ ہی اتنی موٹریں اور بسیں تھیں۔ صرف ایک بس کراشن مگر سے چھاؤنی تک چلا کرتی تھی۔ لاہور میں مال روڈ پر پاک ٹی ہاؤس بن گیا تھا اور میاں اردو کے شاعروں کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ اسی پاک ٹی ہاؤس میں میری پہلی ملاقات ناصر کاظمی اور اشفاق احمد سے ہوئی۔ سارا سارا دن چائے کے دور چلتے۔ رات کو افسانے لکھے جاتے۔ غزلیں لکھی جاتیں۔ یہ زبردست تخلیقی عمل کا دور تھا۔ ہمیں بھی لاہور شہر کے مہنجان محلے میں ایک مکان الاٹ ہوا۔ مگر بارشوں میں اس کی چھتیں ٹپکنے لگیں۔ ہم اس حروکہ مکان کو ترک کر

گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پیچھے باورچی خانہ اور چھوٹا سا صحن تھا جس کے آدھے حصے پر انگور کی تیل نے سایہ کر رکھا تھا۔ ایک خاص موسم میں اس تیل میں سبز انگور کے خوشے لٹکے لٹکے جس کو ہمارے دادا جان تھیلیوں سے ڈھانپ دیتے تاکہ انہیں چڑیاں نہ کھا جائیں۔ جب انگور خوب پک جاتے تو میں میرا چھوٹا بھائی اور ہمیں ان انگوروں کے خوشے بڑی احتیاط سے اتار کر بڑے ٹشت میں جمع کرتے۔ انہیں بڑے پیار سے دھویا جاتا۔ پھر ان میں سے ہمایوں کا حصہ ان کے گھروں میں پہنچایا جاتا۔ اس روز ہمارے گھر میں ڈھولک بجتی۔
چھوٹا بھائی ڈھولک بجا لیتا تھا۔

وہ گا بھی لیتا تھا۔ میں بھی اچھا گا لیتا تھا۔ شام کو سادار میں سبز چائے پکنے لگتی۔ بھائی ڈھولک لے کر بیٹھ جاتا۔ گلاب کے پھولوں والا گلدان کمرے میں لا کر کزنس پر رکھ دیا جاتا۔ دو چار اگر بتیاں سلگالی جاتیں۔ دادا جان کمرے کے باہر بوریا بچھا کر فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ ڈھولک بجنے لگتی۔ ہم دونوں بھائی پنجابی کے لوک گیت گاتے۔ ڈھولک دھیمے دھیمے بجاتی جاتی۔ گایا بھی دھیمے سروں میں جاتا کہ ہمایوں کے سکون میں غزل نہ پڑے۔ جب سادار میں سبز چائے اٹپنے لگتی اور فضا میں اس کی خوشبو پھیل جاتی تو والدہ اور ہمیں باقر خانی اور کھنڈ قلیوں کا چھوٹا سا ٹرے لے کر آ جاتیں۔ گلابی رنگ کی سبز چائے پیالیوں میں ڈالی جاتی۔ دادا جان کو باہر چائے کی خوشبو آتی تو وہ وہیں سے خوش ہو کر بولتے۔

”بھئی میں چائے کی دو پیالیاں پیوں گا۔“

دادا جان انگور کی تیل کے نیچے بوریا بچھا کر بیٹھے رہتے۔ ان کے بوڑھے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ وہیں بیٹھ کر وہ سبز چائے میں قلیہ ڈبو کر کھاتے اور قلیے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے خوب گول کر کے چڑیوں کو ڈالتے۔ چڑیاں ان کو چھٹنے کے لئے نیچے آتیں تو دادا جان بالکل ساکت ہو جاتے۔ ذرا سی بھی حرکت نہ کرتے کہ چڑیاں ڈر کر نہ اڑ جائیں۔ سردیوں میں وہ سر پر اونی ٹوپی پہن لیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چڑیا ان کی ٹوپی پر آ کر بیٹھ جاتی تو اس وقت ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ کوئی انہیں بلاتا تو چھوٹی سی زبان نکال کر بلانے سے منع کر دیتے کہ مجھے نہ بلاؤ۔ میں بولا تو چڑیا اڑ جائے گی۔

یہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں والے بڑے حسین اور قیمتی شب و روز تھے۔ اس

زمانے کی سادہ اور معصوم خوشیاں، میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ یہ یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔

شام کو کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس کی محفلیں گرم ہوتیں۔ پاکستان کے وہ شاعر اور ادیب جنہوں نے بڑا نام پیدا کیا وہ بیٹھ کر ایک دوسرے سے ادب و شاعری پر باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو اپنی تازہ غزلیں نظمیں سناتے۔ ناصر کاظمی کو کرشن نگر میں مکان الاٹ ہوا تھا۔ وہ ان کی بھرپور جوانی کا دامنہ تھا۔ سیاہ بال، سیاہ موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں۔ بڑی مزے کی باتیں کرتا تھا۔ ایک روز ٹی ہاؤس میں آ کر کہنے لگا۔

”میں نے رات تازہ غزل لکھی ہے۔ وہاں کوئے میں بیٹھتے ہیں۔“
ٹی ہاؤس کے کوئے والی میز پر ہم بیٹھ گئے۔ چائے آگئی اور ناصر کاظمی نے مجھے اپنی تازہ غزل سنائی۔ وہ غزل تھی۔

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے

وہ بہت کم کسی کو غزل سناتا تھا لیکن میری اس سے بڑی دوستی اور پیار تھا۔ مجھے وہ ضرور سناتا تھا۔ میرے علاوہ اپنے چند ایک دوسرے دوستوں کو بھی سناتا تھا۔ ایک رات پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے بارہ بج گئے۔ ٹی ہاؤس بند ہونے لگا تو ناصر کاظمی بولا۔

”چلو شیشن پر چلتے ہیں۔ وہاں ساری رات چائے ملتی ہے۔“

ہم مال روڈ سے پیدل ہی شیشن پر آ گئے۔ وہاں چائے پی اور مال روڈ کی طرف پیدل چل پڑے۔ گرمیوں کی رات تھی۔ رات کے شاید دو بج چکے تھے۔ جب ہم میکنڈو روڈ سے مال روڈ پر بڑے ڈاک خانے کے سامنے آئے تو بڑے ڈاک خانے کی عمارت کے گنبد کے پیچھے سے زرد اور سرخ رنگ کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ بڑا اداس چاند تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ ناصر کاظمی نے چاند کو دیکھ کر کہا۔

”میں نے ایک بار چاند کو دیکھ کر ایک شعر کہا تھا۔“

پھر اس نے مجھے شعر سنایا۔

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

ابن انشاء بھی ان دنوں لاہور میں ہی تھا۔ ابھی کراچی میں اس نے مستقل

ہوتے وہیں کسی لانڈری میں دھلا لیتا۔ اگر جنگل میں ہوتا تو کسی ندی کنارے بیٹھ کر خود اپنے کپڑے دھو لیتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میرا خیال ہے شاید برہمن باڑیہ کا شیش تھا تیسرے پہر کا وقت تھا۔ میں پلیٹ فارم کے بچ پر بیٹھا کسی آگے جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک بنگالی سے شیش پر ہی واقفیت ہو گئی تھی۔ وہ نوجوان لڑکا تھا۔ ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک پتھر ٹرین آ کر رکی۔ یہ میری ٹرین نہیں تھی۔ مجھے دوسری ٹرین پکڑنی تھی۔ ڈبوں میں سے مسافر اترنے لگے۔

ایک ڈبے میں سے گیسوے کپڑوں والے بنگالی جوگی نما آدمی باہر نکلے۔ کسی کے پاس اکتارا تھا۔ کسی نے ڈھولک اٹھائی ہوئی تھی۔ ایک نے لپٹا ہوا بستر اٹھایا ہوا تھا۔ ایک کے پاس پانی کی صراحی تھی۔ آخر میں ایک جوگن اتری۔ اس نے بھی گیسوے رنگ کی ساڑھی پن رکھی تھی۔ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ماتھے پر سرخ بندی تھی۔ چہرے کا رنگ چھپی تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں طلسمی شمار سا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ پلیٹ فارم پر جس کی نظر اس پر پڑی وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے بھی اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ واقعی اس کے حسن میں ایک عجیب شعلے ایسی چمک دکھ تھی۔ اس کے حسن نے پلیٹ فارم پر جیسے آگ سی لگا دی۔

میرا بنگالی ساتھی بھی اسے دیکھنے لگا۔ بولا۔

”ایسی حسین بیراگن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“

وہ عورت بیراگن تھی۔ بنگال میں ایسی منڈی کو بیراگیوں کی منڈی کہا جاتا تھا اور اس منڈی میں گانے ناچنے والی عورتوں کو بیراگن کہا جاتا تھا۔ بیراگن اپنی منڈی کے آدمیوں کے درمیان بڑی شاہانہ چال کے ساتھ چلتی پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ میں نے اپنے بنگالی ساتھی سے پوچھا۔

”یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“

وہ بولا۔

”یہاں قریب ہی گاؤں کے زمیندار کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ میرا خیال ہے

یہ لوگ زمیندار کے ہاں جا رہے ہیں۔ وہاں آج رات کو گانا بجانا ہوگا۔“

یقین کریں اس بیراگن نے میرے اندر خوبصورتی اور کائنات کے حسن کو پیار کرنے والے جذبے کو بیدار کر دیا تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ جہاں یہ

رہائش اختیار نہیں کی تھی۔ میری اس کی بڑی یاری دوستی تھی۔ وہ مجھے کہا کرتا۔
”میں بھی تمہاری طرح رومان پسند ہوں۔ یہ لوگ مجھے صرف ترقی پسند ہی سمجھتے ہیں۔“

ہم دونوں کبھی کبھی لاہور کے گلی کوچوں کی سیر کو نکل جاتے۔ خوب آوارہ گردی کرتے۔ ایک بار ایک گلی سے دوسری گلی میں جا رہے تھے کہ آگے جا کر گلی بند ہو گئی۔ ایک عورت بند گلی کی دیوار کے پاس چولے پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر مرغیاں ایک طرف کو بھاگیں۔ عورت نے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

”کس سے ملتا ہے۔“

ابن انشاء دیں رک گیا۔ میں نے کہا۔

”بہن جی! غلام علی زرگر کا یہی مکان ہے۔“

اس نے کہا۔

”نہیں۔ یہاں کوئی غلام علی نہیں رہتا۔“

اور ہم معذرت کر کے تیزی کے ساتھ وہاں سے واپس مڑ گئے۔

میں ابھی تک مشرقی پاکستان نہیں گیا تھا۔ مغربی بنگال میں کافی آوارہ گردیاں کر چکا تھا مگر ڈھاکہ باریسال اور چٹاگانگ کاکسز بازار ابھی تک نہیں دیکھے تھے۔ میں نے کچھ پیسے جمع کئے اور ایک روز کراچی سے طیارے میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کی طرف پرواز کر گیا۔ ڈھاکے میں میرا ایک دوست نوادرات کا کاروبار کرتا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر ٹھہرا۔ وہ میرے ساتھ مشرقی پاکستان کی سیاحت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اکیلا جاؤں گا۔ وہ کہنے لگا۔ تم اس علاقے میں بالکل اجنبی ہو۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیا کرو گے۔ میں نے کہا۔

”اس علاقے کے جنگل درخت اور دریا میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ وہ

سب میرے دوست ہیں۔ مجھے جانتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔“

اور میں مشرقی پاکستان کی سیاحت کو اکیلا نکل کھڑا ہوا۔ ڈھاکہ کے کلا پور ریلوے شیش سے ٹرین میں بیٹھ کر چٹاگانگ گیا۔ وہاں سے واپس آ کر سلت کی طرف نکل گیا۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں ہوتا تھا۔ پتلون بٹن شرٹ تھی۔ پاؤں میں جوتے تھے۔ جیب میں سگریٹ اور کچھ روپے ہوتے تھے۔ جہاں کپڑے ذرا میلے

بیراگن جائے گی میں بھی وہیں جاؤں گا۔ اس وقت تک بیراگیوں کی ٹولی شیٹن سے باہر نکل چکی تھی۔ میں چپکے سے اٹھا اور میں بھی شیٹن کے گیٹ سے باہر آ گیا۔

سامنے ناریل کے درختوں کے نیچے ایک جی سجائی نل گاڑی کھڑی تھی۔ شاید یہ اسی زمیندار نے بھیجی تھی جس کے بیٹے کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ بیراگن اکتارا ہاتھ میں لئے ایک طرف کھڑی تھی۔ بیراگن کے ساتھی نل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ بیراگن بھی نل گاڑی میں بیٹھ گئی۔ نل گاڑی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ میں بھی کچھ فاصلہ ڈال کر نل گاڑی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ نل گاڑی کچھ دور تک کچی سڑک پر چلتی رہی۔ پھر ایک کچے راستے پر اتر گئی۔ دونوں جانب دھان کے کھیت تھے۔ ان کھیتوں میں کہیں کہیں ٹاڈ کے اونچے اور چھوٹی چھوٹی پھتریوں والے درختوں کے جھنڈ تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ بنگالی کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ جس ریلوے شیٹن سے میں بیراگیوں کے پیچھے چلا تھا اس کی آبادی کے مکان آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے۔ نل گاڑی مختلف راستوں سے گزر رہی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد کھیتوں اور ناریل کے درختوں کے درمیان دور ایک گاؤں کے آثار دکھائی دیئے۔ یہ وہی گاؤں تھا جہاں یہ منڈلی جا رہی تھی۔

سورج مغرب کی طرف کافی نیچے ہو گیا تھا۔ شام کے دھندلے سائے آہستہ آہستہ بڑھنے لگے تھے۔ گاؤں کے باہر کچھ لوگ کھڑے دور سے آتی نل گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ یہ زمیندار کے آدمی تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے بیراگیوں کا استقبال کیا۔ میں گاؤں کے باہر ایک جگہ درختوں کے پاس بیٹھ گیا۔ چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ بیراگی اور بیراگن گاؤں کے مکانوں کی طرف چلے گئے۔ میں اس وقت تک بیراگن کو دیکھتا رہا جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد میں اٹھ کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ پرانے حویلی نما ڈھلائی چھتوں والے مکان تھے۔ جگہ جگہ پانی کے چھوٹے چھوٹے تالاب بنے ہوئے تھے۔ بانس گاڑ کر ان پر جال پھیلانے ہوئے تھے۔ بچے شور مچاتے کھیل رہے تھے۔ ایک مکان کے باہر رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ تخت پر دو تین آدمی بیٹھے پراتوں میں رس گلے بنا رہے تھے۔ ایک طرف آگ پر کڑھاؤ رکھا ہوا تھا۔ مکان کے اندر سے عورتوں اور بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیراگن اپنی منڈلی کے ساتھ اسی مکان میں گئی تھی۔ مکان کے پلو میں کھلی

جگہ تھی جہاں تہہ قاتیں لگی ہوئی تھیں۔ جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ زمین پر دریاں بکھی تھیں۔ ایک جانب تخت کیسری رنگ کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ تین چار گاؤں تکیے لگے تھے۔ دو آدمی بجلی کی تاروں کا گچھا کھول رہے تھے۔ ایک آدمی بانس کے اوپر بجلی کے بلب لگا رہا تھا۔ بیراگیوں کی منڈلی نے اسی جگہ رات کو گانے بجانے کی محفل سجائی تھی۔ میری جیب میں کچھ روپے تھے۔ سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ ماچس تھی۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے سوا مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بیراگن کا خوبصورت چہرہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس کے درشن کرنے کے لئے رات کا انتظار کرنا تھا۔ میں گاؤں کی پچھلی جانب آ گیا۔ یہاں ایک طرف بڑے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ ان درختوں میں کبھی کبھی کوسل کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں برسات کا موسم گزر چکا تھا۔ شام کا دھندلا آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا تھا۔ درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی نہر بہ رہی تھی۔ میں نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا اور سگریٹ سلگا لیا۔ دل و دماغ پر بیراگن کا خیال چھایا ہوا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اتنی حسین عورت ان بیراگیوں میں کہاں سے آگئی۔ وہ عورت کے حسن کی مکمل تصویر تھی۔ کسی وقت دل میں یہ خیال بھی آتا کہ آخر میں کیا سوچ کر اس بیراگن کے پیچھے آ گیا ہوں۔ میں تو اس بیراگن کی زبان بھی نہیں جانتا۔ اسی سے کس زبان میں بات کروں گا؟ کیا بات کروں گا؟ میرے دل نے کہا۔ حسن کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ یہ خاموش زبان ہوتی ہے۔ اس زبان میں کوئی لفظ نہیں بولا جاتا۔ صرف ایک نظر دیکھنے سے ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

ندی کا پانی بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ درختوں پر خاموشی کا طلسم چھایا ہوا تھا۔ کوسل کے بولنے کی آواز اب نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ کسی طرف پرواز کر گئی تھی۔ جب شام کا اندھیرا چھا گیا تو میں اٹھ کر گاؤں کی طرف آ گیا۔ یہاں جس جگہ تہہ قاتیں لگی تھیں وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ناریل کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ بجلی کے بلب روشن ہو گئے تھے۔ میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ لوگ آنا شروع ہو گئے۔ یہ گاؤں کے دیہاتی تھے۔ وہ دروہوں پر آکر بیٹھ گئے تھے اور ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کھانا تقسیم کیا جانے لگا۔ ایک آدمی میرے پاس بھی چاول اور رس گھوں کی تھالیاں رکھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے بگھ

زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے چاول کھائے اور بیراگن کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ لوگ کھانا وغیرہ کھا چکے تھے اور کوئی ناریل پی رہا تھا تو کوئی درہی پر ہی لیٹ گیا تھا۔ میرا خیال ہے آدمی رات گزر چکی تھی کہ لوگوں میں کچھ ہلچل سی مچ گئی۔ جو دیہاتی درہیوں پر لیٹے ہوئے تھے وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جو بیٹھے ہوئے تھے وہ سیدھے ہو گئے۔ اتنے میں چار آدمی ایک پاکی اٹھا کر قاتوں کے اندر آ گئے۔ پاکی میں سے ایک عورت بچے کو گودی میں اٹھائے باہر نکلی اور تخت پر جہاں گاؤ تکیے لگے تھے بیٹھ گئی۔ بچے کی عمر تین چار سال کی ہوگی۔ اس نے بڑا ذرق برق لباس پہنا ہوا تھا۔ سر پر جھلجھل کرتی ٹوپی تھی۔ عورت شاید اس کی ماں تھی۔ اس نے بھی بڑی بھڑکیلی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ان کی کچھ رشتہ دار عورتیں بھی آکر تخت پر بیٹھ گئیں۔ آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ راگ رنگ کی محفل شروع ہونے والی ہے۔ اب بیراگن بھی باہر آ جائے گی۔

گاؤں سے کچھ اور لوگ بھی آکر درہیوں پر گانا سننے کے لئے بیٹھ گئے تھے۔ اس دوران گھاؤں کا زمیندار بھی اپنے ملازموں کے ساتھ سفید کرتا پاجامہ پہنے، کاندھے پر شال رکھے ہاتھوں میں گیندے کے ہار لئے آکر تخت پر اپنی بیوی اور بچوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ اس نے بچے کو گود میں بٹھالیا اور اپنے ملازم سے کوئی بات کی۔ ملازم مکان کی طرف دوڑ پڑا۔

تھوڑی دیر بعد بیراگیوں کی منڈلی آتی دکھائی دی۔ بیراگن سب سے آگے آ گئے تھی۔ اس نے کیسری رنگ کی سادہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ لمبے بال شانوں پر کھلے تھے۔ پاؤں ننگے تھے۔ ہاتھ میں اکتارا تھا۔ گلے میں گیندوں کا ہار تھا۔ کلائیوں میں موتے کے گجرے تھے۔ ماتھے پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ وہ قاتوں کے نیچے بجلی کی روشنی میں آئی تو مجھے ایسے لگا جیسے حسن کی دیوی آسمانوں سے اتر کر انسانوں میں آ گئی ہے۔ بیراگی تخت کے سامنے کافی جگہ چھوڑ کر نصف دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ بیراگن بھی ان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بار بار اپنے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کر لیتی۔ ہارمونیم کے ساتھ ڈھولک کو سر کیا جانے لگا۔ میں بھی ایک طرف ہو کر درہی پر بیٹھ گیا۔

میں ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے مجھے بیراگن کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ کتارے کو ہارمونیم کے ساتھ سر کر رہی تھی۔ انگلی سے اکتارے کے تار کو رک رک کر چھیڑتی۔ اس میں سے آواز نکلتی تو سر جھکا کر اسے ہارمونیم کے اسی سر کے ماتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی۔ سر کو جھکانے سے اس کے لمبے سیاہ بال جو ریٹم کی طرح چمک رہے تھے اس کے رخسار کے آگے آ جاتے۔ ایسے لگتا جیسے چاند دلوں میں چھپ گیا ہو۔ میں عالم مدہوشی میں بیراگن کے حسن کا نظارہ کر رہا تھا۔ مجھے خیال آنے لگا کہ قدرت نے عورت کو اتنا خوبصورت کیوں بنایا ہے؟ اگر خوبصورت آیا تھا تو پھر بد صورت عورتیں دنیا میں کیوں پیدا کیں؟ جب سارے ساز سر ہو گئے تو منڈلی کے ایک بیراگی نے دھیمی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

طرف گھوم جاتی ہے۔ فضا میں گیندے اور موتے کے پھولوں کی ملک اڑ رہی تھی۔
اب ہیراگن نے بھی گیت کے بول اٹھائے۔ اس کی آواز کوئل کی آواز
سے زیادہ سریلی، زیادہ شیریں تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گم شدہ فردوس کا
درد پڑھ رہی ہے۔ گیت کی لے تیز ہونے لگی۔ گھنگھروؤں کی جھنکاریں فضا پر چھا
گئیں۔ ہیراگن بجلی کی طرح تڑپ کر کبھی آگے کو جھکتی کبھی ایک دم پیچھے ہٹ جاتی۔
وہ گردش میں آگئی۔ یہ زمین کی گردش تھی۔ سورج کی گردش تھی۔ روشنی کی
گردش تھی۔ رقص کرتے کرتے کسی وقت ہیراگن کا چہرہ بجلی کے بلب کی روشنی میں
تا تو اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے سفید موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ ہیراگن کا
سم موسیقی کے سروں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ مادہ غائب ہو رہا تھا۔ مادہ غائب ہو گیا
۔ صرف توانائی باقی رہ گئی تھی۔ پھول نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ صرف پھول کی
ڈشبو رہ گئی تھی۔ اعضا کا حسن مادے کی نیکی ہے۔ نیکی روح کا نور ہے۔ ہیراگن کا
سن مجھے روح کے نور کی طرف لے جا رہا تھا۔ میرے جسم کا بوجھ ختم ہو گیا تھا۔
مے نہ اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی نہ سانس کی آواز سنائی دے رہی
ی۔ نورانی روشنی کا ایک سیلاب تھا جو ہیراگن کے سرچشمہ حسن سے طلوع ہو کر
مے اپنے ساتھ بہاتا ہوا ان سردی بلندیوں کی طرف لے جا رہا تھا، جن سے بچھڑ کر
ما زمین پر دوبارہ کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔

روشنی کا رقص جاری تھا۔ یہ رقص کب تک جاری رہا؟ کب ہیراگن بالوں
پیچھے جھکتی ہوئی اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی؟ گیت کے بول کب فضا میں خاموشی کے
ندر میں اتر گئے؟ کچھ معلوم نہیں۔ جب مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا۔
ب مجھے اپنے سانس کی آواز سنائی دینے لگی۔ جب مجھے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز
نے لگی تو میں نے دیکھا کہ وہاں نہ ہیراگن تھی نہ اس کے ہیراگی ساتھیوں میں سے
کی تھا۔ محفل ختم ہو چکی تھی۔ دریوں پر جگہ جگہ گیندے اور موتے کے پھول
رے پڑے تھے۔ جہاں ہیراگن رقص کرتی رہی تھی وہاں درمی پر سلوٹیں پڑی رہ
تھیں۔ روشنی کی لہریں نکل گئی تھیں۔ اندھیرے کی لیکریں باقی رہ گئی تھیں۔

میں پنڈال میں سے اٹھ کر ایک طرف چل پڑا۔ کہاں جا رہا تھا؟ کس طرف
رہا تھا؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔ دل ہیراگن کی طرف کھینچ رہا تھا لیکن جسم کا بوجھ مجھے
ن کی طرف کھینچ رہا تھا۔ سورج سے ملنے کے لئے مجھے روشنی میں کر اپنے جسم سے

آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ اس کی آواز کے ساتھ ڈھولک بھی
بج رہی تھی۔ ایک آدمی آہستہ آہستہ مجھے بجا رہا تھا۔ لے قائم ہو گئی تو سارے
ہیراگی ساتھ گانے لگے۔ ہیراگن ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی چپٹی انگلی
کے ناخن سے اکتارا بجا رہی تھی۔ اکتارا بجاتے ہوئے لے کے ساتھ اس کا سر بھی
بل رہا تھا۔ جب لے سم پر آتی تو ہیراگن ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اپنے سر کو
پیچھے کر لیتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے کھلے ہوئے بال اچھل کر ایک طرف کو لہرا
جاتے۔ میں ایک عجیب کیفیت میں گم حیرت زدہ آنکھوں سے ہیراگن کو دیکھ رہا تھا۔
اب ایک ہیراگی اکتارا لے کر اٹھا اور گیت کی لے کے ساتھ لوگوں کے
درمیان آہستہ آہستہ رقص کرنے لگا۔ میں ہیراگن کو دیکھ رہا تھا۔ ہیراگن اپنے پاؤں
میں گھنگھرو ماندھ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ناچنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ مجھے
رنگوں کے دریائے ایراوتی کے ملاحوں کا گیت یاد آگیا۔

”تم نے یہ ناچ کہاں سے سیکھا ہے؟“

”ایراوتی کی لہرو!“

”کیا ان درختوں سے جہاں دریا“

”ایک طرف گھوم جاتا ہے؟“

”ایراوتی میں ہمارے آنسو گرتے رہے ہیں“

”ایراوتی اداس ہے!“

جو ہیراگی رقص کر رہا تھا۔ وہ ڈھولک بجانے والے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔
گیت بنگالی کا تھا۔ کوئی لوک گیت تھا۔ اس کے سر پڑے اداس اور لے لے لے تھے۔ پھر
اچانک ہیراگن اٹھی۔ اس کے ہاتھ میں اکتارا تھا۔ اس نے لے بالوں کو جھٹک کر
پیچھے کیا۔ اکتارے والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ سر کو ایک طرف جھکایا اور گھنگھروؤں کی جھنکار
میں درمیان میں آکر رقص کرنے لگی۔

وہ ایک عورت کا رقص نہیں تھا۔ وہ جھل کا رقص تھا۔ دریا کا رقص تھا۔
دریا میں بننے والے اداس کتول کے پھولوں کا رقص تھا۔ ہیراگن گیت کی اداس لے
کے ساتھ آہستہ آہستہ ناچ رہی تھی۔ کبھی وہ سر کو جھکا لیتی۔ جیسے کائنات کی عظیم
حسن اولیں کو سلام کر رہی ہو۔ کبھی اس طرح آہستہ سے گھوم جاتی جس طرح جھل
میں، رسکون ندی نادرل کے جھنڈوں سے نکل کر خاموشی سے موسری کے پانوں کی

نکلنا تھا۔ یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ کاش! میری روح کا کوئی جسم نہ ہوتا۔ میں شیش کی طرف بھی نہیں جا سکتا تھا۔ شیش، شکر، سڑکیں، گلیاں، بازار۔۔۔۔۔ یہ اندھیرے کی چار دیواریاں تھیں۔ میں ان چار دیواریوں سے نکل کر روشنی کے صحراؤں کی طرف جا رہا تھا۔ ہیراگن میری زندگی کے تاریک افق پر سورج بن کر طلوع ہو رہی تھی۔ اس کی سنہری کرنوں نے میری جسم کی تمام وادیوں، گھاٹیوں اور تاریک غاروں کو روشن کر دیا تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے اپنے جسم کے سات پردوں میں چھپی ہوئی روح کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ مجھے میری روح کا سراغ مل گیا تھا۔ میں نے کھل جاسم سم کا راز پالیا تھا۔ اب میں واپس کیسے جا سکتا تھا۔

میں نے رات کا باقی حصہ وہیں گاؤں کے باہر ایک تالاب کے چبوترے پر لیٹ کر گزار دیا۔ جسے طلسمی خزانے کا راز معلوم ہو جائے اسے نیند کہاں آتی ہے۔ میں بھی باقی رات جاگتا رہا۔ منہ اندھیرے جب پو پھٹ رہی تھی تو میں چبوترے سے اتر کر اس ندی پر آگیا جو گاؤں کے پچھواڑے گھنے درختوں کے درمیان بہتی تھی۔ منہ اندھیرے کی پاکیزہ فضا تھی۔ شبم گر رہی تھی۔ ہر طرح کے پیڑ پودوں کی مکھ بھلی ہوئی تھی۔ ندی کے آس پاس پانی میں اگی ہوئی گیلی گھاس کی مکھ تھی۔ ابھی سورج نکلنے میں دیر تھی۔ ابھی درختوں میں چڑیوں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ابھی ہر طرف خاموشی، گہری خاموشی اور سلیٹی رنگ کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ندی کا پانی بڑے سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ دھندلے شیشے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس طرح کی سطح پر جو پتے اور درختوں کی شاخیں تیرتی چلی جا رہی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ ندی بہہ رہی ہے۔ میں نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھوئے اور ناریل کے درختوں میں آگیا۔ یہاں زمیں پر کچے ناریل ٹوٹ کر گرے ہوئے تھے۔ ایک ناریل کو پتھر سے توڑ کر میں نے اس کا پانی پیا۔ اس کی گرمی کھائی اور ایک چھوٹی سی بارہ دری کے کھنڈر میں آکر بیٹھ گیا۔ یہ کھنڈر میں نے شام کے وقت بھی دیکھا تھا۔ کسی تاریخی عمارت کی بارہ دری تھی۔ عمارت ڈھے چکی تھی۔ بارہ دری باقی رہ گئی تھی۔ وہ بھی شکستہ ہو رہی تھی۔ تاریخ عمارتوں کی تعمیر کرتی ہے۔ پھر ان کی شکست و ریخت کرتی ہے۔ پھر وہ ڈھے جاتی ہیں اور آخر میں بارشیں، دھوپ، آندھیاں سیلاب اور زلزلے صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹا دیتے ہیں۔ میرے اوپر آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی جھلکیاں نمودار ہونے لگی

تھیں۔ درختوں پر پرندے ابھی تک اپنے اپنے گھونسلوں میں بچوں کو پروں میں لپیٹ کر سو رہے تھے۔ اس خاموشی میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کسی نے پانی میں چھلانگ لگائی ہو۔ مجھے فکر لگا کہ کیسے یہ کوئی جنگلی درندہ نہ ہو اور میری بو پا کر اس طرف نہ آ رہا ہو۔ میں بارہ دری سے اتر کر درختوں کی اوٹ لیتا اس طرح دبے پاؤں چلنے لگا جدھر سے مجھے پانی میں چھلانگ کی آواز آئی تھی۔

میں ایک درخت کی اوٹ میں آگیا۔ یہاں سے مجھے ندی صاف نظر آ رہی تھی۔ رات کے تاریکی میں صبح کاذب کی ہلکی ہلکی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ مجھے ندی میں کوئی جاندار تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ جاندار تیر کر ندی کے دوسرے کنارے کی طرف جاتا اور پھر تیرتا ہوا واپس آ جاتا۔ میں آگے چل کر ایک اور درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو کر غور سے دیکھنے لگا۔ یہ جاندار کوئی جانور نہیں تھا۔ یہ کوئی انسان تھا۔ میں نے یہی خیال کیا کہ کوئی دیہاتی صبح ندی پر نہانے آ گیا ہے۔ میں واپس مڑنے لگا تھا کہ وہ انسان ندی کے پانی میں کھڑا ہو گیا۔ تب میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

یہ ہیراگن تھی۔ وہ اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے نچوڑ رہی تھی۔ اس کا چمپی بدن بے لباس تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے ندی میں کوئی شعلہ نہا رہا ہے۔ ہیراگن کی ساڑھی ندی کے کنارے گھاس پر پڑی تھی۔ وہ پانی میں بیٹھ گئی تھی اور اپنے لمبے بازو پانی کی سطح پر ادھر ادھر چپوؤں کی طرح لہرا رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر بالوں کو نچوڑتی ہوئی پانی سے نکل کر کنارے پر آئی۔ ایک کپڑے سے اپنے چہرے اور بالوں کا پانی خشک کیا۔ ساڑھی پستی اور گنگناتی ہوئی گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑی۔ کچھ دور تک وہ مجھے نظر آتی رہی۔ پھر پچھلے پھر کے دھندلکوں میں گم ہو گئی۔

اسی روز ہیراگیوں کی منڈلی گاؤں سے شیش کی طرف چل دی۔ میں بھی ان کی ٹیل گاڑی کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر چلتا شیش پر آگیا۔ یہ لوگ پلیٹ فارم پر آ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر آ کر ان لوگوں سے کے ذرا رعب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں نے منڈلی کے ایک آدمی سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ لوگ شکستہ ہندوستانی میں بات کر لیتے تھے۔ میں یہاں وہ زبان نہیں لکھوں گا بلکہ اس کا صاف اردو میں ترجمہ کرتا جاؤں گا۔ میں نے اس آدمی سے رات ان کے منڈلی کے گانے بجانے کی بڑی تعریف کی اور اس سے پوچھا کہ وہ اب کہاں گانے

اپنی منڈی کے ساتھ سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ برتھ پر چڑھتے وقت بھی اس نے ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی تھی۔ بیراگن کیا سوچ رہی تھی؟

جس بیراگی نے مجھے گورو دیو سے اجازت دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اب گورو دیو کے پاس جا بیٹھا تھا اور میرے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس کا اندازہ یوں لگایا کہ بوڑھے بیراگی نے دو ایک بار آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ ٹرین مشرقی بنگال کے میدانوں، کھیتوں، جنگلوں، دریاؤں اور ندی نالوں پر سے گذرتی اپنی منزل کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے شیشیں آتے اور گذر جاتے۔ کسی بڑے شہر کا شیشیں آیا۔ یاد نہیں یہ کون سا شہر تھا۔ یہاں ٹرین کافی دیر رکی رہی۔ بیراگیوں نے یہاں اپنی پوٹلیوں کو کھول کر کھانا وغیرہ کھایا۔ میں نے بھی شیشیں پر اتر کر کھانا کھایا۔ چائے پی اور ڈبے میں آکر بیٹھ گیا۔ اب میرا دوست بیراگی میری سیٹ کے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ ٹرین چلی تو اس نے مجھے بتایا کہ گورو جی سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے تمہیں اپنے ڈیرے پر کچھ دیر تک رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ میں بے خوش ہوا۔ میں نے اوپر برتھ کی طرف دیکھا۔ بیراگن ابھی تک سو رہی تھی۔ چٹاگانگ تک کافی لمبا سفر تھا۔ ٹرین سارا دن ساری رات چلتی رہی۔ اگلے روز صبح کے وقت ہم چٹاگانگ پہنچے۔ یہاں سے بیراگیوں نے ایک ٹیل گاڑی لی۔ میں بھی ان کے ساتھ ٹیل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے دوست بیراگی نے جس کا نام دھنیا تھا۔ مجھے گورو جی سے ملا دیا تھا۔ جب میں گورو جی کے قریب ہی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ بیراگن گورو جی کی دوسری جانب بیٹھی ہوئی تھی۔ گاڑی کے آگے دو ٹیل جتے ہوئے تھے۔ چٹاگانگ سے ہمیں اس ٹیل گاڑی میں ہی رانگا متی کی پہاڑیوں کے دامن میں دریائے کرناٹلی کے قریب واقع ان بیراگیوں کے ڈیرے پر جانا تھا۔

ہم خانہ بدوشوں کی طرح سفر کر رہے تھے۔ دوپہر تک میدانی علاقے میں سے گذرتے رہے۔ اس کے بعد زمین اونچی نیچی شروع ہو گئی۔ راستے میں ایک جگہ رک کر بیراگیوں نے کھانا وغیرہ پکایا۔ بیراگن عجیب محکوک سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ابھی تک میری اس کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کم باتیں کرنے والی عورت ہے۔ اپنی منڈی میں بھی کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ گورو جی کی بڑی خدمت کرتی تھی۔ دوپہر کے بعد ہم کھانا کھا کر دوبارہ سفر پر روانہ ہو گئے۔

بجانے جا رہے ہیں۔ اس آدمی نے بتایا کہ اب وہ اپنے ڈیرے پر واپس جا رہے ہیں جو رانگا متی میں دریائے کرناٹلی کے کنارے پر واقع ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

”میں لاہور سے بنگال کی سیاحت کے لئے آیا ہوں۔ میں یہاں کے بیراگیوں پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم لوگ مجھے اتنی اجازت دو گے کہ میں کچھ روز تمہارے قریب رہ کر تمہارے رہن سہن کے طریقوں اور تمہارے رسم و رواج کا مشاہدہ کر سکوں۔“

وہ بیراگی ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

”اس کی اجازت ہمارے گورو جی ہی دے سکتے ہیں۔ تم ایسا کرو ہمارے ساتھ چٹاگانگ تک چلو۔ راستے میں گورو جی سے بات کر کے تمہیں اجازت دلوا دوں گا۔“

بیراگن مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک بوڑھے بیراگی کے پاس بیٹج پر بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بیراگی سے باتیں کرتے دو ایک بار سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ میں نے بیراگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چٹاگانگ تک چلتا ہوں۔ میں گاڑی کا ٹکٹ لے آؤں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بابو ہم لوگ تو کبھی ٹکٹ نہیں خریدتے۔“

میں نے ہنس کر کہا۔

”تم بیراگی لوگ ہو۔ تمہیں کرایہ شاید معاف ہو مگر میں بیراگی نہیں ہوں

میں اپنی ٹکٹ لے کر آتا ہوں۔“

باہر آکر میں نے برہمن باڑیہ سے چٹاگانگ تک تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور واپس آکر بیراگی کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

کافی دیر بعد ٹرین آگئی۔ میں بھی بیراگیوں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین چٹاگانگ کی طرف روانہ ہو گئی۔ بیراگی چھ سات آدمی تھے۔ ان کا گورو دیو، ٹرین چٹاگانگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ ناریل پی رہا تھا۔ میں بیراگن بوڑھا بنگالی تھا۔ جس کا رنگ کالا اور سر گنجا تھا۔ وہ کچھ دیر بوڑھے گورو دیو کے پاس بیٹھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیکھ لیتا تھا۔ وہ کچھ دیر بوڑھے گورو دیو کے پاس بیٹھا کے پاؤں دباتی رہی۔ پھر اوپر برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی۔ اس نے ڈبے میں بیٹھا

اب جنگل شروع ہو گیا۔ میرے دوسرے بیراگی دھنیا نے مجھے بتایا کہ یہ سندرین کے جنگل کا ایک حصہ ہی ہے۔ اسے رائگا متی کا جنگل کہتے ہیں۔ دریائے کرناٹلی کے دوسرے کنارے پر سندرین کا بھارت والا حصہ ہے۔ میں نے جب اس خدشے کا اظہار کیا کہ جنگل میں شیر ہاتھی تو ضرور ہوں گے تو دھنیا کہنے لگا۔

”ضرور ہوتے ہیں مگر وہ سادھو سنیا سیوں اور بیراگیوں کو کچھ نہیں کہتے۔ اسی طرح جو لوگ ناگ دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ انہیں بھی سانپ کچھ نہیں کہتے۔ جنگل میں کوئی سانپ سامنے آ جائے تو وہ راستہ چھوڑ کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شیر سے آمتا سامتا ہو جائے تو یا تو وہ خود راستے سے ہٹ جائے گا یا ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ ہمیں خبردار کرے گا کہ دوسری طرف سے ہو کر نکل جاؤ۔“

اس کے باوجود مجھے سانپوں اور جنگلی درندوں کا ڈر لگا رہا۔ یہ ضعیف الاعتقاد لوگ ہیں۔ بھلا شیر کو کیا پتہ کہ کون سا دھو سنیا سی ہے اور کون بیراگی ہے۔ جنگل میں پہلے تو درخت دور دور تھے۔ پھر قریب آنے لگے۔ اس کے بعد جنگل اتنا گھنا ہو گیا کہ اس میں سے صرف تیل گاڑی کے گزرنے کی ہی جگہ تھی۔ یہ دیودار کے درختوں کا جنگل تھا۔ فضا میں جس تھا اور دیودار کے درختوں کی بو جھل خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کسی وقت ہوا کا بہت ہلکا سا جھونکا آتا تو دلدل اور تالاب کے پانی کی بو آتی۔ ہمیں جنگل میں ہی رات پڑ گئی۔ ایک جگہ تیل گاڑی کھڑی ہو گئی۔ یہاں بانس کی تپیاں کھڑی کر کے اوپر ترپالیں ڈال کر دو چھوٹے چھوٹے خیمے بنا دیے گئے۔ ایک خیمہ بیراگن کے آرام کے لئے تھا اور دوسرا خیمہ گورو جی کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہم لوگ تیل گاڑی پر ہی پڑ گئے۔ آگ کا الاؤ روشن کر دیا گیا تھا تاکہ جنگلی درندے آگ کو دیکھ کر قریب نہ آئیں۔

مہ اندھیرے بیراگی اٹھ بیٹھے۔ خیمے لپیٹ کر تیل گاڑی میں رکھ دیے گئے۔ چائے اور چاول پکا کر کھائے گئے۔ بیراگن گورو دیو کے پاس بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ یہ بڑی اچھی بات تھی کیونکہ میں کسی بھی عورت کو کھانا کھاتے نہیں دیکھ سکتا اور بیراگن کو تو کھانا کھاتے بالکل ہی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جنگل میں ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

آگے پہاڑی جنگل شروع ہو گیا تھا۔ جھاڑیاں، درخت سرکنڈے اور گھاس

کے علاوہ دلدلی زمین تھی۔ فضا میں بہت جس تھا۔ ہوا کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تیسرے پہر کہیں گئے درختوں کا سلسلہ ختم ہوا اور دریائے کرناٹلی کا کنارہ نظر آیا۔ اس طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ ایک بیراگی نے تیل گاڑی پر بیٹھے بیٹھے اکتارے پر کوئی بنگلہ لوگ گیت چھیڑ دیا۔ بنگلہ گیتوں کی لے بڑی اداس ہوتی ہے۔ یہ اداسی بنگل کی عورتوں کے چروں سے لے کر وہاں کی ہر شے میں دکھائی دیتی ہے۔ جیسے جیسے دریا قریب آ رہا تھا بیراگی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

دریائے کرناٹلی بہت بڑا دریا تھا۔ پاٹ بہت چوڑا تھا۔ دوسرے کنارے کے درخت بہت چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ یہیں ایک ٹیلے کے دامن میں ان بیراگیوں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ تیل گاڑی کو دیکھ کر عورتیں، بچے اور مرد جھونپڑیوں سے نکل آئے۔ وہ ہاتھ ہلا کر اور گیت گا کر اپنے ساتھی بیراگیوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ بانس کی چھوٹی بڑی جھونپڑیاں ٹیلے کے دامن میں اور ہاس کی ڈھلان پر جگہ جگہ دکھائی دے رہی تھیں۔ کسی کسی جھونپڑی کے باہر آگ جل رہی تھی۔ گائے بھینسیں بھی بندھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ یہاں مجھے ایک چھوٹی سی جھونپڑی دے دی گئی۔ گورو جی نے اپنی بنگلہ نما ہندوستانی میں کہا کہ تم جتنے دن چاہو اس جھونپڑی میں رہ سکتے ہو۔

”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ جنگل میں اکیلے مت جانا۔ تم بیراگی نہیں ہو اور ناگ دیوتا کے پجاری بھی نہیں ہو۔ تمہیں سانپ کاٹ سکتا ہے اور شیر بھالو بھی تم پر حملہ کر سکتا ہے۔“

شام کو میں کھانا کھانے کے بعد اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پر کرناٹلی دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کی طرف سے بڑی خوشگوار ہوا آرہی تھی۔ اتنے میں دھینا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

”پورن ماسی کی رات کو ہم سارے بیراگی مل کر بڑا جشن مناتے ہیں مگر ابھی اس میں دس پندرہ دن رہتے ہیں۔ تب تک تم ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔“

میں نے کہا۔

”کیوں نہیں۔ پورن ماسی کا تمہارا جشن ضرور دیکھوں گا۔“

سورج مغرب کی طرف پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا تھا اور ڈھلانوں پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ مجھے بیراگن دکھائی دی۔ وہ دریا کی طرف جا رہی تھی۔ دریا کی طرف جو

راستہ جاتا تھا وہاں بانس کے بڑے درخت تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی ہیراگن کے پیچھے جاؤں مگر دھنیا میرے پاس بیٹھا تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد رات کے سائے تیزی سے بڑھنے لگے۔۔۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد دھنیا اٹھ کر چلا گیا۔

میں جمونپڑی کے آگے بے چینی سے ادھر ادھر ٹپکنے لگا۔ میں ہیراگن سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ ہیراگی لوگ کچھ فاصلے پر جمونپڑیوں کے باہر چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک طرف آگ کا لاؤ روشن تھا۔ ایک ہیراگی گے اٹھارے پر گانے کی آواز آنے لگی۔ میں خاموشی سے جمونپڑی کے چبوترے سے اتر کر دریا کی طرف چل پڑا۔ ابھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ درختوں جھاڑیوں کے خاکے نظر آرہے تھے۔ میں بانس کے جھنڈوں کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف سے ہو کر دریا پر آگیا۔ مجھے یہ ڈر ضرور تھا کہ کسی طرف سے کوئی سانپ یا شیر نہ نکل آئے لیکن دھنیا نے بتایا تھا کہ ادھر ہیراگیوں کی آبادی ہے۔ ادھر شیر بھالو کم ہی آتے ہیں۔ میں دریا کے کنارے کنارے اس طرف چلنے لگا جدھر بانس کے جھنڈوں والا راستہ دریا پر آتا تھا۔ ہیراگن اسی طرف سے آئی تھی۔ دریا کا پاٹ صاف دکھائی دیتا تھا۔ پانی کا بہاؤ بڑا پرسکون تھا۔ میں درختوں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہیراگن کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ بانس کے جھنڈوں میں ایک غار سا بن گیا تھا۔ میں اس طرف گیا ہی تھا کہ مجھے کسی عورت کے منگٹانے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس طرح دیکھا جس طرف سے آواز آرہی تھی۔ یہاں دریا کا کنارہ اکٹا ہوا تھا اور پانی ایک جگہ تالاب کی شکل میں جمع ہو گیا تھا۔ تالاب پر گھنے درخت جھگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ ہیراگن بیٹھی نہا رہی تھی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اس کا سایہ ہی نظر آ رہا تھا۔ پھر مجھے خیال آگیا کہ ہیراگن نے مجھے دیکھ لیا تو وہ ضرور برا مانے گی مگر میں اس سے نظریں بھی ہٹائی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ہیراگن تالاب میں کمر تک اتری ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے اوپر پانی ڈال رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کوئی گیت بھی منگٹا رہی تھی۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ نہانے کے بعد اس نے ساڑھی پہنی۔ بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور آہستہ آہستہ بانس کے جھنڈوں کی طرف چل پڑی۔ وہ میرے قریب سے گزری۔ میں ذرا سا پیچھے ہٹا تو ایک پتھر میرے پیر سے لگ کر لڑھک گیا۔ ہیراگن وہیں رک گئی۔ اس نے بگھ میں کچھ کہا۔ میں درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کے

سامنے آگیا۔

”میں ہوں۔“

دریا کے کنارے یہ کھلی جگہ تھی۔ آسمان پر ستارے جھللا رہے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کی شکلیں نظر آرہی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ ایک دو سینڈ بالکل بت بنی میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم میرا پیچھا کس لئے کر رہے ہو؟“

اس نے اپنی بگھ ملی ہندوستانی میں یہ جملہ کہا تھا۔ میں اس کے جملے کو یہاں صاف کر کے لکھ رہا ہوں۔ میری حالت اس وقت بالکل ایسی تھی جیسے کسی دریا کی لہروں کی سمندر میں گرتے وقت ہوتی ہے۔ اس وقت دریا کی لہروں دیوانہ وار بہہ رہی ہوئی ہیں اور سمندر سے ملنے کو بے تاب ہوئی ہیں۔ میں اپنے سمندر سے پھڑکی ہوئی لہر تھی۔ میرا سمندر اچانک میری سامنے آگیا تھا۔ میں اس سے ملنے کو بے تاب تھا۔ میں سورج سے پھڑکی ہوئی کرن تھی۔ میرا سورج اچانک میرے سامنے آگیا تھا۔ میں اپنے سورج میں سا جانے کو بے تاب تھا۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ جتنا خالص سورج کا سونا تھا اتنی خالص میری کرن تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ہیراگن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روشنی ہیراگن کا ہاتھ بن کر میرے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ ہیراگن نے ذرا سی بھی مدافعت یا جھجک کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس پر میرے دل کا حال کھلا تھا۔ میں نے کہا۔

”تم جانتی ہو میں تمہارے پیچھے پیچھے یہاں تک کیوں آگیا ہوں۔ یہ تو رانگا متی کی پہاڑیاں ہیں اور یہ جگہ ہماری زمین پر ہے۔ اگر تم زمین سے نکل کر کسی دوسرے ستارے پر بھی چلی جاتیں تو میں تمہارا پیچھا کرتا وہاں بھی پہنچ جاتا۔ جانتی ہو کیوں؟ تم جانتی ہو۔ تمہارا خاموش چہرہ، تمہاری خاموش نظریں بتا رہی ہیں کہ تم اس کی وجہ جانتی ہو۔ ہیراگن! تم نے میرے اندر ایک آگ لگا دی ہے یا شاید اس آگ کو پھر سے روشن کر دیا ہے جو بجھ رہی تھی۔“

ہیراگن نے گردن ایک طرف ٹیڑھی کر کے مجھے عجیب پر اسرار انداز سے دیکھا اور میرے ہونٹوں پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھا اور ہاتھ کو پیچھے لے جاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔ آؤ ادھر بیٹھ جاتے ہیں۔“

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہم دریا کے کنارے ایک جھاڑی کی اوٹ

جل دی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ جب بانس کے درختوں نے اسے اپنے اندر چھپا لیا تو میں بوجھل دل لئے اپنی جھوپڑی کی طرف چلنے لگا۔ دوسرے دن بیراگن نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ میں اپنے بیراگی دوست دھنیا کے پاس بیٹھا تھا۔ بیراگن میرے قریب سے ہو کر گذری۔ اس نے نگاہ غلط سے بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ میرا دل اداس ہو گیا تھا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بیراگن کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

دن گذر گیا۔ شام کو جھوپڑیوں کے باہر مٹی کے تیل والی لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ میں اپنی جھوپڑی کے آگے چارپائی پر بیٹھا بیراگن کی جھوپڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی جھوپڑی کے باہر بھی لالٹین روشن تھی مگر وہ خود مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ رات گہری ہوتی گئی۔ پھر سوائے ایک لالٹین کے باقی ساری لالٹینیں بجھا دی گئیں۔ بیراگیوں کی جھوپڑیوں پر گہری خاموشی چھا گئی۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ دریا پار سندربن کے تاریک جنگل میں سے کسی درندے کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے اپنا چہرہ بیراگن کی جھوپڑی کی طرف کیا اور اس امید پر دیکھنے لگا کہ شاید بیراگن کا دیدار ہو جائے لیکن جھوپڑی پر اندھیرا طاری تھا۔ اس کے بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں گہری نیند سو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو دن کافی نکل آیا تھا۔ سورج رانگا مٹی کی پہاڑیوں کے اوپر آگیا تھا۔ میں چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔ پھر مجھے ایک تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ جھوپڑیوں کے آگے کوئی بیراگی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیس آگ نہیں جل رہی تھی۔ میں چوتھرے سے اتر کر جھوپڑیوں کی طرف گیا۔ ایک ایک جھوپڑی کو دیکھا۔ ساری جھوپڑیاں خالی تھیں۔ بیراگیوں کی بھینسیں اور گائے بھی وہاں پر نہیں تھیں۔ چولہوں میں رات کی جلی ہوئی آگ راکھ بن گئی تھی۔ میں دیوانہ وار بیراگن کی جھوپڑی کی طرف دوڑا۔ بیراگن کی جھوپڑی بھی خالی تھی۔ زمین پر موتے اور گیندے کے تین چار باسی پھول پڑے تھے۔ میں نے وہ پھول اٹھائے۔ ان میں سے بڑی افسردہ خوشبو آرہی تھی۔

یہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟

یہی ایک سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ آسمان پر دیکھتے دیکھتے ایک طرف سے گھٹا اندھ کر آئی اور اس نے سورج کو چھپا لیا۔ وہاں کوئی انسان نہیں تھا جس سے میں

میں بیٹھ گئے۔ اس نے اپنی گہری آواز میں کہا۔

”تم کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ میرا تمہارا ملاپ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ تم شہروں کے رہنے والے ہو۔ میں بیراگن ہوں۔ میں شہروں میں جا کر نہیں رہ سکتی۔ تم بیراگی نہیں بن سکتے۔ پھر اس شے کا پیچھا کرنے کا کیا فائدہ جس کو تم کبھی حاصل نہیں کر سکتے؟“

میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ چوم لیا اور کہا۔

”میں بیراگی بن جاؤں گا۔ میں اب بھی بیراگی ہی ہوں۔ صرف بیراگیوں والا لباس نہیں پہنا۔ میں تمہاری خاطر اپنے سارے شہر، اپنا ملک، اپنا گھر، اپنا سب کچھ چھوڑ دوں گا۔“

بیراگن مسکرا رہی تھی۔ ستاروں کی نورانی روشنی میں میں نے اس کے ہونٹوں کے درمیان دانتوں کی جگہ ستاروں کو چمکتے دیکھا۔ اس نے گہرا سانس بھر کر آہستہ سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں سے کھینچ لیا اور کہا۔

”ہمارے لوگ تمہیں قبول نہیں کریں گے۔ ہم کسی کو بیراگی بنا کر اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔“

میں نے کہا۔

”میں گورو جی کو راضی کر لوں گا۔“

بیراگن اپنے جڑے ہوئے گیلے بالوں کو آہستہ آہستہ کھول رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بھی گورو جی سے میری سفارش کر دے۔ وہ بولی۔

”میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔“

میں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے اپنی منڈی میں شامل ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔“

بیراگن نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر ستاروں کو دیکھا۔ پھر ایک نگاہ دریا کی پرسکون لہروں کو دیکھا اور میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

”تم واپس اپنی دنیا میں چلے جاؤ۔“

یہ کہہ کر اس نے ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں مجھ پر ایک نگاہ ڈالی۔ آہستہ سے اٹھی اور بانسوں کے جھنڈوں میں بنے ہوئے سرگم نما راستے کی طرف

پوچھتا کہ ہیرا کی کہاں گئے ہیں۔ اتنے میں ایک آدمی سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبا بانس تھا اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کا ڈول تھا۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ ہیرا کی کہاں گئے ہیں بھائی؟“

اس نے دریا کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

”وہ تو رات کو ہی دریا پار کر کے بھارت چلے گئے تھے۔ تم کہاں سے آئے

ہو؟“

میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ کب واپس آئیں گے؟“

اس نے کہا۔

”جب ہیرا کی دریا پار کر کے بھارت چلے جاتے ہیں تو کئی مہینوں تک واپس

نہیں آتے۔“

اور یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میرے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لئے تھے۔

میرے سورج کی سنہری روشنی مجھے تاریک تاریک بادلوں میں تنہا چھوڑ کر مجھ سے جدا ہو گئی

تھی۔ میں بے اختیار دریا کی طرف چلنے لگا۔ بانس کے جھنڈوں سے لٹکا تو کرناٹلی دریا

سامنے نظر آنے لگا۔ میں دریا کے کنارے آ کر رک گیا اور دوسرے کنارے کے

درختوں کو دیکھنے لگا جو سندھ بن کے درخت تھے اور جہاں سے بھارت کا علاقہ شروع

ہو جاتا تھا۔ ایک بادبانی کشتی دریا پر تیرتی ہوئی گزر گئی۔ کشتی کا ملاح بڑی اداس لے

میں کوئی لوک گیت گا رہا تھا۔ گیت کے بول میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ ملاح

کی اداس آواز نے مجھے اور بھی زیادہ اداس کر دیا۔ وہ شمع میری نگاہوں سے اوجھل

ہو گئی تھی جس نے مجھے میری منزلوں کا نشان دکھانا تھا۔

بارش شروع ہو گئی تھی۔ میں بارش میں کھڑا رہا۔ میں دریا کے دوسرے

کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے میری روشنیوں کو اپنے اندھیروں میں چھپا لیا

تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ لیکن میری آنکھوں سے قطرے گر رہے تھے

شاید یہ بارش کے قطرے تھے، شاید یہ میرے آنسو تھے۔